ڈاکیا اور جولاہا

(ناول)

مستنصر حسین تارڑ

ایک ویرانے میں خط میرے نام
جس پہ لکھا تھا فقط تیرا نام
(محمد سلیم الرحمٰن)

''حشوپی سے پرے پتھروں کے ملبے کا ایک بہت بڑا ڈھیر اوپر سے نہیں وہاں سے جہاں برف پگھلتی ہے نیچے آ کر پھیل گیا تھا اور اُس کے درمیان میں دو پُرشور نالے بہتے ہوئے دریا کی جانب آ رہے تھے۔ یہاں ہم اور دریا اور سبز درختوں والی وادیاں ایک ہی سطح پر تھیں۔ ہماری جیپیں پتھروں پر اُچھلتی پانی میں تقریباً تیرتی دونوں نالے عبور کر گئیں..

اور جب ہم نالے عبور کر کے خشک راستے پر آتے ہیں تو سامنے سے وہ آ رہا تھا۔۔۔ جی ہاں وُہی۔۔

حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے آگے داسو جانے والی سڑک پر دریائے برالڈو کے چوڑے پاٹ کے ساتھ ایک لشکتی اور تھرتھراتی جِلد والے پُرتمکنت گھوڑے پر سوار وہ ہماری جیپوں کی طرف آ رہا تھا۔ اور میں نے ڈرائیور کو رُکنے کے لیے کہا۔

''آپ کون ہیں؟''

''میں محمد علی ڈاکیا ہوں صاحب۔۔۔'' گُھڑسوار نے اپنے جانور کو تھپکی دیتے ہوئے کہا تھا۔۔۔'' اُدھر دریا کے کنارے گلیشیر کے دہانے پر ایک بستی ہے وہاں ڈاک دینے جا رہا ہوں۔ آخری دو کلومیٹر' گھوڑے کو ایک چٹان کے ساتھ باندھ کر پیدل جاؤں گا۔''

''میرے نام کا کوئی خط ہے؟''

''آپ کا نام کیا ہے صاحب؟''

میں نے نام بتایا تو اُس نے ڈاک کے تھیلے کا ایک ایک خط آگے پیچھے کر کے دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا ''نہیں صاحب آپ کے نام کا کوئی خط نہیں۔۔۔''

ہاں' وہاں میرے نام کا کوئی خط ہو بھی کیسے سکتا تھا۔۔۔ یہ صرف اُس کی سادگی تھی جو

لفافوں اور پوسٹ کارڈوں پر میرا نام تلاش کرتی تھی — لیکن — اگر وہ ایک خط اٹھا کر کہتا کہ صاحب آپ کے نام کا ایک خط ہے — تو کیا ہوتا۔

ہاں کیا ہوتا —

مجھے آج بھی شک ہے کہ وہ کوئی عام ڈاکیا نہیں تھا۔ کچھ اور تھا۔ اُس کے بھورے اور سفید چٹاخوں والے گھوڑے کی ٹانگیں گھٹنوں تک سفید تھیں اور وہ اس طرح اِترا کر نزاکت سے چلتا تھا جیسے شیشے پر چل رہا ہو۔

''میں چلتا ہوں صاحب — ابھی بہت دور جانا ہے۔'' گھوڑا چلنے سے پیشتر ہنہنایا —

اور وہ ہاتھ ہلا کر اپنے راستے پر چلا گیا....

کیا وہ واقعی ڈاکیا تھا؟

(اقتباس ''کے ٹو کہانی'')

آوارگی میں جن زمانوں کی سیر میں نے کی اُن زمانوں کے سفرناموں میں جتنے بھی واقعات درج ہیں ان میں صرف محمد علی ڈاکیے سے ملاقات کا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں مجھے اب بھی گمان گزرتا ہے کہ یہ میرا واہمہ تھا.. میں جو کوہ نوردی کے لیے نکلتے ہی ڈان کے خوتے کی مانند فاترالعقل ہو جاتا ہوں.. پن چکیوں کو عفریت سمجھ کر اپنے مریل گھوڑے روزی نانتے پر سوار نیزہ تانے اُن پر حملہ آور ہوتا ہوں.. کسی گھاٹی میں چلتے بھیڑوں کے ریوڑ سے اُٹھنے والی دُھول کو دیکھ کر چوکنا ہو جاتا ہوں کہ یہ تو دشمن کی فوج ہے جو میری جانب آ رہی ہے اور میں ایک بہادر نائٹ کی طرح زنگ آلود زرّہ بکتر پر ہاتھ رکھے اُس پر بھی حملہ کر دیتا ہوں... تو جیسے نہ وہاں دیو تھے اور نہ عفریت اور نہ دشمن کی فوج بلکہ صرف فاترالعقلی تھی تو ایسے ہی نہ وہاں کوئی بدخشانی گھوڑا تھا اور نہ ڈاکیا محمد علی.. صرف ایک واہمہ تھا.. لیکن میرے کیمرے میں سے نکلی ہوئی ایک تصویر ہے جو گواہی دیتی ہے کہ یہ ایک حقیقت تھی.. ایک تصویر سے تو جرح نہیں ہو سکتی..

پچھلے پندرہ برسوں کی حیات میں کوئی ایک بیکار اُکتا دینے والا تاریک دن نہ تھا اور کوئی ایک نیند کے راستے روکتی رات نہ تھی جس میں میں نے متعدد بار.. ایک تواتر ایک تسلسل سے اپنے آپ سے یہ سوال نہ کیا ہو کہ اگر ڈاکیا محمد علی اپنے چرمی تھیلے میں سے کوئی خط نکال کر کہتا کہ ہاں صاحب.. یہ آپ کے نام آیا ہے.. تو وہ خط کس کا ہوتا؟

یہ غیب سے کس کے علم میں آ گیا تھا کہ میں فلاں وادی میں سے ایک معین زمانے میں گزروں گا... یہ پتہ کس کو تھا اور کس نے لکھا..

میں بے نیند ہوا.. ڈیپریشن میں چلا گیا.. تمام امکانات پر غور کیا لیکن پھر بھی آج تک کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا... اور یہ میرے لیے ایک مسلسل اذیّت کا باعث ہے اور میں بہرصورت اس

اذیّت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں..

میرے لیے ان بھول بھلیوں میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ میں اُن امکانات کے بارے میں ایک ''ناول'' لکھوں۔ کسی بھی منصوبہ بندی کے بغیر ایک مروّجہ ناول کی اونچ نیچ.. کلائمکس کا حساب کتاب کیے بغیر.. کرداروں کے تسلسل اور واقعات کی ترتیب کے بغیر.. اس اذیّت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک ''ناول'' لکھوں.. مختصر یہ کہ دوات میں سے اپنا قلم بھر کر اپنے سامنے ایک کورا کاغذ رکھ لوں.. اور لکھنا شروع کر دوں.. اپنے آپ کو اُن حرفوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں جو بے ترتیب میرے ذہن میں آتے چلے جاتے ہیں.. تو شاید اس طور میرے مسئلے کا کوئی حل نکل آئے..

تو میں نے ایسا ہی کیا ہے..

میں نے قطعی طور پر نہیں سوچا.. کوئی منصوبہ بندی نہیں کی کہ اب میرے سامنے جو کورا کاغذ پڑا ہے اس پر کیا لکھوں گا.. اور جو کچھ لکھوں گا اُس میں کوئی Sense بھی ہوگی یا نہیں.. کیونکہ اس تحریر میں مَیں شامل نہیں ہوں.. یہ کورے کاغذ اور قلم کے درمیان معاملہ ہے..

ایک ناول کا پہلا فقرہ لکھنا سب سے مشکل ہوتا ہے..

کہاں سے آغاز کیا جائے.. دل کو گرفت میں.. یکلخت گرفت میں لے لینے والے ایک مکالمے سے.. ایک حیران کن منظر کے بیان سے.. کسی حادثے سے.. یا اُس کے انجام کو ظاہر کر کے.. پھر سے آغاز کر کے انجام تک پہنچا جائے..

ایک ناول کا پہلا فقرہ لکھنا ایک عذاب اس لیے ہوتا ہے کہ اُس فقرے میں ناول کی ناکامی یا کامیابی کا بیج بویا جاتا ہے..

اور ایک ایسے ناول کا.. جو ناول نہ ہو.. اُس کا پہلا فقرہ لکھنا ایک کڑا امتحان ہے جس کی کامیابی کی اُمید موہوم ہوتی ہے..

اور ایک ناول.. جو ناول ہی نہ ہو.. اُلجھے ہوئے رنگ رنگ کے کچّے دھاگے ہوں جو ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہوں اُنہیں کیسے ایک متروک کھڈی پر چڑھا کر ایسا کھیس بُنا جائے جس پر کوئی واضح ڈیزائن نمایاں ہو.. ترتیب ہو خوش نمائی ہو.. ایسی جسے لوگ قبول کر لیں.. جس ترتیب اور خوشنمائی کی لوگوں کو عادت ہو..

مستعمل طریقہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ اِن دھاگوں کو.. جو حیات کے شب و روز کے تانے

بانے میں اُلجھ گئے ہوں.. پہلے سلجھایا جائے.. ایک ایک دھاگے کو اس کے رنگ کی مناسبت سے الگ کیا جائے اور پھر انہیں کھڈی پر چڑھایا جائے.. اور پھر وہ کھیس بُنا جائے جس میں ترتیب اور خوشنمائی ہو.. اور دیکھنے والے عش عش کر اُٹھیں..

لیکن دھاگے اس حد تک اُلجھے ہوئے ہیں کہ کھینچا تانی میں وہ ٹوٹ تو سکتے ہیں.. جدا جدا نہیں ہو سکتے..

ویسے بھی سُلجھے ہوئے دھاگوں سے ایک کھیس بُن لینا ایک روٹین ہے.. ایسا تو کوئی بھی کُند ذہن جولاہا کر سکتا ہے.. زندگی بھر کی بُنت کے تجربے کو بروئے کار لا کر کر سکتا ہے.. بلکہ آنکھیں بند کر کے کر سکتا ہے.. اور ایسے دھاگوں کو کھڈی میں چڑھانا جن کا سرا نہ ملتا ہو.. اُن میں گانٹھیں پڑی ہوں.. کہیں ٹوٹتے ہوں کہیں گم ہوتے ہوں.. اور ہر دھاگے کا رنگ جدا ہو تو اُن سے ایک ناول کا کھیس کیسے بُنا جائے...

ایک سلجھاؤ والے تانے پیٹے سے تو ہر کوئی ایک کھیس بُن سکتا ہے..

تو ایک اُلجھاؤ والے تانے پیٹے سے بے شک کھیس کی بناوٹ اور ڈیزائن بھدّے اور بے سُرے ہو جائیں.. بے ڈھب اور بے ترتیب ہو جائیں.. کھیس تو بُننا ہے.. یہ جاننے کی سعی تو کرنی ہے کہ وہ خط کس کا ہو سکتا تھا.. محمد علی ڈاکیے کے پوسٹ ماسٹر نے یہ لکھ دیا تھا کہ مجھے انہی اُلجھے ہوئے دھاگوں سے یہ کھیس تیار کرنا ہے.. اور اُس نے جو لکھ دیا سو لکھ دیا.. میرا اس لکھے پر کیا اختیار.. مجھے وہی کرنا ہے جو اُس نے لکھ دیا.. میں چاہوں یا نہ چاہوں!

اور یہ اُلجھے ہوئے دھاگے جو سب کے سب حیات کی گٹھڑی کھولنے پر نظر کے سامنے آتے ہیں.. سب کے سب میرے اپنے نہیں ہیں.. بہت سے لوگوں کی حیات کی گٹھڑیاں میں نے چوری چھپے کھول لی ہیں.. چنانچہ اس ناول کے کھیس میں جو تانے بانے ہیں اُن میں آپ سب کے اُلجھاؤ بھی شامل ہیں..

اس میں اُس ہاتھ کا اُلجھاؤ بھی شریک ہے جس نے کپاس کے پھول کو کُھردرے پتّوں کے بیچ میں سے طلوع ہونے والے اس سفید سورج کو اپنی اُنگلیوں کی گرفت میں لے کر ٹینڈے سے الگ کیا تھا..

اور کپاس کے پھول کو چُننے کا لمحہ وہ ہوتا ہے جب اُس میں اوس کی ہلکی سی تراوٹ باقی ہو.. وہ دھوپ سے اتنا خشک نہ ہو جائے کہ اُس کے روئیں الگ ہونے لگیں.. پھر اُس پھول کی

برف سفیدی میں شامل.. اُس میں گندھے ہوئے بنولے چن کر الگ کیے جاتے ہیں.. اس میں جو پتّے اور ٹہنیاں رہ جاتی ہیں وہ الگ کی جاتی ہیں.. پھر وہ کپاس پاکیزہ اور سفید کنواری کا رُوپ دھارتی ہے اور اُسے سنوار سنوار کر ایک پُونی کی شکل دی جاتی ہے.. اور تب جا کر وہ اس لائق ہوتی ہے کہ اُس کے اور چرخے کے تکلے کے درمیان ایک نازک ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جانے والا رشتہ قائم ہو۔

گھوم چرکھڑے گھوم.. تیری کتّن والی جیوے..

کپاس کی پُونی میں سے پہلی تند نکالنا.. اُس کی گھنی سفیدی میں سے ایک دھاگے کا سرا تخلیق کرنا ایک معجزے سے کم نہیں۔

چرخہ گھوکتا اور گھومتا ہے اور اُس نفاست یا بے ڈھب انداز میں گھومتا ہے جو اُس کی ہتّھی گھمانے والے ہاتھ میں ہوتی ہے..

نوکیلے گھومتے تکلے کی قربت میں پُونی پہنچتی ہے تو اُس کی گھماوٹ اُس کے اندر سے ایک دھاگہ کھینچتی ہے جو اُس کے ساتھ لپٹتا جاتا ہے.. اور جونہی یہ رشتہ قائم ہوتا ہے پونی والا ہاتھ دھیرے دھیرے بلند ہونے لگتا ہے اور کپاس کے ریشے اُس کے ساتھ گھومتے ایک شکل اختیار کرتے.. ایک دھاگے میں بدلتے تکلے کے ننگے بدن کو اپنی سفیدی سے ڈھانپتے چلے جاتے ہیں..

پُونی اپنا وجود کھونے لگتی ہے.. اپنے آپ کو ادھیڑتی ہوئی تکلے پر اٹّی کی صورت ایک نیا جنم لینے لگتی ہے..

ہم اس اٹّی کو حقیر نہیں جان سکتے کہ اس میں ایک پیغمبر کو خرید لینے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔

ترنجن کی رات ہو تو چنگیریں اٹّیوں سے لبریز ہو جاتی ہیں..

کر کتّن وَل دھیان کڑے..

جو کُڑیاں کتّن وَل دھیان کرتی ہیں صرف اُنہی کی چنگیریں اٹّیوں سے بھرتی ہیں لیکن.. جو دھیان نہیں کرتیں ان کے چرخے کی ہتّھی ڈھلک جاتی ہے اور ان سے کاتا نہیں جا سکتا.. ان کے تکلے کو بل پڑ پڑ جاتے ہیں اور وہ اسے درست کرنے کے لیے لوہار کو صدا نہیں دے سکتیں.. اُ کی تندی ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے.. تکلا جھولتا ہے اور گھڑی گھڑی جھولتا ہے اور ایک بھی چھلّی.. ایک بھی اٹّی تیار نہیں کر پاتا..

میں بھی دھیان تو کرتا ہوں لیکن میری تحریر کی ہتّھی ڈھلک ڈھلک جاتی ہے.. تکلا جھول جھول جاتا ہے اور تند ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے..

پھر ان اٹّیوں سے تانا پیٹا لگتا ہے.. مسلسل دھاگے بنتے ہیں.. رنگے جاتے ہیں اور تب جا کر وہ جولاہے کی کھڈی میں سجتے ہیں..

اور پھر ایک کھیس وجود میں آتا ہے..

یہ ناول... جو شاید ناول نہیں ہے.. محض کپاس کے ایک پھول اور اُس کے ایک کھیس کی شکل میں نمودار ہونے کا قصہ ہے..

لیکن اس نہایت اُلجھے ہوئے قصے میں ایک اور اُلجھاؤ ہے.. کپاس چننے والے ہاتھ اناڑی تھے.. انہوں نے پھول کو اُس کے مسکن سے مشاقی سے الگ نہیں کیا اور یوں کچھ ریشے ٹینڈے میں ہی رہ گئے.. پھر اُس کپاس کو صاف کرنے والے ہاتھ بھی نادان اور ناتجربہ کار تھے.. کہ اُس میں چند ایک بنولے اور سوکھے ہوئے پتّے بھی رہ گئے..

ایک اور المیہ یہ ہوا کہ جن ہاتھوں نے پُونیاں مروڑیں وہ بھی اس فن سے ناواقف تھے.. اور بالآخر جو چرخہ کاتنے والی تھی وہ بھی گنوار تھی اور اُس کا دھیان کہیں اور تھا اور ہتّھی اس کے قابو میں نہ آتی تھی اور تند ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی.. اس کے بعد تانا پیٹا لگانے والے اناڑی جولاہوں کو کیا دوش دینا.. چنانچہ میرے نصیب میں جو بھی دھاگا آیا.. اُلجھا ہوا ہی آیا۔

ان اُلجھے ہوئے دھاگوں کو اپنی کھڈی پر چڑھا لینا اور ایک کھیس بُننے کی سعی کرنا میری مجبوری ہے۔

اس کا تذکرہ کیا کرنا کہ میں نے اب تک ہمیشہ سلجھے ہوئے دھاگوں سے ہی کھیس بُنے ہیں.. اُن کے ڈیزائن اور رنگوں کے انتخاب کا ایسا دھیان رکھا ہے کہ سب نے اُنہیں اپنی رُوح کے نہاں خانوں میں سجایا ہے اور میری بُنت اور کاریگری کی داد دی ہے..

اس بار بھی میرا ارادہ تو یہی تھا.. لیکن..

سامنے سے اپنے بدخشانی گھوڑے کی تھرکتی پیٹھ تھپکتا محمد علی ڈاکیا آ گیا.. اُس نے اُن سارے دھاگوں کو جو میں آج تک ترتیب اور تناسب کی کھڈی پر بُنتا آیا تھا اُلجھا کر رکھ دیا.. تو اس میں میرا تو کوئی دوش نہیں..

تو میں وہ جولاہا ہو گیا ہوں جس کی ڈور کوئی اور کھینچتا ہے.. اُلجھے ہوئے حیات کے

دھاگوں کو اپنی کھڈی پر چڑھاتا ہوں..

ایک تاریک..قبر نما کچی کوٹھڑی میں نصب اپنی کھڈی کے آگے جو گڑھا ہے اُس میں ٹانگیں اُتارے بیٹھا ہوں..

ایسے بیٹھتا ہوں کہ میرے پاؤں اس گڑھے کی کچی تہہ پر جا رُکتے ہیں...آس پاس اگر دن ہے تو یہاں نیم تاریکی ہے..میں کھڈی کی پنڈلی پر اپنا پاؤں رکھ کر دباتا ہوں اور پھر تانے پیٹے کے بیچ میں سے سُوت کی چھلّی کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر تانے کے نیچے سے دھکیلتا ہوں اور پھر دائیں ہاتھ سے اُسے وصول کر کے پھر سے واپس کرتا ہوں تو پیٹے کے اندر ہی اندر سُوت کے دھاگے ایک کھیس کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں..

چونکہ میرے دھاگے سب کے سب اُلجھے ہوئے ہیں اس لیے میں روٹین کے مطابق یہ عمل نہیں کر سکتا..مجھے سوچنا پڑتا ہے کہ میں سُوت کی چھلّی کو دائیں ہاتھ پر دھکیلوں یا بائیں ہاتھ پر..

یوں کہ اُلجھے ہوئے حیاتی دھاگوں سے..گانٹھوں سے بھرے سُوت میں سے ایک کھیس وجود میں آ جائے..

میں ایک ایسا جولاہا ہوں جو لمحۂ موجود تک صدیوں سے چلی آنے والی روایت کے تابع سیدھے سادے..ترتیب والے..مخصوص نمونوں اور رنگوں کے کھیس بُننے والا تھا اور اب مخمصے میں پڑ گیا ہوں..میں نے اگر یہ اُلجھے ہوئے دھاگوں والا..پھول کہاں آئے گا..پتہ کہاں نمودار ہو گا یہ جانے بغیر ایک بنا ترتیب کھیس بُن بھی لیا تو اسے خریدے گا کون..کون ہیرا سے اپنے رانگلے پلنگ پر بچھانے کا خطرہ مول لے گی..

چوہدرانیاں جو میرے ہاتھ کے بُنے ہوئے کھیسوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتی تھیں اور اپنی بیٹیوں کے داج سجاتی تھیں اسے دیکھ کر مجھ سے بدظن ہو جائیں گی..ناک چڑھا کر کہیں گی جولاہا سٹھیا گیا ہے حواس کھو بیٹھا ہے..اور چوہدری جو میرے خوش رنگ کھیسوں کو پالے کے دنوں میں اوڑھتے تھے..اس کھیس کو دیکھ کر مجھ کمی کمین کو اگلے برس نہ گندم دیں گے اور نہ گُڑ اور نہ مجھے اپنے کھیتوں میں سے بھینس کے لیے چارہ کاٹنے دیں گے..

اس کے باوجود یہ کھیس بُننا..یہ ناول لکھنا میری مجبوری ہے..

مجھے مجبور کس نے کیا؟..محمد علی ڈاکیے نے..

اور محمد علی ڈاکیے کو ایک بدخشانی گھوڑے پر بٹھا کر اُس لمحے میری طرف کس نے روانہ کیا؟

اُس نے!

جس کے پاس فنا اور بقا کا ڈاک گھر ہے..جو پوسٹ ماسٹر ہے..

اُس نے کُن کہا ہو گا تو یہ ڈاکیا وجود میں آیا..

اور اگر اُس کے پاس ایک خط میرے نام کا ہے تو اُس نے میرے اندر جستجو کا زہر بھرا کہ میں یہ جاننے کی سعی کروں کہ وہ خط کس کا ہو سکتا ہے..

تو میری کیا مجال کہ میں زوگردانی کر سکوں..محض اس لیے یہ کھیس بُننے سے انکاری ہو جاؤں کہ دھاگے اُلجھے ہوئے ہیں اور کوئی ہیرا سے اپنے رانگلے پلنگ پر بچھانے سے انکاری ہو جائے گی..اور چوہدری میرا حقہ پانی..دانہ پانی بند کر دیں گے اور میں بھوکا مر جاؤں گا..

تو میں اپنی نیم تاریک کچی کوٹھڑی میں اسیر انہی اُلجھے ہوئے دھاگوں سے ایک ناول...جو شاید ناول نہیں ہے..ایک کھیس...جو کھیس نہیں ہے..بُننے کی ابتدا کرتا ہوں..

کیا آپ کو کھٹ کھٹ کی آواز آئی؟

یہی تو میری کھڈی کی آواز ہے..جو میری اس نیم تاریک کوٹھڑی سے نکل کر..جہاں میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوں..آپ کے کانوں پر کھٹ کھٹ دستک دیتی ہے کہ... یہ کھیس جو بُنا جا رہا ہے صرف میرا نہیں آپ کا بھی ہے..

اس میں بُنے جانے والے دھاگوں میں سے صرف ایک دھاگا میرا ہے باقی سب آپ کی حیات سے مستعار لیے گئے ہیں..

میں سر جھکائے سُوت کی اٹّی والی کشتی کو نال کو دائیں ہاتھ سے دھاگوں کے درمیان میں سے تیراتا گزارتا ہوں اور اُس میں سے نکلنے والے دھاگے کو کھٹ سے کھیس کی بُنت کا ایک حصہ بناتا ہوں..کھٹ!..اور پھر بائیں ہاتھ میں وہ کشتی وصول کر کے اُسے واپس بھیجتا ہوں..ایک اور کھٹ!

کھٹ کھٹ..

لیکن ٹھہریئے میں اُس منظر کو اب قدرے تفصیل سے زندہ کرنا چاہتا ہوں جس کی پاداش میں مجھے یہ کھیس بُننا پڑ رہا ہے..

پہلے تو میں سرسری گزرا تھا..لیکن اب اُس کی جزئیات کو بیان کرنا بے حد ضروری ہے..

چنانچہ میں اپنی نیم تاریک کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے اپنی کھڈی کے سامنے بیٹھا اُس منظر کو دوبارہ بیان کرتا ہوں... سفرنامے کے طور پر نہیں کہ جو کچھ گزرا تھا اسے دوبارہ بیان کردوں کہ وہ تو بیان ہو چکا.. بلکہ ایک ناول کے طور پر کہ جس میں متخیّلہ کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے.. جیسے ایک اڑیل گھوڑے کی باگیں کھلی چھوڑ دی جاتی ہیں تا کہ وہ جہاں جی چاہے جائے.. عرش کا مسافر ہو جائے یا کسی کھائی میں جا گرے.. تخیل اور گھوڑے کو ایسے کُھلا چھوڑ دیا جاتا ہے..

وادیٔ شگر سے آگے.. وہاں کی خانقاہِ معلےٰ کے صحن میں جو سینکڑوں برس قدیم بلند چنار ہیں اور جن کے تنوں میں اب تک ایک آگ سلگتی ہے اُن سے کہیں آگے.. دریائے باشو کے کنارے جو ابھی کچھ دیر پہلے دریائے برالڈو تھا اُس کے کنارے.. عین کنارے.. پانیوں کے پاس نہیں بلکہ اُن سے بلند ہوتی گھنے سبزے والی ڈھلوانوں کے بیچ جو ایک کچی جیپ روڈ تھی اُس کے کنارے..

ایک تنہا درخت تھا..

یہ ممکن نہ تھا کہ وہاں صرف ایک درخت ہو اور آس پاس کچھ نہ ہو.. کوئی اور شجر تک نہ ہو.. لیکن ایسا ہی تھا.. جیسے اُس کے آس پاس کسی اور درخت کو سر اُٹھانے کی اجازت ہی نہ تھی تا کہ اُس کی تنہا یکتائی میں خلل نہ پڑے.. جیپ روڈ کے کنارے کھیتوں کی ہریاول میں کھڑا ایک گمشدہ تنہا درخت تھا جو زرد پھولوں سے بھرا.. کہ دور سے وہ پھول ہی لگتے تھے.. ایسے کہ ان کے بیچ کسی ایک پتّے کی ہریاول بھی اُس زرد انبار میں سے نہ جھلکتی تھی..

نزدیک ہوئے تو یہ کھلا کہ یہ پھول نہ تھے.. رس بھری خوبانیاں تھیں جن کے زرد سورج اتنی کثرت میں اُس شجر پر طلوع ہوئے تھے کہ دور سے پھول ہی دکھائی پڑتے تھے..

یہ درخت.. خوبانیوں سے ایسے بھرا ہوا تھا جیسے ایک حاملہ عورت کا پیٹ.. اور کسی عام سی عورت کا نہیں بلکہ ایک ایسی عورت جس کی چاہت کا ثمر بہت برسوں بعد اُس کے اندر ٹھہرا ہو.. اور جیسے اُس کے اندر اُس ثمر کے سوا کوئی اور گنجائش باقی نہیں رہتی ایسے وہ درخت تھا.. خوبانیوں سے بھرا ہوا..

ہم اُس کے زرد سحر میں گرفتار رُک گئے..

وہاں تو ہزاروں سورج طلوع ہو رہے تھے..اور صرف ایک سورج طلوع ہونے سے ہم جیسے برگشتہ لوگ ایمان لے آتے تھے..

ہم جب رُکے اور اُس درخت کو جھنجھوڑ کر..اُس کے شانوں کو جھٹکے دے کر اپنی اپنی جھولیاں خوبانیوں سے بھر چکے..اپنے تئیں اُسے خالی کر چکے اور جب چلے اور پیچھے مڑ کر اُسے دیکھا اور اس شرمندگی سے دیکھا کہ ہماری لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں وہ برہنہ اور خالی ہو چکا ہوگا..جیسے پیدا ہونے کے بعد پیٹ خالی ہو جاتا ہے..تو وہ ایسا نہ تھا..وہ بدستور بھرا ہوا تھا ایسے..جیسے اُس کی شاخوں سے ایک بھی خوبانی جُدا نہ ہوئی ہو..

وہ اُسی طور زرد سورجوں کا انبار تھا جس پر نظر ٹھہرتی نہ تھی..

پھر حشوپی کے سیبوں کے باغ آئے جن کی ٹہنیاں درختوں تلے جو گھاس تھی اور برفانی نالیاں بہتی تھیں اُن پر جھکی ہوئی اُنہیں چھوتی تھیں..

ان سے پرے وہ نالے آئے.. پُرشور اور پُروحشت جن میں سے ہماری جیپیں رُکتی.. اٹکتی..ہمیں جھٹکتیں..پتھروں سے ٹکراتیں پار ہوئیں..

سوہنی کی مانند ہمارے گھڑے کچے نہ تھے..لوہے کے بنے ہوئے تھے..وہ پانیوں میں گھلے نہیں..ہمیں ان کے پار لے گئے..

اور جب ہم پار اُترے ہیں..تو وہ آ رہا تھا..

سامنے سے وہ آ رہا تھا..

اس خوبانیوں کی زردی سے حاملہ تنہا درخت سے آگے..حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے بھی کہیں آگے..دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی شاہ گوری کے راستے پر..دریا کے چوڑے پاٹ کے کناروں سے جو ڈھلانیں اُٹھتی ہیں سبزے کے گھنے سمندر آنکھوں میں اُتارتی ہوئی..اُن کے برابر میں ایک کچے راستے پر ایک لشکتی اور تھرتھراتی جِلد والے بھورے رنگ کے پُرتمکنت بدخشانی گھوڑے پر سوار وہ ہماری جانب آ رہا تھا..

لیکن نہیں..

وہ صرف میری جانب آ رہا تھا..بہت بعد میں جب کوہ نوردی کے قصے بیان کرتے ہوئے اُن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے میں نے اُس کی نمودداری کا تذکرہ کیا تو میرے ساتھی لاعلم تھے..انہوں نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا..اس ذکر کو جھٹلایا نہیں کہ وہ میری تعظیم کرتے تھے

اور اسے میری عمر رسیدگی کا ایک خیالی مظہر جانا لیکن مجھے شک کی نظروں سے دیکھا..اسے میرا ایک اور واہمہ جانا کہ..انہوں نے ایسا کوئی گھڑسوار نہ دیکھا تھا..

اسی لیے وہ صرف میری جانب آ رہا تھا..

ایک شاندار گھوڑے کی تمکنت اُس کے سوار کی کمر کو سیدھا کر کے اُسے بھی پُرتمکنت کرتی ہے..

یہ گھوڑا ایسا تھا کہ اس کے لیے ایک سلطنت بھی قربان کی جا سکتی تھی..ایک گھوڑا..ایک گھوڑا..میری پوری سلطنت کے عوض میں..یہ ایسا گھوڑا تھا..پس منظر..ایک ایسا پس منظر جس میں آسمان کے وصل کی چاہت میں اُبھرتے برفوں سے بھرے پہاڑ ہوں..سُتھری سردیلی ہوائیں نکھرتا..ایسا پس منظر کسی بھی انسان کو تو کیا ایک جانور کو بھی بادشاہ بنا دیتا ہے..لیکن یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ ایک جانور اپنے پس منظر کو پُرجلال اور پُرشکوہ بنا رہا تھا..وہ بنجر زمینوں پر بھی اپنے سُم رکھتا تو کونپلیں پھوٹنے لگتیں..ویرانوں میں قدم رکھتا تو چپکے سے بہار آ جاتی..یہ ایک ایسا گھوڑا تھا..

وہ ایک خاص نخرے سے چلتا آتا تھا..

جیسے اُس کے پاؤں میں جھانجریں ہوں..

اور وہ احتیاط کرتا ہو کہ جھانجھروں کی چھن چھن کہیں بلندیوں پر صدیوں سے ٹھہری برف کو بے آرام نہ کر دے..

اُس کی بھوری پسینے کی تمازت اور گیلاہٹ سے لشکتی جِلد..جیسے وصالِ یار میں ہو..جس کا بدن..یار کا بدن مہکتا اور پسینے سے لشکتا ہو..ایک ایسی جِلد جو اُس برفانی پس منظر میں بے قابو اور وصال پر آمادہ نظر آتی تھی..

اور اس کی ٹانگیں ایک خاص ربط سے اُٹھتی تھیں..اگرچہ نخریلے انداز میں لیکن ایسی اپنی وحشت کی باگیں کھینچتی ہوئی احتیاط کے ساتھ کہ اُس کے سُموں سے دُھول نہ اٹھتی تھی..کہ اس کے پاؤں میں جھانجھریں تھیں..

وہ ایسا گھوڑا تھا کہ نہ صرف اپنے پس منظر کو بلکہ اپنے سوار کو بھی معدوم کر دیتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ایک کورا کاغذ ہے جس پر کسی چینی مصور نے بُرش کے چند ایک سٹروکس لگا کر گھوڑے کا بدن بنایا ہے اور وہ متحرک ہو کر چلا آ رہا ہے..ایک خلاء میں چلا آ رہا ہے..

وہ میرے قریب ہوا تو میں اُس سے مخاطب ہونے کو تھا کہ اس کی پشت پر ٹانگیں لپیٹے

ایک سوار نظر آ گیا تو میں نے اس سوار سے سوال کیا ''آپ کون ہیں؟''

سوار متعجب ہوا ''میں؟..آپ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں..''

گھوڑا لاتعلق کھڑا رہا..صرف ایک بار ہنہنایا اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے کہ تم دیکھتے تو مجھے تھے میری غیر مرئی جھانجھروں کی چھن چھن بھی سنتے تھے اور میرے لیے ایک سلطنت بھی قربان کر دینے کو جائز سمجھتے تھے اور اب مجھ سے نہیں میرے سوار کے ساتھ کلام کرتے ہو..

''نہیں..'' میں نے کہا ''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو..مجھے علم نہیں..''

''صاحب..اگر لاعلمی ہو..بے خبری ہو..تو میدانوں کو چھوڑ کر ان بلندیوں پر نہیں آیا کرتے.. یہاں ہوا میں آکسیجن کم ہوتی ہے..تو دماغ میں فتور بھر جاتا ہے..وہ کچھ دکھائی دینے لگتا ہے جو ہوتا نہیں..''

''تم ہو؟''

''ہاں میں تو ازل سے ہوں..''

''تو پھر میں تم سے نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو..تم اپنا راستہ لو میں اپنے راستے پر جاتا ہوں..آگے چلا جاتا ہوں۔''

''آپ تو آگے نہیں جا سکتے''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ نصیب کی قید میں ہیں..اور نصیب کی تختی پر کچھ پُورنے ہیں..ایک خطاطوں کے خطاط نے اس تختی پر اپنی اٹل کلک سے مدھم سیاہی میں کچھ حرف اُلیک دیئے ہیں.. اور آپ نے صرف ان مدھم لفظوں پر قلم چلا کر انہیں واضح اور اجاگر کرنا ہے..آپ نے اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں لکھنا..آپ نے وہی لکھنا ہے جو لکھا جا چکا ہے..تو آپ نے ناحق خودمختاری کی تہمت اپنے سر لے لی..بدنام ہو جائیں گے۔اس لیے آپ نے اسی عبارت پر قلم چلانا ہے جو لکھی جا چکی ہے۔آپ کے بس میں کچھ بھی نہیں..''

''یعنی تم نے ایک بدخشانی گھوڑے پر سوار..بہر طور اس متعینہ لمحۂ موجود میں میرے سامنے نمودار ہونا تھا اور مجھے بھی تم سے یہی سوال پوچھنا تھا کہ تم کون ہو..اور اس میں میری منشا کو کوئی دخل نہ تھا؟''

''نہیں...آپ کے نصیب کی تختی پر یہ سب کچھ پہلے سے لکھا جا چکا تھا..''

وہ درست کہتا تھا..

ایک تختی تھی..میرے دور افتادہ اور اب تو یکسر گمشدہ بچپن میں ایک تختی تھی..سکول جاتے ہوئے..جماعت سوم کے بلند تعلیمی درجے پر فائز میں جب ایک کھڑکھڑاتی دھوبی کی دھلی ہوئی کلف سے اکڑی ہوئی شلوار کے پائینچوں کو کیچڑ سے بچاتا جب اس تختی کو صبح سویرے..کسی دھندلی صبح کے سویرے میں..اس تختی کو اوس بھرے کھیتوں پر مارتے ہوئے چلتا جاتا تھا تو پچھلے روز کی لکھائی کی روشنائی اوس کی گیلاہٹ سے پھیلنے لگتی تھی..اس پر لکھے ہوئے حرفوں کی رالیں بہنے لگتی تھیں اور وہ اپنی پہچان کھونے لگتے تھے..اور یہ بھی روٹین تھی کہ میں اس تختی کو ایک جوہڑ میں دھوتا تھا دیگر تمام بچّوں کی مانند اور جونہی تختی کو پانی میں ڈبوتا تھا تو ایک دوست مینڈک کا بچہ اُچھل کر اُس پر بیٹھ جاتا تھا اور اپنی بے خوف آنکھیں جھپکتا مجھے اُلفت سے تکتا تھا کہ ہم روزانہ کے ملاقاتی تھے..یہ ملاقات چند لمحوں کی ہوتی..میں ہتھیلی سے تختی کو مل مل کر..چلّو میں پانی بھر بھر کر تختی پر ڈالتا ملتا..پچھلے روز کی لکھائی صاف کر کے اُس پر اعلیٰ درجے کی چکنی گاچنی کا پوچا اس نفاست سے پھیرتا کہ تختی کی سطح پر میرے ہاتھ کی لکیریں بھی دکھائی نہ دیتیں۔وہ اتنی ہموار اور نفیس ہو جاتی..پھر اس گیلی گاچنی کے لیپ کو دھوپ میں رکھ کر سکھاتا..یہ ایک نہایت تخلیقی جوہر تھا جو بہت کم بچّوں کے بس میں ہوتا تھا..جیسے ایک مصور تصویر بنانے سے پیشتر اپنے کینوس کو تیار کرتا ہے ویسے میں اپنی تختی تیار کرتا تھا..تختی سوکھ جاتی تو میں پہلا بچہ ہوتا جو اپنے ٹاٹ سے اُٹھ کر ماسٹر راتھر کے سامنے اسے ایک فنی شاہکار کے طور پر پیش کر دیتا..وہ سر ہلا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے پھر اُس کی سادہ اور کوری سطح پر مدھم پُورنے ڈال دیتے..پُورنے ہلکی اور مدھم سیاہی میں اُلیکے ہوئے وہ حرف ہوتے ہیں جن پر کلک پھیر کر انہیں واضح کرنا ہوتا ہے..

مجھے نالے کے گرد جو جنگلی سروٹ اُگے ہوئے تھے ان میں سے وہ کانے تلاش کر لینے میں بھی ملکہ حاصل تھا جن سے بہترین قسم کی قلمیں گھڑی جا سکتی ہیں..یہ پتلی بانس نما کونپلیں ایسی ہوں کہ نہ اتنی کچی ہوں کہ گھڑتے ہوئے وہ موم کی مانند نرم ہوں اور نہ اتنی درشت اور پکی ہوں کہ گھڑنے والا چاقو کُند ہو جائے..اور وہ ہاتھ بھی تجربہ کار اور تخلیقی ہونا لازمی تھا جو قلم کو گھڑتے ہوئے چاقو سے اُسے ایسے تراشے کہ وہ نشیب میں اُتر کر یوں اُبھرے کہ بانس کے گودے میں اُتر کر صرف اُس کی ظاہری جِلد کو تراش دے..اور پھر وہ لمحہ کمال کا جب اس جِلد میں چاقو کی دھار سے

ایک ضرب لگا کر.. اس میں ایک لکیر کی خراش لگا کر ایک ایسی قلم وجود میں آئے جو روشنائی کو اپنے اندر اس خراش میں سنبھال سکے اور تختی پر منتقل کر سکے..

ماسٹر راتھر ایک ایسی ہی ضرب اور خراش لگا کر میری کلک گھڑتے تھے اور میں اُس قلم سے مدھم پورنوں کو نمایاں کرنے کی سعی کرتا تھا.. انہیں واضح اور خوشنما کرنے کی ازحد کوشش کرتا تھا لیکن ہمیشہ ناکام ہو جاتا تھا.. کہ میں ازل سے ایک بدخط شخص تھا.. پاپوش رقم تھا.. نفیس رقم نہ تھا..

لیکن اس کم عمری میں ہی مجھ پر کھل گیا تھا.. مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری اپنی ذاتی کوئی حیثیت نہیں ہے.. پُورنے کوئی اور ڈالتا ہے اور میرا کام محض یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر قلم پھیر کر اسے واضح اور روشن کر دوں۔

میں محض ایک نقال تھا..

جو کچھ بھی لکھا جا چکا تھا اس پر میرا کوئی اختیار نہ تھا.. اُسے میں تبدیل کرنے پر قادر نہ تھا.. مجھے صرف اسی لیے پیدا کیا گیا تھا کہ لکھے لکھائے.. پہلے سے طے شدہ حرفوں پر قلم پھیرتا رہوں.. اور جو چاہے ہے سو آپ کرے ہے.. اور عبث ہمیں بدنام کیا.. بے شک میری تختی کی لیپا پوتی سب سے بڑھ کر ہے۔ میری کِلک کی تراش بے مثال ہے.. لیکن میرا کام صرف یہ ہے کہ لکھے لکھائے پر وہ کِلک پھیرتا چلا جاؤں..

''درست..'' میں نے سر جھٹکا.. محمد علی ڈاکیے کے سامنے.. بلکہ اس کے بدخشانی گھوڑے کی جلد کی لشکتی تھرتھراہٹ کے سامنے سر جھٹکا اور کہا ''جو کچھ میرے نصیب کی تختی پر پُورنوں کی صورت میں اُلیکا جا چکا ہے اس کا حتمی اور آخری ہونا اپنی جگہ لیکن.. تم مجھے یہ تو بتا سکتے ہو کہ تم کون ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کون ہوں؟''

''مجھے علم ہوتا کہ تم کون ہو تو میں تم سے دریافت کرتا کہ تم کون ہو؟''

''ہاں.. کیونکہ تمہیں یقین نہیں کہ میں وہی ہوں.. اس لیے تم پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں..''

''میں بتاتا ہوں..'' بدخشانی گھوڑے کے نتھنے تھرکے ''یہ سوال میرے سوار سے کیوں پوچھتے ہو..'' گھوڑے کی جلد لشکتی تھی ''تم بتاؤ کہ کیا یہ میرے بس میں ہے کہ مجھ پر کون سوار ہوتا ہے.. ایک احمق یا دانا.. ایسے ہی یہ تمہارے بس میں بھی نہیں ہے کہ تم پر کون سوار ہوتا ہے..''

''لیکن میں تو گھوڑا نہیں ہوں..''

''تم ہو..''

''کیسے؟''

''ایسے کہ تمہارے پورنے لکھے جا چکے ہیں.. تم پر تمہارا لکھا جا چکا نصیب سواری کرتا ہے.. باگیں اُس کے ہاتھ میں ہیں اور وہ انہیں اتنی قوت سے کھینچتا ہے تمہیں متعین کردہ راستے پر ہی رکھنے کے لیے کہ تمہارے نتھنے چرنے کو آتے ہیں.. وہ تمہاری کمر میں ایڑیاں ٹھونکتا ہے کہ چلو.. تو تم چل پڑتے ہو.. باگیں کھینچتا ہے تو تم اُنہی قدموں پر رُک جاتے ہو.. ڈھیلی چھوڑتا ہے تو تم سر جھکا کر چلنے لگتے ہو..''

''تم خاموش نہیں ہو سکتے..''

''میں ہو جاتا ہوں.. کیوں خاموش کرنا چاہتے ہو مجھے؟''

''تاکہ میں تمہارے سوار سے پوچھ سکوں کہ وہ کون ہے..''

''ہم دونوں کا.. میرا اور تمہارا سوار ایک ہی ہے..''

''پھر بھی پوچھنا چاہتا ہوں..''

''پوچھ لو...''

''تم کون ہو؟''

''میں محمد علی ڈاکیا ہوں سر..'' گھوڑا پس منظر میں چلا گیا اور سوار بولنے لگا ''اُدھر دریا کنارے گلیشیر کے دہانے پر چند چولہے ہیں وہاں ڈاک دینے جا رہا ہوں.. آخری دو کلومیٹر مجھے گھوڑا کام نہ دے گا.. اسے ایک جل چکے چنار کے سیاہ تنے سے باندھ کر پیدل اوپر جاؤں گا اور اُس بستی کے لوگوں کو.. جس میں آٹھ چولہے ہیں اُنہیں ان کے نام کے خط پہنچاؤں گا..''

بدخشانی گھوڑا جو تھوڑی دیر پہلے پس منظر میں چلا گیا تھا پھر نمایاں ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اُس کی پشت پر دو چرمی تھیلے جھولتے ہیں.. اُن میں سے ایک تھیلے کا فلیپ اُلٹ کر اُس نے کچھ خط نکالے اور مجھے دکھائے ''یہ خط صاحب..'' وہ اُنہیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا..

''محمد علی.. کیا ان میں میرے نام کا کوئی خط بھی ہے..''

اُس نے بے دھیانی میں نظر اٹھائی ''آپ کا نام کیا ہے صاحب؟''

میں نے بتایا..

اُس نے اُن چند خطوط کو باری باری نہایت غور سے دیکھا.. ان پر لکھے ناموں کو پڑھا۔

آگے پیچھے کیا اور پھر سر ہلا کر نادم سا ہوا اور سادگی سے مسکرانے لگا ''صاحب کیا بات کرتے ہو.. اِدھر آپ کے نام کا کوئی خط کیسے ہوسکتا ہے۔''

ہاں.. یہ ممکنات میں نہ تھا..

وہاں میرے نام کا کوئی بھی خط کیسے ہوسکتا تھا..

کہاں؟...

وہاں بام دنیا کے ایک پہاڑوں میں پوشیدہ شہر.. تبت خورد کی بستی سکردو سے آگے.. وادیٔ شگر اور خوبانیوں کے سورجوں سے لدے ہوئے ایک شجر سے آگے.. ایک پرشور برفانی نالے کے پار.. کہیں بلند پہاڑوں کی ویرانیوں میں یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ بدخشانی گھوڑے پر سوار سامنے سے یکدم نمودار ہونے والے ایک ڈاکیے کے پاس کوئی ایک خط میرے نام کا بھی ہو..

یہ تو صرف اُس ڈاکیے کی سادگی تھی جو میرے پوچھنے پر نہایت سنجیدگی سے ہر لفافے پر پوسٹ کارڈ پر میرا نام تلاش کرتی تھی اور پھر فوراً ہی یہ سادگی ندامت میں بدل گئی تھی..

اور یہی.. وہ لمحہ تھا.. جب ڈاکیا محمد علی لفافے اور پوسٹ کارڈ نہایت انہماک سے اُلٹتا تھا.. میرے نام کا خط تلاش کرتا تھا.. جس نے آئندہ برسوں میں مجھے چین سے سونے نہ دیا.. اگر اُس لمحے وہ اُن میں سے کسی ایک خط پر ٹھہر جاتا.. بے یقینی سے اُسے کچھ دیر تکتا اور پھر سر اُٹھا کر کہتا ''ہاں صاحب.. آپ کے نام کا ایک خط — ہے!''

تو پھر کیا ہوتا..

میرا ردِعمل کیا ہوتا..

یہ تو نہیں ہوسکتا تھا کہ اس دنیا میں کوئی ایک ایسا شخص ہو.. ایسی ہستی ہو.. بے شک غیب کا علم رکھنے والی ہستی ہو.. پھر بھی اُسے معلوم ہو جائے کہ میں اپنے شہر سے نکل کر سینکڑوں کلومیٹر دور کسی ناآشنا وادی کے درمیان.. فلاں دن.. فلاں وقت.. دو بج کر اکیس منٹ اور چالیس سیکنڈ پر.. ایک برفانی نالہ پار کر کے.. وہاں موجود ہوں گا اور وہ یہ پتہ.. لمحۂ وقت نوٹ کر کے مجھے ایک خط روانہ کردے.. سامنے سے آنے والے محمد علی ڈاکیے کے چرمی بیگ کے لیے..

بے شک غیب کا علم رکھتا ہو.. لیکن اتنا باضابطہ.. باقاعدہ اور صحیح تو نہیں ہوسکتا.. کہ یہ خط فلاں دن.. فلاں وقت.. سورجوں سے آرائش شدہ ایک شجر کے آگے ایک نالے کے پار یہ خط مکتوب الیہ تک پہنچے.. اور وہ اس لمحے پہنچ جائے..

یہ ہو تو نہیں سکتا تھا..

لیکن اگر یہ ہو جاتا..

محمد علی ڈاکیا ایک خط الگ کر کے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہہ دیتا کہ صاحب آپ کے نام کا ایک خط ہے..

تو وہ خط کس کا ہوسکتا تھا..

اگر وہ محض ایک ڈاکیا ہی تھا..

کوئی اور نہ تھا..

کچھ اور نہ تھا..

تو پھر وہ خط کس کا ہوتا؟

میں ابھی تک ایک ان جلی دیا سلائی ہوں...

مجھے اپنے آپ جل جانے پر کوئی اختیار نہیں.. مجھے کوئی جلائے تو جلتی ہوں.. بہت سے لوگ.. روزمرہ کے معمول کے مطابق.. اپنی ضرورت کے تابع مجھے جلاتے ہیں.. کبھی آتش دان کی لکڑیوں کو سلگانے کے لیے.. کبھی ایک سگریٹ کے لیے.. اور کبھی بلخ کے کسی متروک آتش کدے میں مقدس آگ روشن کرنے کے لیے!

اور کچھ لوگ.. لاکھوں میں سے دو چار لوگ مجھے جلاتے ہیں خودسوزی کے لیے..

مجھے بھی بالآخر جس مقصد کے لیے جلایا گیا وہ خودسوزی کی ہی ایک قسم ہے جسے بازاری لوگ ''محبت'' کہتے ہیں۔

میں نے کب جلنا تھا.. کس مقصد کے تابع جلنا تھا اس پر تو میرا کوئی اختیار نہ تھا.. کوئی بس نہ تھا..

میں تو ابھی ڈبیا میں تقریباً باون اَن جلی دیا سلائیوں کے ہمراہ قید میں تھی.. ہم میں سے کسی کو بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ کب اس ڈبیا کے اندر ٹٹولتی ہوئی اُنگلیاں آئیں.. ہم میں سے.. ہم باون میں سے.. کسی ایک سے چھو جائیں اور اُسے نکال کر ڈبیا کے پہلو سے رگڑ کر جلا دیں.. چونکہ میں بھی یونہی.. انجانی اُنگلیوں کی گرفت میں آ کر.. جل اُٹھی تھی اس لیے یہ سرگزشت بھی میری ہے..

چونکہ جلی میں تھی اس لیے بیان بھی میں ہی کر رہی ہوں..

ایک مرغولے کی مانند اُٹھتی گھومتی سیڑھیاں ہیں جن پر کچھ قدم ہیں جو اُتر رہے ہیں..

ہم باون ہیں اَن جلی دیا سلائیاں اور سیڑھیوں کی تعداد بھی باون ہے.. اور رات ہے..

سیڑھیوں کا اکلوتا بلب فیوز ہو چکا ہے.. قدم نابینا ہیں اور دیکھ نہیں سکتے.. اندازے سے

اٹک اٹک کر گھومتے آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ اُترتے جاتے ہیں..

ایک ہیجان میں مبتلا بدن کے پسینے کی مہک ہے جو تاریکی میں گوندھی جا رہی ہے.. اور یہی مہک اُس کی موجودگی کا پتہ دے رہی ہے..

تب ڈبیا کے بند تابوت کو کوئی سرکاتا ہے جس میں باون اَن جلی دیا سلائیاں لیٹی ہوئی ہیں.. ایک دوسرے کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں اور اُن میں سے ایک میں بھی ہوں.. ہم سب دم روک لیتی ہیں کہ جانے کس کی اجل آئی ہے.. ٹٹولتی ہوئی اُنگلیاں مجھ پر ٹھہر جاتی ہیں، مجھے گرفت میں لیتی ہیں اور ڈبیا سے باہر نکالتی ہیں.. باہر اندھیرے میں ایک مہک ہے جو میرے مساموں میں اُتر جاتی ہے.. اُنگلیاں میرا ان جلا مُنہ ڈبیا کے پہلو سے رگڑتی ہیں تو میں فوراً جل اُٹھتی ہوں..

جل اُٹھتی ہوں تو اندھیرے میں دفن ایک چہرہ مڑتا ہے اور اُسے دیکھتا ہے جس کی اُنگلیوں میں میرا جلتا ہوا وجود ہے..

بس یہی خودسوزی کے آغاز کا وہ لمحہ ہے جسے بازاری لوگ ''محبت'' کہتے ہیں..

میں زیادہ دیر تک نہیں جلی لیکن اتنی دیر ضرور جلی کہ خودسوزی کی پہلی بھڑک کا باعث بن گئی..

پیچھے مڑ کر دیکھنے والا چہرہ سیڑھیوں کے اندھیرے میں یکدم رونما ہونے والے ایک مختصر شعلے کی روشنی میں ایک ناآسودہ اور بنجر شخص کے چہرے کو دیکھتا ہے اور اُس لمحے وہ انسان سے جانور میں بدل جاتا ہے.. کہ انسان حساب کتاب.. حواس اور منطق کا نام ہے اور جو کچھ اُس ایک مختصر شعلے کے بھڑکنے اور بجھنے کے درمیان ایک چُٹکی بھر ساعت میں ہوا وہ صرف ایک جانور کی خصلت ہی ہو سکتی ہے.. جیسے جنگل میں کہیں ایک ٹہنی ٹوٹنے سے جانور کی تمام تر حسیات چوکنی ہو جاتی ہیں.. ایسے میرے روشن ہوتے ہی اور اُس چہرے کے پلٹ کر دیکھتے ہی.. ایک فی الفور موت میں تاریک ہو جانے والے شعلے کی مختصر مدت کی روشنی میں نظر آنے والے ناآسودہ اور بنجر شخص کو مڑ کر دیکھنے والے چہرے نے اُس ایک ساعت میں اپنے آپ کو فنا کر لیا۔ آئندہ برسوں کے لیے، آئندہ صدیوں کے لیے..

اور یہ تبدیلی یک طرفہ نہ تھی..

بنجر شخص نے مڑتے ہوئے چہرے پر وہ سارے موسم دیکھے جن کی غیر موجودگی نے اُس کی زندگی کو بنجر کر دیا تھا.. خودسوزی کی پہلی چنگاریاں اُس کی آنکھوں میں بھی بھڑکنے لگیں..

کسی بھی محبت کا آغاز اس سے مختصر وقفے میں کہاں ہوا ہوگا.. کہیں بھی نہیں۔

بنجر شخص کبھی ہرا بھرا تھا..

اُسے اعتماد تھا کہ ایک شخص بیک وقت مختلف رشتے برابری کی بنیاد پر نبھا سکتا ہے.. صرف اس کے لیے نیت کی شفافی درکار ہے اور وہ اس آئیڈیل کی تکمیل کے لیے جُت گیا.. لیکن اس کا نتیجہ بے حد غیر متوقع نکلا.. نیت کی درستگی انصاف کے پلڑوں کو برابر رکھنے میں شدید طور پر ناکام ہوگئی.. یہ کھلا کہ آپ صرف ایک قبیلے کے وفادار رہ سکتے ہیں.. تمام قبائل کے ساتھ محبت اور دیانت کی ایک ہی سطح پر قیام کرنا ممکن نہ تھا.. چنانچہ اسے ہر قبیلے نے دھتکار دیا.. کوئی ایک بھی درِ نیم وا نہ تھا سب کے سب مضبوطی سے بند تھے اور وہ کب تک سر پٹختا.. بے چارگی اور بے توجہی نے اُسے ایک ایسے بھیگے ہوئے بے گھر اور لاچار پلّے کی مانند کر دیا جو گندی نالی میں پڑا چاؤں چاؤں کرتا رہتا ہے اور کوئی بھی اُس پر ترس نہیں کھاتا..

ایک بھیگا ہوا بے گھر پلّا جب اندھیری سیڑھیوں میں یکدم روشنی کی ایک لپک میں مڑتا ہوا ایک چہرہ دیکھتا ہے تو وہ اگرچہ اُس کے جمال سے ششدر رہ جاتا ہے لیکن اُس ایک چہرے میں وہ اپنی تمام تر محرومیاں بھی دیکھتا ہے اور نا آسودگی مزید ایک گہری جھیل ہو جاتی ہے..

پلٹتے چہرے میں بھی ایک ٹھٹک ہے.. اسے بھی پتہ نہ تھا کہ صرف مڑ کر دیکھنے سے اس کی ساری حیات کا تانا بانا اُلجھ جائے گا.. اس کی زندگی کے کھیس کا ہر دھاگا بے سمت ہو جائے گا.. ایک معمول کے رنگوں اور خاکے والے.. ایک خاص نقشے والے کھیس کی بجائے.. جو کہ ہر چہرے کے نصیب میں ہوتا ہے.. ایک سراسر مختلف رنگ صرف اُس کے پلٹنے سے وجود میں ایجاد ہو جائیں گے... اس کے تن بدن میں ایسے خاکے اور نقش جنم لیں گے جو اس مختصر لمحے کی بھڑک کے نتیجے میں ظاہر ہوں گے..

اُسے.. اُس چہرے کو اگر یہ گمان بھی ہوتا تو شاید وہ پلٹ کر نہ دیکھتا.. کیوں دیکھتا.. اگر دیکھتا تو اپنی آئندہ حیات کی مسلسل شکست و ریخت کو یقیناً دیکھتا.. تو پھر کیوں دیکھتا؟

لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا..

اُس چہرے کی حیات کا کھیس بھڑک کے ایک لمحے میں ہمیشہ کے لیے.. اگرچہ سب سے جدا.. بُنا گیا..

کھیس کی بناوٹ پر نہ اُسے.. اور نہ اسے جو اسے دیکھتا تھا.. کوئی اختیار رہا.. آئندہ

برسوں کے لیے.. آئندہ صدیوں کے لیے..

تو میں ڈبیا کے تابوت میں سے ٹٹولتی اُنگلیوں سے نکلی اگرچہ باون میں سے صرف ایک ماچس کی تیلی تھی لیکن وہ جو ایک عام سی اگرچہ خوش چہرہ لڑکی تھی.. میری بدولت دوام میں بدلی..

میں نے اپنی چند ساعت کی حیات میں اُن دونوں کے چہروں کو.. جو پلٹ کر دیکھتا تھا اور جو اُسے ششدر ہو کر دیکھتا تھا.. ان دونوں چہروں کو متغیر ہوتے.. ایک ہی مختصر لمحے کی بھڑک میں.. انسانوں سے حیوانوں میں بدلتے.. مکمل طور پر خود سپردگی اور فنا میں غرق ہوتے دیکھ لیا تھا.. لیکن میں آپ سے بالکل سچ کہوں گی.. جو کہوں گی دین ایمان سے.. اگر ماچس کی ایک تیلی کا کوئی دین ایمان ہوتا ہے.. تو بالکل سچ سچ کہوں گی.. کہ میں محض ماچس کی ایک تیلی ہوں جس کی حیات بھڑک کر.. بجھ جانے کے درمیان.. ایک پلک جتنی دیر میں جھپکی جاتی ہے اُس وقفے کے درمیان حیات ہوتی ہے تو میں بالکل سچ کہتی ہوں کہ اس لمحے میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ دونوں.. جس نے پلٹ کر دیکھا.. اور جس نے اسے میری روشنی میں پلٹتے ہوئے دیکھا.. یہ دونوں آئندہ سارے برسوں.. ساری صدیوں میں یونہی ایک دوسرے کے لیے حیوان ہی رہیں گے اور کبھی بھی عام انسان نہ ہو سکیں گے.. یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا.. اُس بھڑک کے عارضی لمحے میں!

اور یہ بھی میرے گمان میں ہرگز نہ تھا کہ پلٹنے والے چہرے کی جانب سے اُس کے آخری خط میں مُردہ شاعرہ کا ایک شعر ہوگا جو اس بنجر شخص کے ضمیر میں ایک کانٹے کی طرح چُبھتا رہے گا..

میں تو کسی مردہ تو کیا.. زندہ شاعرہ کو بھی نہیں جانتی تھی کہ میں محض ماچس کی ایک تیلی تھی.. جو پل بھر کے لیے بھڑکنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ناکارہ اور مُردہ ہو جاتی ہے اور وہ دونوں آگے چلے گئے تھے اور میں کسی ایک سیڑھی پر اُسی مُردہ حالت میں پڑی رہ گئی تھی اگرچہ میرے مساموں میں اس چہرے کا جمال رچ گیا تھا جس نے پلٹ کر میری روشنی میں اسے دیکھا تھا..

میں کسی ایک سیڑھی پر پڑی رہ گئی تھی..

اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کونسی سیڑھی پر.. باون میں سے بیسویں یا تیسویں سیڑھی پر.. گری پڑی رہ گئی تھی اور وہ آگے چلے گئے تھے.. وہ مجھ پر پاؤں دھر کے.. وہ بنجر شخص.. نیچے اُتر گیا تھا...

میں کسی ایک سیڑھی پر مردہ پڑی رہ گئی تھی اور مجھے تاریکی سے ڈر لگ رہا تھا.. مردہ تھی

لیکن اُن کے اُترتے قدموں کی چاپ سن رہی تھی..وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے گلی میں نکل گئے تھے اور اب سیڑھیاں ویسے ہی تاریک اور خاموش تھیں جیسے ان کے اترنے سے پیشتر تھیں..

اگرچہ میرے سارے مساموں میں اس پلٹنے والے چہرے کا جمال رچ گیا تھا لیکن میں اسے آنکھ بھر کے دیکھ نہ سکی تھی..میں خود روشنی کے جھماکے میں تھی اور میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں..سیڑھیوں پر مردہ پڑے مجھے ایک اور خیال آیا..میری آنکھیں اس لیے چندھیائی تھیں کہ اُس چہرے میں سے چکا چوند سورج طلوع ہو رہے تھے..

میں ماچس کی ایک تیلی پھر سے اندھیری ہو چکی باون میں سے کسی ایک سیڑھی پر پڑی اپنے انجام سے مطمئن تھی..کہ میرا جلنا کام آ گیا..دُنیا کی باون تیلیوں میں سے یہ میرے نصیب میں تھا کہ اپنی فنا سے پیشتر ایک بھڑک سے دو انسانوں کو حیوان کر جاؤں..کہ انسانوں کی محبت میں اتنی پائداری نہیں ہوتی..

اتنے ڈھیر سارے برسوں کے بعد میرا جی چاہتا ہے کہ اُس بنجر شخص کو ایک خط لکھوں اور اپنا احسان جتاؤں کہ یہ صرف میں تھی جس کے بھڑکنے سے تم پھر ہرے بھرے ہو گئے تھے..ابھی تک ہو..لیکن میرے پاس اُس کا پتہ نہیں ہے..یہ خط اگر لکھوں تو کس پتے پر لکھوں..کس ڈاکیے کے حوالے کروں جو اُسے..جہاں وہ ہو وہاں اسے پہنچا دے..

میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے ایک خط لکھوں..

یہ سب کچھ ماچس کی ایک تیلی کا کیا دھرا تھا کہ اب عشق..نڈھی کے تھاؤں تھائیں بول رہا تھا..

بدن کا ہر مُو جب بولتا ہے تو ڈھنڈیا پٹ جاتی ہے..کُل جہان کو خبر ہو جاتی ہے..چہار سُو لاؤڈ سپیکر لگ جاتے ہیں، عشق کے اعلان ہونے لگتے ہیں..زمین پر جتنی بھی مخلوق سانس لیتی ہے اُسے تو خبر ہو ہی جاتی ہے لیکن زمین کے اندر کے مکین بھی جان جاتے ہیں کہ اوپر ایک نڈھی کے تھاؤں تھائیں عشق بول رہا ہے کہ اس عشق کی ایک دھمک ہوتی ہے جو زیرِ زمین بھی سنائی دیتی ہے..عشق کا ہاتھی..پوش کریندا پوش..ہر شے کو روندتا چلا جاتا ہے..

جب ڈھنڈیا پٹ جائے..عشق کی دھمک زیرِ زمین بھی سنائی دینے لگے..لاؤڈ سپیکروں پر اعلان ہونے لگیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شکاری کو خبر ہی نہ ہو کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے..نڈھی اس کی بیٹی اگرچہ خاموش رہتی تھی لیکن اس کے بدن کے ہر مسام ہر مُو سے عشق بولتا تھا..تو اُسے کیسے خبر نہ ہوتی..

میں اسی شکاری کی بندوق ہوں..بیکال ہوں یا پریڈی اس سے آپ کو کیا غرض..میں محض مرغابیاں نہیں انسانوں کو بھی ہلاک کر دینے پر قادر ہوں..

ذرا ٹھہریئے..بندوق کی سرگزشت سے پہلے میری بھی ایک مختصر سی کہانی ہے کہ میں عام چمڑے سے بنی ہوئی ایک ایسی بیلٹ ہوں جو پتلون کو ڈھلکنے سے بچاتی ہے اور میں شکاری کی پتلون کی بیلٹ ہوں..شکاری اس پختہ یقین میں تھا کہ نڈھی یعنی لڑکی کے ہر موئے بدن سے جو عشق بولتا ہے وہ اس بیلٹ کی زد میں آ کر دم توڑ دے گا..منت سماجت کرے گا..ہمیشہ کے لیے

چپ ہو جائے گا.. زیرِ زمین رہنے والے بھی اطمینان کا سانس لیں گے اُن کے کانوں تک کوئی دھمک نہیں پہنچے گی اور وہ سکون کی نیند سو سکیں گے..

چمڑے کی بیلٹ کو ایک کومل بدن پر استعمال کرنے کی نوبت تب آتی ہے جب پیار چمکار.. واسطے.. منت سماجت.. عزت اور ناموس کے حوالے.. دھمکیاں اور خاندانی وقار کے آزمودہ گُر کارگر نہیں ہوتے..

مجبوراً چمڑے کی بیلٹ کو پتلون سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے اور ایک دُرّے کی صورت استعمال میں لایا جاتا ہے..

اُس کا.. نڈھی کا.. بدن اشکولے کی کنواریوں ایسا تھا جس پر جب چمڑے کی بیلٹ.. یعنی جو میں ہوں.. میرا پہلا وار ہوا تو وہ بدن جو کسی بھی اذیت سے آج تک نا آشنا تھا.. حیرت بھرے سناٹے میں آ گیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے.. اس اذیت نے بدن پر عشق کے بولنے والے ہر مُو کا دم لحظہ بھر کے لیے روکا.. اس رکاوٹ کو برداشت کرنے کے لیے اُسے چیخنا تھا اور وہ چیخی..

اُس کی چیخیں نہ صرف ساتھ والے گھروں بلکہ پورے قصبے پر تیرتی دوہائی دیتیں.. گھر گھر کو جاتی تھیں..

مجھے.. یعنی چمڑے کی بیلٹ کو اچھا نہیں لگا کہ میں جو محض پتلون کو ڈھلکنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی.. مجھ سے ایک کومل بدن کو پاگل پن سے بے دریغ پیٹا جائے.. لیکن میں کیا کر سکتی تھی.. بے اختیار تھی.. شکاری کا ہاتھ مجھے گھماتا تھا اور مجھے وہی کرنا تھا جو وہ چاہتا تھا.. میں بدن کے نشیب و فراز پر پوری شدت سے وارد ہوتی اور اُس پر نیلے نشان چھوڑتی جاتی.. تا آنکہ اُس کا تن من نیلو نیل ہو گیا.. وہ اگرچہ پیدائش سے لے کر اب تک دُودھیا رنگ کی تھی لیکن میری وجہ سے وہ نیل کی نیلاہٹ اذیت میں رنگی گئی..

لیکن وہ بہت ڈھیٹ ثابت ہوئی.. جیسے ایک جانور ڈھیٹ ہو جاتا ہے.. میری زد میں آ کر اُس کا ایک مُو بند ہوتا تو دوسرا کُھل جاتا اور عشق بولنے لگتا..

برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ اس کے پار اُتر چکی تھی۔ ایک کچے گھڑے پر..

وہ ناممکن کے حصول کی چاہت میں گرفتار تھی.. کہ اُسے جس کے ساتھ نتھی کیا جا چکا تھا وہ اُسے ترک کر کے وہ کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی جو لا حاصل تھا.. وہ حساب کتاب کرنے کے قابل

نہ رہی تھی کہ ایک مست مُنہ زور ہاتھی تلے کچلی گئی تھی..

ع حافظ ہاتھی عشق دا پوش کریندا پوش..

ہٹو بچو.. ہٹ جاؤ راہگیرو.. پوش پوش کہ.. عشق کا ہاتھی چلا آ رہا ہے جو اندھا اور پاگل ہو چکا ہے.. کسی کا.. جو اس کا راستہ روکے لحاظ نہیں کرتا.. دریغ اس کی لغت میں شامل نہیں.. وہ روند دیتا ہے.. تباہ کر دیتا ہے جو کوئی بھی اس کے راستے میں آئے.. تو شکاری کو شاید احساس نہ ہوا لیکن میں چمڑے کی بیلٹ جو اس کے کومل بدن کو ادھیڑتی تھی میں جان گئی کہ بے شک میں ساری عمر اس کے شفاف چمڑے پر برستی رہوں تب بھی اُس کے ہر مُو سے عشق نے بولنا تھا.. کہ وہ عشق کے ہاتھی تلے روندی گئی ایک تباہ شدہ لڑکی تھی..

میں نے ہتھیار ڈال دیئے..

میں نے کیا' شکاری آپ تھک گیا اور اس نے مجھے رکھ دیا..

جب میں کارآمد ثابت نہ ہو سکی تو شکاری کی جھنجھلاہٹ نے بندوق کو کھونٹی سے اتار لیا..

اب میری.. چمڑے کی بیلٹ کی کہانی ختم ہوتی ہے اور میرے بعد جو کچھ کہے گی کھونٹی سے اُتری ہوئی شکاری کی بندوق کہے گی..

میں بیکال ہوں..

پریڈی نہیں ہوں..

جھیل بیکال کے نام والی شکاری کی وہ بندوق ہوں جسے وہ اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر چاہتا تھا اسی لیے اُس نے مجھے اپنی اولاد پر استعمال کرنے کی ٹھانی..

مجھے بے حد حیرت ہوئی.. مجھے یقین نہ آ سکا.. کہ یہ میری حیات میں پہلی بار تھا جب میری نالی کا رُخ جھیلوں میں اُترتی.. تیرتی.. یا اُن پر اُڑان کرتی مرغابیوں کی جانب نہ تھا.. ایک انسان کی جانب تھا.. شکاری کی بیٹی کی جانب تھا..

اگرچہ میرا کام ہلاک کر دینا تھا چاہے وہ ایک آبی پرندہ ہو یا انسان لیکن مجھے مرغابیاں مارنے کی عادت ہو چکی تھی اور میں اپنی ہر ذی روح کو ہلاک کر دینے والی خصلت کو بھول چکی تھی۔ اسی لیے جب میری نالی کا رُخ ایک انسان کی جانب ہوا.. نشانے کی مکھی میں ایک آنسوؤں سے بھرا چہرہ نظر آیا تو میں اس تبدیلی کی تاب نہ لا سکی.. یہ نہیں کہ میں نے فائر کرنے سے انکار کر دیا کہ

میں بھی چمڑے کی بیلٹ کی مانند بے بس اور بے اختیار تھی بلکہ میرے وجود کے اندر جتنی بھی بے دریغ ہلاکت تھی وہ بزدل ہوگئی..

کیا میں اسے بیان کردوں جو میری نالی کی زد میں تھی اور تھر تھر کانپتی جاتی تھی..وہ ایک زرد پڑتا سنہری چہرہ تھا.. کچا..کومل نادان اور یہ سمجھنے والا کہ عشق دنیا کو زیر کرسکتا ہے..فتح کرسکتا ہے..یہ جانے بغیر کہ تمامتر داستانوں کے باوجود عشق کی کوئی حیثیت نہیں..یہ خلل ہے دماغ کا..

اسے کئی روز تک ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا..

یہ کمرہ تو دراصل نہیں تھا گھریلو کاٹھ کباڑ کا سٹور تھا اور چونکہ کاٹھ کباڑ کو روشنی اور ہوا کی حاجت نہیں ہوتی اس لیے یہاں ان دونوں کی کمی تھی جو محسوس نہیں کی جاتی تھی کیونکہ جو بھی اس میں آتا تھا پل دو پل کے لیے آتا تھا اور کوئی ٹوٹی ہوئی میز' خالی کارٹن یا کار کی بیکار ہوچکی بیٹری وغیرہ رکھ کر چلا جاتا تھا..اُسے بھی وہاں رکھ کر..وہ دھکیل کر چلے گئے تھے..یہ دھیان بھی نہ رکھا تھا کہ ایک انسان کو ایک باتھ روم کی حاجت ہوتی رہتی ہے..اس لیے وہاں متروک اشیاء کی بوسیدگی کے سوا ایک اور بُو بھی تھی..ماں کبھی کبھار چوری چھپے اس سے نظریں ملائے بغیر کھانے کو کچھ رکھ جاتی تھی..

لیکن میں نے اسے تب دیکھا جب اسے گھر کے مختصر صحن میں لایا گیا..صحن کی بلند دیواروں سے کچھ بیلیں خوف سے چمٹی ہوئی تھیں..وہ ابھی تک اُسی پیلے سوتی پیراہن میں تھی جو ان دو ہفتوں کی قید تنہائی کے دوران پسینے اور خوف سے بُو دینے لگا تھا..اور یہ سب کچھ ماچس کی ایک تیلی کا کیا دھرا تھا جو تاریک سیڑھیوں میں لمحہ بھر کے لیے بھڑک اُٹھی تھی..

شکاری بُرا شخص نہیں تھا..اُس نے اسے پالا پوسا تھا..لاڈ پیار کیا تھا..بڑا کیا تھا..اسے آزادی دی تھی ہر قسم کی لیکن اسے ذاتی پسند سے چناؤ کی حماقت کی آزادی نہیں دی تھی..

شکاری ہرگز کٹھور اور سخت گیر نہ تھا لیکن رواج کے بندھن اسے یوں باندھتے تھے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چمڑے کی بیلٹ کی ناکامی کے بعد میرا انتخاب کرنے پر مجبور ہوگیا تھا..

دونوں مجبور محض تھے..

میری لبلبی پر جس کی اُنگلی تھی وہ بھی اور میری نالی کے سامنے جو تھر تھر کانپتی لڑکی تھی وہ بھی..

ایک مجبور رواج کے بندھنوں میں بندھا ہوا بے بس تھا..اور دوسرے کو عشق کا ہاتھی روند چکا تھا..

شکاری کی صرف ایک ہی شرط تھی کہ وہ جو اُس کے رُوں رُوں سے عشق بول رہا ہے وہ چپ ہوجائے..وہ جو جنگل بیلے میں کُوک اُٹھتی ہے اور کُوچہ بہ کُوچہ کُو بہ کُو جاتی ہے وہ خاموش ہوجائے..اور ان بولوں اور کُوکوں کی بجائے وہی خاموشی لوٹ آئے جو ایک بھرے پُرے مطمئن اور آسودہ خاندان میں پہلے ہوا کرتی تھی..

لیکن وہ جو تھی میری اُٹھی ہوئی نالی کے سامنے جو تھی..وہ اگرچہ تھر تھر کانپے چلی جارہی تھی..اس کی کچی چھاتیوں میں خوف کے دودھ خشک ہوتے تھے..اُس میں فوری طور پر باتھ روم جانے کی حاجت زور مارتی تھی..وہ موت کے لیے تیار نہ تھی..لیکن وہ بے اختیار ہوچکی تھی..روندی جاچکی تھی اس لیے بے بس تھی..ہر مُوئے بدن سے اٹھنے والی کُوک کا گلا گھونٹنے پر قادر نہ تھی..چاہتی تو بھی شکاری کی خواہش اور دھمکی کے آگے سر تسلیم خم نہ کرسکتی تھی..

ہاں..میں جو شکاری کی بندوق ہوں اقرار کرتی ہوں کہ مجھے..ایک حیرت ہوئی..اس ایک حیرت کا سبب یہ تھا کہ شکاری آسمان کے نیلے تالاب میں بلندیوں پر تیرتی مرغابیوں میں سے کسی ایک کا چناؤ کرکے اُسے بے جان کرکے نیچے اپنے قدموں میں لاسکتا تھا..اب وہی شکاری ایک اتنے بڑے اگرچہ تھر تھر کانپتے نشانے کی جانب اور بہت قربت میں..اتنی قربت میں کہ تھر تھر کانپتے نشانے کو محض ایک پتھر سے سنگسار کیا جاسکتا تھا..وہی شکاری شست باندھتے ہوئے..میری نالی کا رُخ اس دل کی جانب نہ کرتا تھا جو روندا جاچکا تھا بلکہ ذرا پرے کرتا تھا..

موت کے ڈر سے مسلسل جھنجھوڑے جانے والے بدن کی آنکھیں اس ذرا سے فرق کو نہیں جان سکتی تھیں..صرف میں جان سکتی تھی..

جب اس نے میری لبلبی کو دبایا تو مجھ میں سے جنم لینے والے دھماکے کی شدت سے صحن کی دیواروں سے چمٹی ہوئی بیل کی ایک لڑی اینٹوں کا ساتھ چھوڑ کر لٹک گئی..بے جان ہوگئی..اس بیل کو جو صحن کی دیوار سے ایک مدت سے چپکی ہوئی چپ اور شانت تھی اسے بھی میری نالی میں سے برآمد ہونے والے یکدم دھماکے کی عادت نہ تھی..اس فائر نے اسے ہلاک کردیا..حالانکہ اس کی جانب تو میرا رُخ بھی نہ تھا..اور جس کی جانب میرا رُخ تھا اس کا خون چھینٹے اڑاتا ہوا بیل کے ہر پتے پر گرا..بھر بھری اینٹوں کو مزید سرخ کرگیا..اندر..گھر کے اندر بیٹھی ہوئی منتظر ماں کے چہرے پر گرا..اس نے اپنی بیٹی کے خون کو چہرے سے پونچھا اور انگلیوں کو سرخ گیلاہٹ میں تربہ تر پاکر چیخنے لگی..اگرچہ اس کی چیخ اندرونی تھی سنائی نہ دیتی تھی صرف منہ کھلا تھا اور جھرّیاں ایک دوسرے

کے قریب آتی تھیں..

اس کا خون چھینٹے اڑاتا ہوا بیل کے ہر پتے پر گرا اور وہ جو میری نالی کے سامنے تھرتھراتی تھی گر گئی.. صحن کے فرش پر ڈھیر ہو گئی..

لیکن میری گولی نے اسے نہیں گرایا تھا کہ وہ اس کے کُوکتے دل سے بہت پرے ہو کر نکل گئی تھی اور اس کی معصوم پشت پر جو ایک سبز پینٹ والا.. متعدد بار پینٹ ہو چکا دروازہ تھا اس میں چھید کر کے نکل گئی تھی.. شکاری نے جان بوجھ کر نشانہ خطا کیا تھا.. چاہتا یہی تھا کہ وہ موت کے ڈر سے سرِ تسلیم خم کر دے..

وہ گری تو چند لمحوں کے لیے گویا وہ ایک ایسی چڑیا ہوئی جس کا چڑیا دل بہت فاصلے پر ہونے والے کسی دھماکے کی تاب نہ لا کر بند ہو جاتا ہے اور وہ درخت سے گر جاتی ہے..

وہ اس مچھلی کی مانند ہوئی جس کے پانیوں میں کہیں دُور بارود کا ایک دھماکہ ہو تو وہ اس کی دہشت سے ہی زندگی ترک کر کے پانیوں پر اوندھی ہو کر بے جان تیرنے لگتی ہے..

وہ گری تو تادیر گری رہی..

ایک چڑیا.... ایک مچھلی کی طرح یکدم بے جان ہو کر گر تو گئی لیکن جب تادیر گری رہی.. تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دو ہفتوں کے پسینے بھرے خوف کے مارے زرد پیراہن کے اندر اس کا چڑیا دل ابھی تک دھڑک رہا ہے.. وہ مری نہیں ہے اور اپنا کچا ان چھوا بدن ٹٹولنے پر اسے احساس ہوا کہ خون کے وہ چھینٹے جو اُڑے تھے.. بیل کے پتوں پر پڑے تھے.. ماں کے چہرے پر گرے تھے وہ دھماکے کی دہشت تھے.. حقیقت نہ تھے.. اور یہ محض ایک اتفاق نہ تھا.. بلکہ شکاری جب شست باندھتا تھا.. ہلاکت کے نشانے لیتا تھا تو.. شکاری نہ رہا تھا' باپ ہو گیا تھا.. اور وہ گری تھی تو دھماکے کے صدمے کے باعث گری تھی..

وہ تادیر گری رہی..

وہ کب تک گری رہتی.. اس کی بھی ایک انا تھی.. پھر سے کھڑی ہو گئی... لرزتی.. کانپتی.. ٹانگوں میں بدیاں نہیں گودا ہے.. بھوک اور ناتوانی سے ہلدی کی طرح زرد چہرے کے ساتھ جب کہ اس کے پپڑیوں جمے ہونٹ خوف سے ترچھے ہو رہے تھے وہ پھر سے کھڑی ہو گئی..

وہ ایک ڈھیٹ چہرہ تھا..

ایک ضدی چہرہ تھا جسے میں نے اپنی نالی کے سامنے پھر سے کھڑے ہوتے دیکھا..

میری لبلبی اس کے بعد تین بار دبی.. میری نالی میں سے تین گولیاں نکلیں لیکن سب کی سب نشانے سے پرے لگیں.. دو دروازے کے پار اور ایک بیل کے دیوار سے اُکھڑے ہوئے پتوں کو تار تار کرتی ہوئی..

لیکن پہلے دھماکے کے بعد وہ دوبارہ نہیں گری.. اگرچہ دیوار سے چمٹی بیل کی ایک لڑی نہیں بلکہ پوری کی پوری بیل اُکھڑ کر نیچے صحن میں آ گری... یوں مردہ ہو کر گری کہ آئندہ دنوں میں گھر والوں نے بہت کوشش کی وہ کسی نہ کسی طرح پھر سے دیوار میں جڑیں پکڑ لے اس کے ساتھ چپک جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا.. وہ ہمیشہ کے لیے خشک اور مردہ ہو گئی اور دیوار کی ہر اینٹ اس کے وچھوڑے میں ننگی اور بدنما ہو گئی..

وہ کھڑی رہی.. دو ہفتوں سے ان دھوئے چہرے پر آنسو دھیرے سے بہتے میل میں سے رستہ بناتے تھے.. وہ میرے سامنے کھڑی رہی۔

تب شکاری پر کھلا کہ وہ تو اس کی بیٹی ہے.. اس کی مانند ہٹ دھرم اور ضدی.. وہ جان گیا کہ وہ جان سے چلی جائے گی..

وہ یہ بھی جان گیا کہ وہ خود بھی اتنی بے اختیار ہے کہ اپنے کسی ایک کُوکتے مُو کو بھی چپ نہیں کرا سکتی.. وہ اسے ہلاک بھی کر دے گا تو اس کا ہر موئے بدن پھر بھی بے جان نہ ہو گا.. بولتا رہے گا.. اس پکار کو ختم کرنے کا اب ایک ہی طریقہ تھا کہ اسے ہراساں اور بدگمان کیا جائے۔ اس کے بارے میں جس کی انگلیوں نے باون تیلیوں میں سے ایک کو ڈبیا کے کفن میں سے نکال کر روشن کر دیا تھا.. اور یہ وہی تھا جو اس کے ہر مُو سے بولتا تھا..

وہ جو موت کے خوف سے خالی ہو جائے' اسے بدگمانی کے زہر سے بھر دیا جائے.. اس سے کسی نہ کسی طور ایک خط لکھوایا جائے جس میں پسپائی کا اقرار ہو..

یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا اور اسے پھر سے اسی تعفن سے بھرے کمرے میں واپس دھکیل دیا گیا..

لیکن انہوں نے.. شکاری نے اور ماں نے زچ ہو کر ایک اور ترکیب سوچی..

اس ترکیب کی کامیابی کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ بنجر شخص کے دل میں.. اس موت کے خوف کو.. اس کی موت کے خوف کو ڈالا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے.. اگر وہ اس خوف سے پسپائی اختیار کر لیتا ہے تو پھر لامحالہ وہ بھی اس سے بدگمان ہو جائے گی..

چنانچہ یہی لائحہ عمل اختیار کیا گیا..

بنجر شخص تک یہ مصدقہ اطلاع پہنچا دی گئی کہ شکاری شست باندھ چکا ہے..اب کی بار خون کے چھینٹے حقیقت ہوں گے..وہ مردہ بیل کے پتوں پر ہی نہیں ایک طویل مسافت میں اُڑان کرتے ہوئے اس کے بنجر چہرے پر پڑیں گے اور وہ جتنے دیر میں انہیں پونچھے گا..وہ مر چکی ہوگی..

یہ جو تھی اس کا کوئی نام نہ تھا سوائے اس کے کہ اس کے ہر موئے بدن میں سے وہ بولتا تھا..وہ جو بقول اس کے بزدل ہو گیا تھا..

اس نڈھی کا کوئی نہ کوئی نام تو ہونا چاہیے..کسی ایسی بلندی کا نام جس کی برف دھوپ کی شدت کے باوجود پگھلنے سے انکاری ہو جاتی ہے..دھوپ اور گرمی کے برچھوں کے آگے سینہ تانے کھڑی رہتی ہے اور اُس کے انجماد میں سے ایک قطرہ بھی پسپائی کا نہیں گرنے پاتا..ایسی بلندی کا کیا نام ہو سکتا ہے..

تو یہ شاہ گوری بھی تو ہو سکتی ہے جس کے راستے میں خوبانیوں سے بھرا ایک درخت ہے..نالے کے پار بدخشانی گھوڑے پر سوار ایک ڈاکیا ہے..

تو وادیٔ شگر سے پرے..حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے آگے خوبانیوں سے بھرے پُرے زرد سورجوں سے آراستہ دمکتے پیڑ سے پرے..ایک پُرشور نالے کے پار جو ڈاکیا آ رہا ہے تو کیا اسی کا..شکاری کی بیٹی کا آخری خط لاتا ہے جس میں مردہ شاعرہ کا شعر درج ہے..

''صاحب..یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہاں سکردو سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر وادیٔ شگر سے آگے اس لمحے جب آپ میرے سامنے آئے ہو تو کوئی شخص یہ جان گیا ہو کہ آپ اس لمحے یہاں سے گزریں گے تو وہ آپ کو اس پل دو پل کے پتے پر..ایک عارضی لمحاتی پتے پر خط لکھ دے..کون لکھ سکتا ہے؟''

ڈاکیے کو پتہ نہیں..

اُس کو کیا پتہ کہ وہ بدگمان تھرتھراتے بدن والی لڑکی یہ جانتی ہے کہ اس نے آئندہ زندگی میں کس ساعت کس لمحے کہاں ہونا ہے..وہ غیب کا علم رکھتی ہے..اس لیے کہ اس کی ہر مُوئے بدن سے وہ اب بھی بول رہا تھا..اور نہ تو چمڑے کی بیلٹ اُسے شکاری کے راہ راست پر لا سکی ہے اور نہ ہی بیکال بندوق کی کوئی گولی..چاہے وہ نشانے پر بھی لگ جائے..تب بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی..

کہ اسے عشق کا ہاتھی روند چکا تھا..

اگرچہ مہاوت دہائی دے رہا تھا کہ..پوش کریندا پوش..راستے سے ہٹ جاؤ..پر وہ کھڑی رہی اور روندی گئی..

وہ راستے سے ہٹ تو سکتی تھی..بدنامی بیلٹ اور بندوق..ان میں سے کوئی ایک بھی اسے راستے سے ہٹانے کے لیے کافی تھی..پر وہ ہٹی نہیں..

اُسی کا خط ہوگا..

اُس کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے..

ایک ایسا ہاتھ جس کی عمر اُس کے اپنے ہاتھ سے محض دس بارہ برس آگے کی ہوگی بہت دیر سے اپنے اختیار سے باہر اُنگلیوں کو اپنے بس میں لا کر ٹھنڈی ہو چکی چائے کی پیالی کے کُنڈے کو گرفت میں لانا چاہتا تھا اور انگلیاں انکاری ہو جاتی تھیں.. اور صرف لرزش نہ تھی جس کی بنا پر وہ ہاتھ چائے کی پیالی کے کُنڈے کو گرفت میں لینے سے قاصر ہو رہا تھا بلکہ اسے پکڑ کر منہ تک لے جا کر اس میں ٹھنڈی ہو چکی چائے کا گھونٹ بھرنے کی خواہش بھی اُس میں ذرّہ برابر نہ تھی.. بے دلی اور لرزش دونوں اس ناکامی کا سبب تھے.. محض دکھاوے کی خاطر وہ ہاتھ اُس پیالی کو پکڑ کر لبوں تک لے جانا چاہتا تھا اور ان لبوں کے پاس وہ خوشگوار فقرے نہ تھے جو ایک زیرِ زمین نیم تاریک ریستوران کی مصنوعی ٹھنڈک میں سامنے بیٹھے ہوئے کسی شخص سے کہے جاتے ہیں.. یہ ایک خوشگوار ملاقات ہرگز نہ تھی.. بہت دیر بعد وہ بولی تو اس کے ہونٹ اور اس کے پپوٹے بھی اُنگلیوں کی مانند لرزتے تھے اور وہ بولی ''وہ نہیں مانتی''..

اس کے سامنے زیرِ زمین ریستوران کی نیم تاریکی میں بیٹھی ہوئی درمیانی عمر کی گھریلو عورت میں اُس کی.. جس کا بدن چمڑے کی پیٹی سے اُدھڑا تھا اور شکاری نے جسے خوفزدہ کرنے کے لیے اپنی بیکال سے جان بوجھ کر نشانہ خطا کیا تھا اور جس کے دھماکے سے صحن کی بیل اُدھڑ گئی تھی.. اس کی شباہتیں تھیں.. خوش شکلی اسی کی تھی اور خمیدہ ہونٹ اسی کے تھے کیونکہ.. وہ اس کی ماں تھی..

''وہ ہماری بات نہیں مانتی.. تم پیچھے ہٹ جاؤ..''

عورت کے بال رنگے ہوئے تھے اور وہ اُس کی ہیئر ڈائی کے نمبر سے اس لیے واقفیت رکھتا تھا کہ وہ خود اس نمبر کے محلول سے اپنے کنپٹیوں پر سفید ہوتے بالوں کو رنگتا تھا..

عورت اپنے دُکھ.. غصے اور شدید نفرت کو دبانے کی سعی کرتی تھی تاکہ وہ عیاں ہو کر سامنے بیٹھے درمیانی عمر تک پہنچتے ہوئے شخص کو بدگمان نہ کریں..

وہ شاید پہلی بار اپنے صحن.. جس صحن کی دیواروں سے چمٹی بیلیں ایک دھماکے سے اُکھڑ گئی تھیں.. اپنے گھر سے نکل کر.. جس کے دروازوں پر دبیز چکیں اس میں مقیم نڈھی کے حسن کی رکھوالی کرتی تھیں.. وہاں سے نکل کر ایک ریستوران.. بلکہ کسی بھی ریستوران میں آ گئی تھی اسے سمجھانے.. اس کی منّت سماجت کرنے کہ وہ نہیں مانتی تم پیچھے ہٹ جاؤ..

''کیونکہ تم دونوں جو چاہتے ہو وہ ممکن نہیں.. بے شک اس کی جان بھی چلی جائے تب بھی ممکن نہیں ہوگا.. شکاری ہر بار جان بوجھ کر اپنا نشانہ خطا نہیں کرے گا.. تم چاہتے ہو کہ وہ مر جائے.. تمہیں اگر وہ عزیز ہے تو اسے خبر کیے بغیر پیچھے ہٹ جاؤ..''

اسے اپنا وجود گندی نالی میں رینگتے ہوئے ایک کیڑے سے بھی غلیظ لگ رہا تھا جس نے اس پاکیزہ اور نیک خصلت عورت کو اپنے صحن.. اپنے گھر سے باہر نکل کر اس کی منّت سماجت کرنے پر مجبور کر دیا تھا..

ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگ ان پر ایک اچٹتی نظر ڈالتے تھے اور کم روشنی کے باعث ان کی عمروں کے معمولی فرق کو پرکھنے سے قاصر تھے اور یہی خیال کرتے تھے کہ وہ ہم عمر ہیں..

محض ایک دیا سلائی کے بھڑکنے سے.. باون دیا سلائیوں میں سے کسی ایک کے جل اٹھنے سے وہ شرمندگی کی ان حدوں تک پہنچ گیا تھا..

وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کہ.. پیچھے بھی وہ تھی..

اس کے اختیار میں کچھ نہ تھا.. وہ حیوان ہو چکا تھا اور اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا.. سوائے اس کے کہ وہ شرمندہ ہو کر گندی نالی میں رینگتے ہوئے کیڑے کی مانند ہو جائے..

ایک بار جب منصور انا الحق کا نعرہ لگا دے تو اس کے بعد وہ انحراف کرنے کے قابل نہیں رہتا.. بے شک وہ ایسا کرنا بھی چاہے تو بھی..

اس کے دائیں ہاتھ کی پشت کے جوڑ پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی اس لیے وہ چائے کی پیالی بائیں ہاتھ سے اٹھا کر منہ کے قریب لاتا تھا اور گھونٹ بھرنے کے بعد اسے قطعی طور پر احساس نہیں ہوتا تھا کہ چائے گرم ہے یا یخ ہو چکی ہے..

دائیں ہاتھ پر بندھی پٹی کے نیچے جو زخم تھے ان میں شیشے کی کرچیاں ابھی تک موجود تھیں اور ان کی چبھن زخمی ماس کو چھیلتی برداشت سے باہر ہوتی تھی.. یہ زخم کل رات اس نے اپنی مرضی سے وصول کیا تھا..

حافظ ہاتھی عشق دا.. جب جُثے کو روندتا ہے تو وہ بے حس ہو جاتا ہے۔ اُس میں اگرچہ خون دوڑتا رہتا ہے لیکن رگیں شریانیں کسی قدیم جنگل کے فرش پر گری سوکھی ٹہنیوں اور شاخوں کی مانند مُردہ ہو جاتی ہیں..

کل رات....

کل رات بستر پر لیٹے وہ اپنی چارپائی سے جُڑی ہوئی بند کھڑکی کے ان شیشوں کو گھورتا تھا جن پر کسی اناڑی رنگ ساز نے سبز پینٹ کر دیا تھا اور اُن کے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا تھا..

اس کی آرزو اور جدائی کی اذیت جب اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بند کر کے.. ایک مکّے کی صورت میں یک جا کر کے.. کھڑکی کے تیسرے شیشے پر وار کیا.. جو گھنا سبز پینٹ ہو جانے کے باعث اندھا ہو چکا تھا.. اس کا بھنچا ہوا ہاتھ اس فریم کے پار گیا جس میں جڑا ہوا نابینا شیشہ اس صدمے سے کرچیوں میں بکھرا... ہاتھ چوکھٹ کے.. اس فریم کے پار گیا تو ہوا کے ایک جھونکے نے.. ہاتھ میں سے رِستے خون کی بُو سونگھی اور ٹھہر گیا.. یہ ہوا نہیں جانتی تھی کہ آرزو اور جدائی کے آزار سے آزاد ہونے کے لیے یہ ہاتھ خون آلود ہوا ہے..

ہوا ان پڑھ ہوتی ہے..

پڑھ نہیں سکتی.. ورنہ وہ اس خون آلود ہاتھ پر عشق سے روندے جانے والی بے بس کیفیت کی تحریریں پڑھ لیتی..

اُس نے کہا تھا.. جس کی شباہتیں وہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت میں دیکھ رہا تھا.. میں تو صرف اُس ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں جس ہوا میں تم بھی سانس لیتے ہو.. میں اُس باتھ رُوم میں جھانکنا چاہتی ہوں جہاں تم شیو کرتے ہو.. شیو کرنے کے بعد جو لوشن لگاتے ہو اُس کی مہک اپنے نتھنوں میں اتارنا چاہتی ہوں.. ان برتنوں میں کھانا کھانا چاہتی ہوں جن میں تم کھا چکے ہوتے ہو.. جو تمہارے جھوٹے ہوتے ہیں.. تمہاری محض موجودگی کی ہمیشگی چاہتی ہوں.. ہاں رات کو سونے کے لیے مجھے ایک چارپائی درکار ہوگی.. بے شک وہ چارپائی جو تمہارے صحن کے ایک کونے میں

مدتوں سے موسموں کی گرمیاں، سردیاں، بارشیں اور جھکڑ سہتی سہتی اپنی ادوائن ڈھیلی کر چکی ہے.. کیا تم مجھے ایک چارپائی بھی مہیا نہیں کر سکتے..

سامنے بیٹھی عورت نے ایک بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی.. اس کی کلائی بھی اس کی بناوٹ رکھتی تھی اور اس کے آگے جو انگلیاں تھیں ان میں بھی وہی کومل مہین پن اور نزاکت تھی... کہیں وہ بڑھاپے کا میک اپ کر کے.. خود آپ ہی اس کے سامنے تو نہیں آ بیٹھی.. ان میں اتنی مشابہت تھی.. گھڑی پر نگاہ اس لیے اس نے کی.. کہ وہ اپنے خاوند اور آل اولاد سے چھپ کر یہاں تک آئی تھی اور گھر سے.. بلکہ اس صحن سے غیر موجودگی.. زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی اور وہ مضطرب تھی.. خوف میں تھی کہ اس کے پاس اس غیر حاضری کا کوئی جواز نہ تھا..

وہ اس آدمی کو جو اسے گھناؤنا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بدروح، اپنے تئیں سمجھانے آئی تھی جس نے اس کی بیٹی کو.. جو ابھی ابھی ٹین ایج میں سے نکلی تھی.. اپنی اس.. بقول اس کے ساحرانہ اور مکارانہ گرفت میں لے لیا تھا.. جو چمڑے کی پیٹی اور شکاری کی بندوق سے بھی کھل نہ سکی تھی.. یہ ایسی گرفت تھی.. کھلتی نہ تھی..

وہ اسے ملنے تو آ گئی تھی.. کسی کو بھی اطلاع کیے بغیر لیکن وہ اس آدمی سے شدید نفرت کرتی تھی.. جس نے اس کے گھر کو.. اس کے صحن کو اجاڑ کر دیا تھا.. ایک اچھی بھلی ہموار زندگی میں ایسی درازیں ڈال دی تھیں جن کے اندر تباہی اور فنا کے سوا اور کچھ نہ تھا.. اس کی بیٹی نے.. بچپن کے اس منگیتر کو بھی فراموش کر دیا تھا جو ایک یورپی ملک میں نہایت متمول اور آبرومند زندگی گزار رہا تھا.. اور یہ کوئی زبردستی کا ناتہ نہیں تھا.. وہ اس کی پسند ہوا کرتا تھا.. لیکن اس گھناؤنے آدمی کے زندگی کے سمندر پر نمودار ہوتے ہی اس نے اپنی پسند راتوں رات یکسر بدل دی تھی اور اب کھڑکی کے اس شیشے کی مانند اندھی ہو گئی تھی جس پر پینٹ کر دیا گیا ہو..

''وہ میری اولاد ہے.. اور میں اسے تم سے بہتر جانتی ہوں.. تم نے تو اسے اب دیکھا ہے.. اور میں نے اسے پالا ہے.. کھلایا ہے.. میں بہتر جانتی ہوں.. وہ کچھ کچھ فاترالعقل اور سادہ ہے.. بچپن کی منگنی اس کی مرضی سے ہوئی تھی ہم نے اسے مجبور نہیں کیا تھا اور وہ بہت خوش تھی... اب تمہیں ملنے کے بعد اس کے دماغ میں خلل آ گیا ہے..''

وہ سر جھکائے سنتا رہا.. ایک شرمندہ نالی میں رینگنے والا کیڑا تھا.. وہ سنتا رہا..

''وہ پچھلے ہفتے گھر سے بھاگ گئی تھی..''

''بھاگ گئی تھی..''اس نے چونک کر کہا..

''ہاں..''

''کہاں؟''

''وہ ایک ڈری ہوئی خوف کی ماری کبوتری کی مانند تھی..جب اس کے باپ نے اسے چمڑے کی پیٹی سے پیٹا تھا تو ایسی ڈری..وہ بہت چھوٹی ہے..بچی ہے..ایسی ڈری کہ گھر سے نکل کر ہمسائیوں کے گیٹ کو کھول کر لرزتی کانپتی ان کے ہاں چلی گئی کہ مجھے بچا لیجیے..اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ ایسی شکل کی ہے کہ ہمسائیوں میں سے کوئی ایک شخص تھا جو اس کی آرزو رکھتا تھا اور وہ بہت خوش ہوا لیکن وہاں جا کر بھی اس نے بلند آواز سے تمہارا نام پکارا..تو تم دیکھ سکتے ہو کہ وہ سوچنے سمجھنے سے عاری ہو چکی ہے..''عورت نیم تاریک ریستوران میں ایک ایسی سرگوشی میں بولتی رہی جس کے کچھ لفظ سنائی دیتے ہیں لیکن بیشتر کھو جاتے ہیں..

''مجھے معاف کر دیجیے..''اس نے بمشکل کہا..

''میں تمہارے بھلے کی ہی بات کرتی ہوں..''

''میرے بھلے کی؟''

''ہاں..دیکھو وہ ایک جذباتی اور متلون مزاج لڑکی ہے..اتنی کہ پل بھر میں کچھ اور دوسرے پل میں کچھ اور...کہ وہ تمہیں بھی چھوڑ سکتی ہے..''

''نہیں..''

''اگر وہ اپنی پسند کے منگیتر کو چھوڑ سکتی ہے تو تمہیں بھی..تیاگ سکتی ہے..''

''نہیں..''

''ہاں..وہ میری اولاد ہے..میں اسے جانتی ہوں..کہ اس کی طبیعت میں سیمابیت ہے..وہ لمحوں میں بدل جاتی ہے..بچپن میں وہ کسی ایک کھلونے کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی..اس کے بغیر سو نہیں سکتی تھی..اور پھر اگلے روز وہ اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیتی تھی اور پھر کبھی اس کے بارے میں سوچتی بھی نہ تھی..وہ ایسی ہے..''

''جی..''

''تم بھی اس کے لیے ایک اور کھلونا ہو..ایک ذہنی یا جسمانی باڑھ ہو..کسی بھی لمحے وہ اس باڑھ کو پار کر جائے گی..وہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی جائے گی..''

''کسی اور کے ساتھ؟''

''ہاں..''

''نہیں..''

''ہاں..میں اس کی ماں ہوں۔''

''وہ آپ کی بیٹی ہے..آپ اس کے بارے میں اتنے بے رحم الفاظ کیوں استعمال کرتی ہیں؟''

''اس لیے کہ میں اپنی بیٹی کو جانتی ہوں..''

''میرا خیال ہے کہ آپ نہیں جانتی..''

''آپ کا خیال ہے کہ..آپ جانتے ہیں؟''

''ہاں..''

''ایک ماں سے زیادہ جانتے ہیں..جان سکتے ہیں؟''اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو پھر سے دیکھا''مجھے بہر صورت دو بجے کی بس پر سوار ہو کر واپس اپنے شہر پہنچا ہے..لیکن وہ تمہیں بھی چھوڑ دے گی..''

''نہیں..''

''ہاں...یہ ایک وقتی اُبال ہے..اس نے بہر طور اُتر جانا ہے..اس عارضی ہیجان کے لیے تم...آپ..اسے اور ہمیں برباد نہ کریں..میں اپنے بیٹوں اور شوہر کو جانتی ہوں..وہ میری طرح آپ کی منت سماجت کرنے والے نہیں..وہ اپنا مذہب بدل سکتے ہیں..تمہیں قبول نہیں کر سکتے۔''

ریستوران سے باہر آتے ہوئے اس نے ایک بخار آلود شرمندگی میں صرف اتنا کہا

''میں اسے خوش رکھوں گا..وہ میرے ساتھ خوش رہے گی..''

''کیا خوشی اس لائق ہے کہ اس کے لیے اتنی بربادی ہو..اور بربادی ہو گی..''

باہر نیم اندھیرے ریستوران میں سے نکل کر تیز روشنی میں فٹ پاتھ پر جو لوگ چلتے تھے انہوں نے زیر زمین ریستوران سے برآمد ہونے والی اس عورت کے سراپے کی جانب ایک نظر نہ کی جس کے بال رنگے ہوئے تھے اور وہ زندگی میں پہلی بار گھر سے بغیر اطلاع اور بے جواز نکلی تھی..اور نہ اُس شخص کی جانب دیکھا جو سر جھکائے شرمندگی سے کبھی اس کے برابر میں اور کبھی پیچھے چلا آتا تھا..لوگ چلتے گئے..

اور وہ بھی چلتی گئی..

رنگے ہوئے بالوں والی..اس کی شباہت..اس کی کلائی اور اس کی اُنگلیاں رکھنے والی عورت چلتی گئی..دور ہوتی گئی..

ریستوران سے باہر آ کر..اس عورت کو دور جاتے دیکھ کر شرمندگی اور بے بسی نے اسے دوبارہ دبوچ لیا..

ہاتھ پر بندھی پٹی میں سے تازہ خون رِسنے لگا....

جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی..

صرف اسے جس کی آنکھ میں ازل سے تصویریں بھر دی گئی ہوں..ورنہ وہ محض شکلیں تھیں..

سوہنی' سسّی' صاحباں' بدیع الجمال اور ہیر سیال ایسی تو ہرگز نہ ہوں گی جیسی انہیں ہاشم شاہ' حافظ برخوردار' میاں محمد اور وارث شاہ نے دیکھا..انہیں جو شکل نظر آئی محض اس لیے تصویر نظر آئی کہ ان کی آنکھوں میں ازل سے تصویریں بھر دی گئی تھیں..ایک شکل میں حُسن کی مقدار اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ آپ کے آب و گِل کے پیالے میں حُسن سنبھالنے کا ظرف ہوتا ہے..

جانے ان عشق میں تباہ حال شعر جوڑنے والوں نے انہیں کس حال میں دیکھا' اپنی اپنی لیلیٰ کو کیسے مجنوں کی نظر سے دیکھا' تب وہ یوں نظر آئیں ورنہ ان جیسی اور بھی تو بہت تھیں..گجرات' بھنبھور' دانا باد اور کوہ قاف میں کال نہ تھا۔

جانے انہوں نے انہیں کس حال میں دیکھا۔

اس نے بھی اسے ایک ایسے ہی حال میں دیکھا کہ اس کی آنکھ میں بھی ازل سے ایک تصویر بھر دی گئی تھی..یہ کیسا حال تھا؟..حال..موجود سے الگ..یکسر کٹا ہوا ایک مست الست بے اختیار کیفیت کا..جو یکدم ایک سانحے ایک مرگ کی مانند یک لخت آپ کی زندگی کی روانی میں ایک ناقابل عبور اور فنا میں دھکیل دینے والی دراڑ ڈال دیتا ہے..ایک ایسا حال..جو گلے پڑ جاتا ہے..اس سے چھٹکارا ممکن اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ آپ پر..آپ کی من مرضی کے بغیر وارد ہو جاتا ہے اور آپ برنے کے چھتنار درخت سے جھولنے لگتے ہیں..بے اختیاری کی کیفیت میں اس کی بلند ترین شاخوں کو چھونے لگتے ہیں..حال بھی پڑ جاتا ہے..

گاؤں میں سردیوں کی..ٹھنڈک کی منجمد راتیں ایسے اترتی اور پھر ٹھہر جاتی ہیں..ایسے کہ کچی گلیوں کے درمیان بہتی گندی نالیوں کا سیاہ دانے دار کیچڑ بھی جمنے لگتا ہے اور اس میں رینگنے والے وہ کیڑے مکوڑے جو بطخوں کی زرد چونچوں سے بچ جاتے ہیں' سردی سے بے حس ہو جاتے ہیں۔اگلی صبح تک جب دھوپ کی مرتی ہوئی حدّت انہیں پھر سے حرکت دے دیتی ہے..

جولاہوں کی ایک منڈلی ہوتی تھی جو سردیوں کی کسی ایک رات جمتی تھی..گاؤں کے محلّے مختلف ذاتوں میں بٹے خودمختار ریاستوں کی مانند اپنی اپنی زندگی بسر کرتے تھے' بے آواز اور خاموش ہوتے تھے..

دن کے وقت وہ گاؤں کی زندگی کا ایک حصہ بن کر اپنی ثقافت کھو دیتے تھے' لیکن شام ہوتے ہی وہ اپنے اپنے محلّوں میں..اپنے کچے کوٹھوں کے اندر اپنی خصلت اور خواہش میں آزاد ہو کر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک شیخوں کا محلّہ تھا..جہاں دن کے وقت ایک منہ سے جھاگ نکالتا' بے بس اور عقل سے باہر شخص...شخص کیا..ایک نوجوان لڑکا..ہاتھ میں شیشہ پکڑے اپنی کلائیوں کو کریدتا ان میں سے خون نکالتا قہقہے لگاتا تھا..اور محلے کے اندر وہ لوگ رہتے تھے جو سرِشام دبک جاتے تھے..سو جاتے تھے..وہ کاروباری لوگ تھے..بازار میں ان کی..نالے پراندوں کی..شربتوں کی اور کپڑے کی دکانیں تھیں۔دکانیں تو نہیں' چھوٹے چھوٹے کھوکھے تھے جن میں وہ سارا دن چوکڑی مارے بیٹھتے تھے..اور ہاں باجی..جی آپا جی..کالی آندھی خضاب دوں..شلواروں کے لیے رنگین ازار بند دوں..یا ایک سرگوشی سے..بال صفا پوڈر دوں..باجی..

ان شیخوں میں ڈر بہت تھا..دبک جاتے تھے..ڈر جاتے تھے..

اور پھر میراثی ہوتے تھے۔گاؤں میں سب سے دیر سے جاگتے تھے..دھوپ چڑھے جب گاؤں کے سب کوٹھے چارپائیوں سے ویران ہو جاتے تھے اور جب کاشت کرنے والے اور لوہے کوٹنے والے اور حجامت بنانے والے اور چارپائیاں ٹھونکنے والے سب کے سب اپنے کام کاجوں میں جتے ہوتے تھے' تب میراثی سوتے رہتے تھے...ان کا کام چوہدریوں کی باراتوں میں بھگتیں کرنا..ان کے شجرۂ نصب پڑھنا اور ان کی آل اولاد کو دعائیں دینا اور ان کے رشتے کرانا تھا اور وہ ان فرائض سے سبکدوش ہو کر ایک قابلِ رشک نیند میں گم اپنے کوٹھوں پر دھوپ چڑھے سوتے رہتے تھے۔

اور وہ ان زمانوں کو نہیں جانتے تھے جب وہ سٹیج اور ٹیلی ویژن پر ثقافتی نمائندے گردانے جائیں گے..

گاؤں کی منجمد رات کے اترتے ہی نائی' دھوبی' ترکھان' لوہار' ماچھی' جولاہے...بے دم اور بے حال دن بھر کی مشقت کی بدن توڑ تھکاوٹ میں چُورا پنے دیئے کی لو نیچی کر دیتے تھے کہ ان کے پاس رات میں دیکھنے کو کچھ نہ ہوتا تھا..اور کچے دیئے میں ڈلے کڑوے تیل کو پورا مہینہ چلانا ہوتا تھا..

کاشت کاروں اور جاٹوں کے محلّے بھی الگ ہوتے تھے اور وہ بھی سورج غروب ہوتے ہی گہری چپ میں چلے جاتے تھے..اگرچہ وہ چودھری کہلاتے تھے لیکن ان کی مشقت سب سے بدتر تھی جو انہیں جانوروں میں بدل دیتی تھی..منہ اندھیرے اٹھ کر ڈنگروں کے لیے چارہ کاٹنا اسے کترنا..کُھرلیوں میں ڈالنا..پھر ڈنگروں کی کوٹھڑیوں میں بھاپ دیتے گوبر کو ہاتھوں میں سمیٹ کر کچے فرش کو دھونا..اور اس کے بعد کنواں جوتنا..کھیتوں میں ہل چلانا مکمل تاریکی میں..ان کے پاس محض ایک تکبر تھا کہ وہ زمین سے خوراک اگاتے تھے..تو وہ سرِشام بے سُدھ ہو جاتے تھے..

گاؤں کے سب محلّے سرِشام چپ میں چلے جاتے تھے اور ان کے دیئے بجھ جاتے تھے اور گلیوں میں سوائے آوارہ کتوں کے کوئی اور ذی روح حرکت نہیں کرتا تھا' لیکن صرف جولاہوں کے گھر ایسے تھے جہاں چراغ جلتے رہتے تھے اور کھڈیوں کی کھٹ کھٹا کھٹ سردیوں کی راتوں میں ورق کوبوں کی دھم دھما دھم کی مانند ایک مخصوص لَے کے ساتھ ابھرتی گاؤں سے باہر جوہڑ سے پار کھیتوں تک چلی جاتی تھی اور وہ ان میں روپوش ٹڈوں اور مینڈکوں کو بے آرام کر کے انہیں پھدکنے پر اکساتی تھی..پنجاب کے ہر گاؤں کی مانند اس گاؤں میں بھی عموماً نائیوں اور جولاہوں کو پیدائشی طور پر بے وقوف گردانا جاتا تھا..تم بندے ہو یا نائی ہو..کیا جولاہوں ایسی بات کی ہے..یہ روزمرہ کے محاورے میں شامل تھا..اگرچہ نائی فرائڈ سے بہت پہلے انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھانے پر قادر ہو چکے تھے..وہ سارا دن گاؤں کے لوگوں کی کھبّل گھاس ایسی داڑھیاں اپنے کُند استروں سے مونڈھتے تھے' ان کی بغلیں صاف کرتے تھے' ناخن تراشتے تھے اور پھر اسی اُسترے سے اپنے گدھوں کے لیے جاٹوں کی اجازت سے چارا بھی کاٹتے تھے..اپنے آگے سر جھکانے والے ہر شخص کے مزاج اور پیشے کے مطابق مسلسل گفتگو بھی کرتے تھے..ان کے وجود کی اہمیت صرف تین موقعوں پر ظاہر ہوتی تھی..جب شادی بیاہ پر وہ دیگیں پکاتے تھے کہ وہ ماہر باورچی بھی

ہوتے تھے.. یا ان کی گھر والی یعنی نائن کچی عمر میں بیاہ دی جانے والی بچی کے ہمراہ اس کے سسرال جاتی تھی ..اور اسی کی ڈولی میں بیٹھ کر جاتی تھی اور شب عروسی اسی کوٹھڑی میں اکثر موجود رہتی تھی جس میں دولہا دلہن موجود ہوتے تھے اور دولہا کی ناتجربہ کاری پر دھیان دیتی تھی کہ کہیں وہ بچی کو کوئی ضعف نہ پہنچا دے.. بلکہ ان دو ناپختہ ناتجربہ کاروں کو گائیڈ بھی کرتی تھی ..نائی کی حیات میں تیسرا سنہری موقع گاؤں میں کسی بھی بچے کی رسم ختنہ ہوتی تھی ..اس موقع پر وہ سب سے اہم شخصیت ہو جاتا تھا۔ اس کے سامنے چودھری ہوں یا جولاہے سب دبک کر بیٹھتے تھے کہ یہ ان کے بچے اور نسل کے تسلسل کا مسئلہ ہوتا تھا.. نائی کا استرا ذرا ترچھا پڑ جائے تو سب کچھ معدوم ہو جاتا تھا..

بچے کو دو اینٹوں پر بٹھا کر چاچا نائی اسے پچکار کر کہتا کہ پتر اوپر دیکھو ایک چیل گدھا اٹھائے لیے جا رہی ہے اور بچہ اس حیرت کے وقوعے کو دیکھنے کے لیے اوپر دیکھتا تھا.. ذرا سا بے دھیان ہوتا تھا اور نیچے سے اس کا کام تمام ہو جاتا تھا.. یہ گاؤں کے نائی تھے..

نائیوں کے بے وقوف ہونے کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا' البتہ جولاہوں کا معاملہ ذرا الگ ہے..

جولاہے .. ہمہ وقت اپنے تانے پیٹے میں الجھے رہتے تھے .. الگ تھلگ .. گاؤں کے معاشرے سے الگ مگن رہتے تھے .. گاؤں کے دیگر لوگوں سے ان کا رابطہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے تانے پیٹے میں الجھے رہتے تھے .. وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے ایک مخصوص ردھم کے ساتھ دائیں ہاتھ سے سُوت کی چرخی کو .. نال کو .. تنے ہوئے رنگ رنگ دھاگوں کے درمیان پھسلاتے اور پھر صرف ایک دھاگے کو بُنت میں شامل کرنے کے لیے بائیں ہاتھ سے ہتھی کو کھینچتے ... ایک اپنے آپ میں مگن اور تنہا زندگی کرتے تھے .. وہ اپنے آپ اور اپنی کھڈیوں میں اتنے مگن رہتے تھے کہ دیگر انسانوں سے میل نہ کر سکتے تھے .. تنہا اور گم رہتے تھے .. شاید اسی لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ ربط نہ رکھنے کے باعث .. میل نہ کرنے کی وجہ سے ان کی دانش محدود رہتی تھی .. اتنی ہی رہتی تھی جتنی رب نے ان میں بھر دی تھی' اس میں اضافہ نہ ہوتا تھا۔ مکمل تنہائی کے باعث .. دوسرے انسانوں سے مکمل دوری ... معاشرے سے قطعی طور پر کٹے ہوئے ایک کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے .. وہ صرف اپنی ذات میں مگن رہتے تھے..

وہ اسی لیے کم عقل کہلاتے تھے کہ وہ آس پاس سے کٹے ہوئے ہوتے تھے .. چنانچہ

دوسری ذاتیں جب کسی کو بے توقیر کرنا چاہتی تھیں' اسے شرمندہ اور خجل کرنے کے درپے ہوتی تھیں تو یہی طعنہ دیا جاتا تھا کہ تم نے کیا جولاہوں ایسی بات کی ہے .... تو جولاہوں کی تنہائی اور دیگر انسانوں سے کٹ کر ایک مخصوص چال میں چلنے کی خصلت انہیں وہ سادگی اور بھولپن عطا کرتی تھی' جسے بے وقوفی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا.. لیکن زندگی کا یہی چلن انہیں بعض اوقات دیگر ذاتوں سے ممتاز کر دیتا تھا... وہ کھڈی پر الگ اکیلے بیٹھے کوئی کھدر یا کھیس بُنتے اُس نَے میں سر ہلانے لگتے تھے جو سچل سرمست کے سر میں دھومیں مچاتی تھی.. وہ انسانی معاشرے کی آلودگی سے بچ کر سوچ کی ایسی صوفیانہ راہوں پر چل نکلتے تھے' جہاں شاہ حسین اقرار کر رہے ہوتے تھے کہ..

اَنی حسین جولاہا.. نہ اوہ مومن نہ اوہ کافر

جو آہا سو آہا..

اور یوں نسل انسانی جن سوالوں کے جواب تلاش کرتے کرتے دربدر ہوتی تھی' وہ انہیں بُوجھ لیتے تھے .. اور بقیہ ذاتوں سے بلند ہو جاتے تھے .. اس گاؤں کے جولاہوں کی ایک اور خصوصیت بھی تھی' وہ اگرچہ اپنے بنائے ہوئے کھدر کی مانند کورے ہوتے تھے .. لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے لیکن موسیقی کے رسیا تھے .. عارفانہ کلام کے شیدائی تھے .. جب کہ دوسرے لوگوں میں یہ حس مفقود تھی..

ان کے محلے کے درمیان میں ایک وسیع کچا ویہڑہ تھا' جس کے ایک جانب مسجد کی دیوار سے منسلک چھپروں تلے ان کی کھڈیاں تھیں' جن کے تانے پیٹے کچے صحن کے درمیان تک جاتے تھے اور وہیں جہاں تانے پیٹے ختم ہوتے تھے' وہاں گاؤں کا سب سے قد آور اور گھنا برنے کا پیڑ تھا' جس کی چھاؤں پورے صحن کو ڈھانپ لینے کے لیے کافی ہوتی تھی..

یہ حال کا مقام تھا..

برنے کا درخت برابر کی مسجد کے میناروں سے بھی قد میں نکلتا تھا..

یہیں اس کے تلے منڈلی جمتی تھی .. حال پڑتا تھا' حال کھیلا جاتا تھا.. لیکن صرف سردیوں کی گُھپ اندھیر ٹھٹھرتی راتوں میں..

بندوبست جولاہوں کا ہوتا تھا لیکن منڈلی میں سبھی لوگ شامل ہوتے تھے .. کیا جاٹ اور کیا لوہار' ترکھان..

دو لالٹینوں کی روشنی میں .. جو اس وسیع کچے ویہڑے کو جو برنے کے گھنے پن کے

باعث گاؤں کے گلی کوچوں کی نسبت قدرے زیادہ تاریک ہوتا تھا..اس کو تو کیا روشن کرتیں لیکن جولاہوں کے پورے محلے میں صرف یہی دو لالٹینیں تھیں' جو ان دو گھرانوں سے آتی تھیں' جن کے کھیسوں کے نمونے اتنے مختلف اور دل کش ہوتے تھے کہ وہ نزدیکی قصبے کی منڈی میں مناسب قیمت پا جاتے تھے۔ ورنہ کسانوں کی بیٹیوں کو جہیز میں دیئے جانے والے کھیسوں کی نقد ادائیگی نہ ہوتی تھی..فصل کٹنے پر گندم کی صورت ملتی تھی..جس کے پلّے نقد رقم ہوتی تھی' صرف وہی اپنی جمع پونجی کے ساتھ ایک لالٹین خریدنے کی استطاعت رکھتا تھا..ان دو گھروں کے علاوہ دوسرے جولاہوں کے گھروں میں وہی مٹی کے چراغ جلائے جاتے تھے' جو سرِشام جلتے تھے اور روٹی ٹکر کھانے کے فوراً بعد بجھا دیئے جاتے تھے۔

لیکن ان دو لالٹینوں کی روشنی ایسی تھی کہ ویہڑے میں قوالوں کے منتظر ہر چہرے کو.. برنے کے درخت کی گھنی شاخوں اور بلندی کو..مسجد کے میناروں کو روشنی اور سایوں سے ایسی معنویت دیتی تھی کہ ایک بھید بھری ہزار داستان وجود میں آنے لگتی تھی..ایک ایسا اسرار جنم لیتا تھا کہ جس میں سانس لینے والے..قوالوں کے منتظر چہرے کسی اور دنیا کے باشندے دکھائی دینے لگتے تھے..سبھی ایک ہی ذات کے ہو جاتے تھے..

قوالوں کی آمد سے پیشتر کچھ انتظامات کیے جاتے تھے..برنے کے درخت کی سب سے اونچی ڈال کے گلے میں ایک مضبوط رسّہ لٹکایا جاتا تھا..اسے ڈال کے ساتھ باندھ کر اتنا لٹکایا جاتا تھا کہ اس کا سِرا جولاہوں کے سروں کے عین اوپر جھولتا تھا اور وہ اپنے سر پرے پرے کرتے تھے جیسے وہ رسّے کا سِرا نہ ہو ایک ناگ کا پھن ہو..

سب جانتے تھے کہ اس رسّے کا کیا مصرف ہے..

اپنے اپنے کھیسوں میں لپٹے کچی زمین کی ٹھنڈک محسوس کرتے لیکن قطعی بے آرام نہ ہوتے۔ منتظر لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے..اور یہ سب وہی لوگ ہوتے تھے جن کی پاٹ دار آوازیں پورے گاؤں میں سنائی دیتی تھیں..لیکن یہاں وہ دھیمے ہو جاتے تھے' جیسے اونچا بولنے سے بے ادبی ہوتی ہو..

قوال کہیں دور دراز سے آتے..

پہلے موٹی تنوری روٹیوں اور گاڑھے دودھ کے کچے پیالوں سے ان کی تواضع کی جاتی.. وہ ذرا تازہ دم ہو جاتے اور اپنی پٹاریاں کھولنے لگتے جن میں طبلے اور ہارمونیم پوشیدہ ہوتے..وہ

انہیں سر ہلا ہلا کر سُر میں کرتے..اس دوران سب لوگ انہیں نہایت اشتیاق سے تکتے رہتے.. میراثیوں کا اشتیاق سب سے جدا ہوتا تھا اور وہ طبلے کی ہر تھاپ پر سر جھٹک کر کہتے ''واہ جی واہ.. سبحان اللہ میاں صاحب''..جاٹوں کی سمجھ میں یہ ہرگز نہ آتا کہ وہ سبحان اللہ کس بات پر کہہ رہے ہیں..اور وہ ذرا رنجیدہ ہو جاتے کہ ان میراثیوں کو جو کچھ سمجھ میں آ رہا ہے وہ ہمارے پلّے کیوں نہیں پڑ رہا..

طبلے اور ہارمونیم جب سُر میں آ جاتے تو قوال ذرا وقفہ لیتے اور اس وقفہ میں انہیں پھر سے پھاتاں ماچھن کے تنور سے نکلی ہوئی گھنی بناوٹ کی موٹی موٹی روٹیاں اور چودھریوں کے گھروں سے آئے ہوئے کچے دودھ کی چائیاں پیش کی جاتیں جو وہ بنا سانس لیے اپنے شکم میں اتارتے جاتے اور سُر میں آتے جاتے..

جب تواضع کا اخیر ہو جاتا تو انہیں زردہ کھلایا جاتا..

تب وہ مکمل سُر میں آ جاتے..

گاؤں والے اس پوری روٹین سے واقف تھے' اس لیے نہایت صبر سے بیٹھے رہتے..

رات گہری ہونے لگتی..گاؤں کے نواح میں جتنی بھی سرسبز یاں کھیتوں کی پھیلتی تھیں ان پر کُہرا پڑنے لگتا..کُہرے کی سفیدی رات کے گھنے پن میں بھی دکھائی دینے لگتی..لیکن اس کا اثر برنے کے درخت تلے بیٹھے شائقین پر کچھ کم کم ہوتا کہ درخت کے پتے اس کُہرے کو اپنے آپ پر وارد کر کے نیچے بیٹھے لوگوں تک نہ پہنچنے دیتے..

تب قوالی شروع ہو جاتی..

وہ پہلے تو نہایت دھیمے انداز میں گلے کو صاف کرنے کے لیے کچھ مدھم سی تانیں لگاتے جیسے نیند سے بیدار ہو رہے ہوں..طبلے اور ہارمونیم میں خاصی دیر تک ذرا نچلے سروں میں اپنے آپ کو درست کرتے رہتے جیسے کوئی مشق کر رہے ہوں اور پھر ضبط کے بندھنوں کو توڑ کر بے اختیار اور بلند آہنگ ہو جاتے۔

اس بلند آہنگ اور بے اختیاری کے شروع ہوتے ہی میراثی بھی بے اختیار ہو جاتے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر ''واہ جی واہ'' الاپتے کھڑے ہو جاتے..صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ ہماری رات ہے..ہم ہی سمجھنے والے ہیں اور ہمیں کمتر سمجھنے والو' تم نہیں سمجھ رہے اور ہم سمجھ رہے ہیں..

جولاہے نہ بے اختیار ہوتے نہ کھڑے ہو کر داد دیتے کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا' وہ اسے اپنے اندر اتارتے ایک گہرے امن میں چلے جاتے تھے۔ سرد خاموشی میں.. برنے کے پیڑ تلے.. مسجد کے میناروں کے سائے میں وہ سر جھکائے.. جیسے اب بھی اپنی کھڈی پر بیٹھے کھیس بنتے ہوں وہ شانت ہو جاتے تھے..

سرد خاموشی میں.. قوالوں کے گلے کا زور گاؤں کے ہر کواڑ پر دستک دیتا چلا جاتا..

ان کی صدا گاؤں کے باہر جن سرسبز یوں پر کُہرے کی سفید تہہ جم چکی تھی' اس کی برفیلی سفیدی کے ایک ایک ذرّے تک پہنچتی تھی۔

لیکن اب کسان ذرا بے آرامی اور تشویش میں مبتلا ہوتے تھے کہ انہوں نے تھوڑی دیر بعد ڈنگروں کو چارہ ڈالنا تھا اور ہل جوتنا تھا.. وہ نہیں جانتے تھے کہ جن بالکوں کو وہ کچی کوٹھڑیوں میں سوتا چھوڑ آئے ہیں' وہ بھی جہاں جہاں دو لالٹینوں کی روشنی اور سائے کا کھیل تھا' وہاں سائے میں روپوش بیٹھے قوالوں کو سن رہے تھے اور برنے کی ڈال سے لٹکتے رسّے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے..

کُہرے کی سرد سفیدی نامعلوم انداز میں برنے کے پتوں میں سے نیچے بیٹھے لوگوں کو گرتی محسوس ہوتی تھی.. لیکن کوئی بھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا.. سردی اتنی بڑھ جاتی کہ مسجد کے سفید مینار بھی برف لگنے لگتے..

کہیں نصف شب کے لگ بھگ نورے ماچھی یا دینے تیلی کو حال پڑ جاتا.. ابھی وہ آلتی پالتی مارے اطمینان سے بیٹھا ہوتا اور ابھی وہ منہ کے بل جا گرتا اور اوندھا ہو کر تڑپنے لگتا۔ اس مچھلی کی مانند جو جوہڑ کے کیچڑ میں پھنس جاتی ہے.. جولاہے جیسے اس وقوعے کے منتظر ہوتے.. وہ چنداں متعجب نہ ہوتے اور بڑے اطمینان سے اٹھ کر نورے ماچھی یا دینے تیلی کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھا لیتے اور پھر اس کے دونوں پاؤں رسّے سے جکڑ کر اُلٹا لٹکا دیتے.. وہ بظاہر بے خبر اور مدہوش ہوتا..

قوال مزید جوش میں آ جاتے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر جانے کس کا اور کون سا عارفانہ کلام الاپتے رہتے.. گاؤں کے لوگوں میں کوئی اکا دکا ہی پڑھا لکھا ہوتا ہوگا اور وہ بھی کہیں شہر میں ہوگا' اس لیے انہیں اس عارفانہ کلام کی زیادہ سمجھ بوجھ نہ تھی.. بس کہیں کہیں انہیں کوئی ایک آدھ مصرعہ سمجھ میں آ جاتا تو وہ اس کے نشے میں دیر تک سر ہلاتے رہتے..

نورے ماچھی یا دینے تیلی کا بھی یہی حال تھا.. جونہی کوئی ایک مصرعہ مکمل طور پر ان کی سمجھ میں آتا تو ان پر حال پڑ جاتا.. عام طور پر وہ ؎ میں نا ہیں سب توں.. پر یکدم تڑپنے لگتے اور ان کے تشنج سے کھنچے ہوئے لبوں میں سے.. سب توں.. سب توں.. کی بڑبڑاہٹ جاری رہتی..

برنے سے لٹکتے رسّے میں بندھا وہ شخص مسلسل تڑپتا رہتا' جیسے کسی کُنڈی میں پھنسی مچھلی تڑپتی ہے.. کبھی وہ کسی کینچوے کی مانند اپنے بدن کو سمیٹتا اور کبھی اسے ڈھیلا چھوڑ کر بے جان سا ہو کر لٹکنے لگتا..

قوال اپنی لے تیز تر کرتے جاتے.. طبلے والے کی ناک طبلے کے اوپر جھکتی ہوئی اس پر چلتی انگلیوں کی تھرتھراہٹ سے الجھنے لگتی اور ہارمونیم پر قوالوں کے بال بکھرنے لگتے.. وہ سب کے سب اتنے مگن اور مست ہو جاتے۔

تب جولاہے اسے آہستہ آہستہ جُھلانے لگتے.. جیسے جُھولنا جھلاتے ہیں.. رسّے سے بندھا شخص اس حال سے جدا ہو کر کسی اور حال میں جا چکا ہوتا اور بڑے مزے سے جولاہوں کے دھکیلنے سے آہستہ آہستہ جھولنے لگتا.. یہ نہیں کہ وہ شانت ہو جائے.. وہ اب بھی ماہیٔ بے آب کی مانند پھڑکتا اور تڑپتا تھا.. اور دو جولاہے اپنا پورا زور لگا کر اس انسانی جُھولے کو اتنا جُھلاتے... اتنا جُھلاتے کہ وہ فاترالعقل لگنے لگتے جیسے وہ جو رسّے کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور وہ جو اسے دھکیلتے جُھولنا جھلاتے ہیں تینوں یک بدن ہوں۔

دھکیلنے جُھلانے والوں میں بھی وہی خود فراموشی عود کر آتی جو رسّے کے ساتھ بندھے شخص کو مدہوش اور ماورا کرتی تھی.. اور پھر ایسا بھی ہوتا جو کسی بھی تنومند اور بھرے بدن کی گُجری کے بس میں بھی نہ ہوتا.. اونچی اور لمبی ٹالیوں میں جھلارے لیتی گُجری کی پینگ کبھی بھی ان بلندیوں کو نہ چھو سکتی تھی جس بلندی پر حال میں آیا ہوا شخص پہنچ جاتا.. وہ اس ڈال سے بھی اوپر نکل جاتا جس کے ساتھ رسّہ باندھا ہوتا تھا اور اگر وہ اس لمحے ذی ہوش ہوتا تو یقیناً آسمان سے گرتے سفید کُہرے کو اپنے چہرے پر گرتے محسوس کر لیتا..

جب کبھی وہ برنے کی شاخوں سے اوپر نکل کر پتّوں کو جا چھوتا تو لمحہ بھر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور نیچے بیٹھے لوگ دم روکے منتظر ہوتے اور تشویش میں مبتلا ہوتے کہ کہیں وہ اُدھر ہی نہ رہ جائے.. کیا پتہ واپس نہ آئے اور پھر اُسی لمحے اس کا پھڑکتا وجود نیچے آتا اور دونوں جولاہے اسے پھر سے دو چار قدم بھاگتے دھکیل دیتے۔

پھر وہ لمحہ آتا جب اسے دھکیلنے کی ضرورت باقی نہ رہتی..

جولاہے آگے ہوتے اسے زور لگا کر جھلانے کے لیے اور وہ اپنی ٹانگیں سمیٹتا ایک اضطرابی اور سیمابی کیفیت میں خود ہی زور لگانے لگتا اور اس میں بہترین نسل کے دس بیلوں کا زور جانے کہاں سے آ جاتا..اور وہ مدہوش بدمست جولاہوں کے دھکیلنے سے بے نیاز ہو جاتا..

دونوں جولاہے پیچھے ہو کر وہیں جا بیٹھتے جہاں سے وہ اٹھے تھے..وہ جان جاتے تھے کہ اسے اب ان کی مدد کی ضرورت نہیں رہی..

رسّے کے ساتھ الٹا بندھا نُورا یا دینا ٹانگیں سمیٹتا بے خود حالت میں..اتنے زور میں جو شاید دس نسلی بیلوں میں بھی نہ ہوتا تھا..اپنے زور سے برنے کی بلند ترین شاخوں تک جاتا تھا..

وہ جو ایک بالک تھا..اپنے کسان باپ کے سامنے جھوٹ موٹ سو گیا تھا' اب چوری چھپے سائے میں بیٹھا سردی میں ٹھٹھرتا اس حیرت ناک عمل کو منہ کھولے دیکھ رہا تھا..

سب کی توجہ کا مرکز نُورا یا دینا تھا..کوئی بھی قوالوں کو نہیں سن رہا تھا..اور قوال بھی اس بے توجہی سے واقف تھے اور ان کی نظریں بس برنے کے رسّے سے الٹے بندھے ٹانگیں سمیٹتے پھڑ پھڑاتے شخص پر تھیں اور وہ بھی حیرت میں تھے کہ ہم نے کیا الاپ دیا ہے جو اس ان پڑھ شخص پر یہ اثر ہوا ہے کہ اس میں دس بیلوں کا زور آ گیا ہے اور وہ اس زور کے بل بوتے پر تن تنہا زور لگاتا برنے کی بلند ترین شاخوں میں جا روپوش ہوتا ہے۔

وہ جو منہ کھولے چوری چھپے سائے میں اپنے آپ کو روپوش کرتا اس حیرت ناک عمل کو منہ کھولے دیکھ رہا تھا...وہ تب..ایک بالک کے طور پر..اُن گئے گزرے زمانوں میں یہ قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ کسی ذی ہوش کے لیے..کسی بھی عام شخص کے لیے ایسا ہو جانا بھی ممکن ہے کہ وہ نورے اور دینے کی مانند پھڑکتا تڑپتا لگے..ایسے کہ دو جولاہے اسے ایک جھولے کی مانند جھلانے لگیں اور وہ بے خبر رہے..تڑپتا پھڑکتا رہے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آ جائے کہ بے خودی کے بے عقل اور بے شعور زور میں وہ اس عالم مستی میں ایسا خود کفیل ہو کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت باقی نہ رہے اور وہ جذب کی ایسی کیفیت میں چلا جائے کہ خود ہی اپنے بدن کی بے اختیاری کا جُھولنا جھلاتے برنے کی بلند ترین شاخوں سے بھی آگے نکل کر آسمان کو اپنی نظر سے دیکھنے لگے..

وہ یہ قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا..نہ..

....کہ ایسے زمانے بھی آنے کو ہیں جب ایک شکل کی گرفت میں آ کر وہ بھی ایک ایسے

ہی رسّے سے بندھا ہو گا اور حال کھیلتا ہو گا..بے خود اور بے پروا ہو گا..

اس کے گمان میں بھی نہ تھا..

گئی رات..جب قوالوں کے گلے بیٹھ جاتے..سردی برداشت سے باہر ہو جاتی' حال کھیلنے والے شخص کا بدن ڈھیلا پڑ کر رسّے سے لٹکنے لگتا تو وہی دونوں جولاہے اٹھ کر اس کے پاؤں سے بندھے رسّے کو کھول دیتے تھے اور وہ جولاہوں کے ویہڑے کے کچے اور سرد فرش پر ایک لاش کی مانند دھپ سے بے جان گر جاتا تھا اور اگلی سویر تک وہیں بے سُدھ پڑا رہتا تھا۔

سویر ہوتی..برنے کی شاخوں میں سے دھوپ کے زرد ذرّے اس کے بے سُدھ بدن پر اترتے تو وہ یوں اطمینان سے اٹھ بیٹھتا جیسے وہ ہر سویرا اٹھتا تھا..کسی بھی یادداشت کے بغیر..وہ اگر قدرے فکر مند ہوتا تو صرف اس لیے کہ آج میرے بدن میں یہ اکڑاؤ ہے' نسیں اور پٹھے تنے ہوئے اور تھکے کیوں ہوں..پھر وہ ایک کمی کمین کی مانند جسے سوچنے کا اختیار نہیں تھا' چپ چاپ اٹھ کر اپنے کام کاج کی جانب چلا جاتا۔ نہ کوئی اس سے دریافت کرتا کہ پچھلی رات تم پر کیا بیتی..اور اگر کوئی پوچھتا بھی تو وہ نہیں جانتا تھا کہ اس پر کیا بیتی تھی..پچھلی شب اس پر کیا گزری تھی...جو گزری سو گزری ہم پر شب ہجراں..

بس یہی حال تھا جو اسے پڑ گیا..ایک دیا سلائی کے جلتے ہی..

اندھیری سیڑھیوں میں ایک شکل کے مڑ کر دیکھنے سے..

لیکن بہت زمانوں کے بعد..

جانے تو نے اسے کس حال میں دیکھا..

بس اسی حال کا بیان تھا۔

تو محمد علی ڈاکیا اس کے لیے ایک خط لے کر آتا ہے جو حال میں ہو..جس پر حال پڑتا ہو..

وہ بے شک برنے کی بلند ترین شاخوں تک جھول جاتا ہو لیکن یہ ڈاکیا اس تک وہ خط پہنچا دیتا ہے۔

یہ طے نہیں کہ اس جُھولے میں کون جُھولتا ہے..کوئی سوہنی یا نتالیہ..

وہ سب ایک ہیں۔

ڈاکیا یہاں بھی پہنچ گیا تھا..

ایک خط کے ساتھ..

اسے کھول کر دیکھنا ہے کہ یہ کس نے تحریر کیا ہے' کس کے نام لکھا ہے.. برنے کی بلند ترین شاخوں کو ایک شاہ گوری کی ناک بھی چھوتی تھی.. کیا یہ خط اس نے لکھا ہے؟

اندھیری سیڑھیوں میں باون سیڑھیوں میں سے کسی ایک سیڑھی کے اوپر جو تاریک خلا ہے' اس میں یکدم دیا سلائی بھڑکنے کے.. فوراً بعد چمڑے کی بیلٹ اور شکاری کی بندوق نہیں آ جاتی.. ان کے درمیان کچھ اور پڑاؤ بھی ہیں جن کے نتیجے میں بقیہ اکیاون دیا سلائیاں بھی بھڑک اٹھی تھیں۔

حافظ ابرخوردار نے عشق کے جس ہاتھی کو بیان کیا ہے' وہ یکدم تو مست نہیں ہو جاتا.. ایک دیا سلائی کے بھڑکنے سے تو وہ محض ٹھٹکتا ہے کہ یہ کیا ہوا ہے اور پھر دھیرے دھیرے وہ اپنے وجود سے اپنی ذات سے بے پروا ہونے لگتا ہے.. پاگل ہوتا ہے اور پھر یوں بے قابو ہو جاتا ہے کہ ہر سو شور مچ جاتا ہے کہ..

پوش پوش... ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔

ان کے درمیان کچھ اور پڑاؤ بھی ہیں۔

سرما کے کُہرے کی ماری ہوئی خشک گھاس سرسراتی ہوئی ایک میدان کی صورت محض پس منظر کا کام دیتی ہے۔ ایک عشق سے دمکتے دنیا سے ڈرے ہوئے چہرے کے لیے.. گھاس اتنی خشک ہے کہ لاپروائی سے پھینکے جانے والے ایک سگریٹ کے لمس سے ہی سلگ اٹھتی ہے اور سلگاہٹ آگ میں بدل کر یوں پھیلتی ہے کہ ہر جانب دھواں ہی دھواں اٹھتا ہے مگر وہ دمکتا چہرہ صاف دکھائی دیتا رہتا ہے..

کبھی وہ اپنے ساتھ بارش لے آتی ہے.. صحن کی بیلوں پر جو بوندیں تیرتی ہیں گویا اس کے رخساروں پر پڑتی ہیں اور وہ انہیں پونچھتی ہوئی اپنے زرد پیراہن میں اپنی سانسیں درست کرتی ہے.. زرد پیراہن پر جہاں جہاں بارش کی بوندیں پڑ رہی ہیں' وہاں وہاں ایک سُنہرا پن ہے جو اس

کے بدن کا ہے..

چمڑے کی بیلٹ اور شکاری کی بندوق تب آتی ہے' جب صحن اور جنسی کشش بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور آگے ایک آگ کا دریا ہے جس کے پار ڈوب کے جانا ہے..

ایک ایسا صحرا ہے جس کے غزال ہی جانتے ہیں کہ دیوانے پہ کیا گزری اور جن اونٹوں والوں نے اسے پار لے کر جانا تھا' وہ کب کے کوچ کر چکے تھے ..ایک کچا گھڑا ہے جس نے ہر صورت چناب کے پانیوں میں گھل جانا ہے اور اسے پار نہیں لے جانا..اور اس کے باوجود یہ آگ مزید بھڑکتی ہے زرتشت کی مقدس آگ اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اور کسی چمڑے کی بیلٹ یا شکاری کی بندوق سے نہیں بجھتی..

انسان اگرچہ ایک جانور ہے لیکن اسے سچ مچ کا جانور بنتے دیر نہیں لگتی..انسانی رشتوں کی بے حسی اسے بالآخر ایسا بنا دیتی ہے..وہ بھونکتا نہیں لیکن ایک سگ کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے..وہ کلبلاتا نہیں لیکن گندی نالی میں رینگتے کیڑے کی مانند ہوا جاتا ہے..اسے تھوڑی سی الفت اور توجہ سے ایک شاہی سنگھاسن پر بٹھایا جا سکتا تھا' لیکن بے حسی اور بے مہر بے توجہی سے وہ ایک دھتکارا ہوا کتا..گندی نالی میں رینگنے والا کیڑا ہو جاتا ہے..اگر وہ طیش میں آ جائے تو قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اگر اس میں بزدلی ہے تو اپنے آپ کو مار دینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے..لیکن مکمل سنجیدگی سے نہیں کہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ محض اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہے..معاشرے کو سندیسہ دینا چاہتا ہے کہ میں ناخوش ہوں کچھ توجہ تھوڑی سی مسرت کا طلب گار ہوں وہ کہیں سے بھی مل جائے کیونکہ مجھے ایک کتے ایک کیڑے کی زندگی اچھی نہیں لگتی..

لیکن شاید ایسا ہے کہ وہ ایک برا اداکار تھا' اس کا چہرہ اس کی ناخوشی کا اظہار کرنے سے قاصر تھا' اس لیے معاشرے تک اس کا سندیسہ پہنچتا نہیں تھا بلکہ اسے ایک تماشا سمجھ کر پھبتیاں کسی جاتی تھی اور تب وہ سچ مچ اپنے آپ کو سانسوں کی ردھم سے آزاد کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگتا تھا تو انہی بے بس اور بے چارگی کے دنوں میں اندھیری سیڑھیوں میں ایک دیا سلائی بھڑک کر اور اس کی روشنی میں مڑنے والا چہرہ اس سے کلام کرتا ہے..کوہ طور کی آگ کی روشنی اور آہورہ مزدہ کے احکامات کے تابع جلتی ہوئی آگ کی روشنی..اس دیا سلائی کی روشنی کے سامنے مدھم پڑ جاتی ہیں اور چہرہ کلام کرتا ہے کہ..تم جانور نہیں انسان ہو..اور میں رب ہوں جو انسان بنانے پر قادر ہے..میں ہوں تو تم ہو!

پھر ایسا کیا ہوا کہ مردہ شاعرہ کا شعر ایک اختتامی کاغذ پر منتقل ہوا جو کہ آخری خط کہلایا۔

یقیناً بزدلی بے بسی اور اس بندوق کے سامنے کچی کونپل کی مانند ڈر سے تھرتھراتی لڑکی کی فنا کا خوف..جس کا وجود اسے انسان بنائے رکھنے پر قادر تھا..اگر وہ وجود ہی نہ رہے..ہلاک کر دیا جائے تو وہ ارتقاء کی تمام تر سیڑھیوں سے گرتا ہوا پھر وہیں جا گرتا تھا جہاں ایک گندی نالی تھی' اور وہ پھر سے ایک کیڑے میں بدل سکتا تھا..یہ محض اس وجود کی فنا کا ڈر تھا..جس صحن کی بیلیں دیوار سے اکھڑ کر لٹک گئی تھیں' سرخ اینٹوں کے فرش پر ادھ موئی ہو کر گر گئی تھیں' اس صحن میں رہنے والوں کے ..اس وجود کے عزیزوں کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ وہ نہیں ہوگا جو وہ چاہتی ہے اور اگر وہ ڈھیٹ بنی رہتی ہے تو اس کی زندگی کی ڈوری کو کاٹ دیا جائے تاکہ وہ خلاؤں میں کھو جائے۔ اس تک یہی اطلاع پہنچائی گئی..یہ دھمکی بھی ہو سکتی تھی اسے بلیک میل کرنے کے لیے..بیک آؤٹ کروانے کے لیے..لیکن یہ حقیقت بھی ہو سکتی تھی اور اس کا امکان زیادہ تھا..بس یہی بزدلی اور بے بسی تھی جس کے باعث ..اس کے وجود کے سانسوں کی تاریں بے حسی اور خاندانی وقار کی قینچی سے کھٹ کھٹ کترے جانے کے امکان کے خوف سے وہ بیک آؤٹ کر گیا..تاکہ وہ زندہ رہ سکے..

اور اس کے ردعمل میں اس کی جانب سے مردہ شاعرہ کا وہ شعر اس تک پہنچا..ایک زہر بجھے تیر کی مانند..اسے مجرم گردانتا..اس پر لعنت بھیجتا..ایک شعر..

یہیں سے اس کی کوہ نوردی کا آغاز ہوا تھا..کہ وہ اس شعر کے زہر سے اپنے مجرم ہونے کے احساس سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا..دشت نوردی اس نے اس لیے اختیار نہ کی کہ آس پاس اتنا بڑا دشت نہ تھا جس میں ایسا بڑا زہر اور جرم دفن کیا جا سکتا..شہروں اور بستیوں میں انسان کے مخصوص پتے ہوتے ہیں۔ مکان نمبر اور گلی نمبر ہوتے ہیں جب کہ کہیں بلند پہاڑوں میں کچھ بھی نہیں ہوتا' سوائے پتھروں اور برف کے..کوئی پتہ نہیں ہوتا...اگر ہوتا تو وہاں کے ہر پتھر..ہر بوٹے اور برف کے ہر ذرّے کے نام ڈھیروں خط پوسٹ کر دیئے جاتے..اور وہ سب کے سب ظاہر ہو جاتے..ان کی بے بسی اور جرم بھی عیاں ہو جاتے..وہ معصوم تھے' صرف اس لیے کہ ان کا کوئی مستقل پتہ نہ تھا..

وہ کوہ نورد ہوا تو انہی پتھروں' بوٹوں اور ندیوں کا ایک حصہ بن کر بے نام اور بے پتہ

ہوا..مردہ شاعرہ کے شعر سے فرار ہو گیا..گمنام ہو گیا تا کہ اسے کوئی بھی خط نہ لکھے..کوئی نہ پہچانے اور دشنام نہ دے کہ تم ہی بزدل تھے..لیکن یہاں بھی..کہیں بلند پہاڑوں میں وہ پکڑا گیا..پہچان لیا گیا کہ یہ وہی ہے..

اسی لیے وادیٔ شگر سے پرے..سورجوں سے حاملہ پیڑ سے کہیں آگے..ایک ندی کے جھاگ اڑاتے تند پانیوں کے پار وہ چلا آتا تھا..

اپنے بدخشانی گھوڑے کی پُشت سہلاتے..تھپکتا..چلا آتا تھا..اس کو نظر میں رکھتا جو فرار ہو کر ان پہاڑوں میں روپوش ہو جانا چاہتا تھا' اسے نظر میں رکھتا چلا آتا تھا کہ محمد علی ڈاکیے کے چرمی تھیلے میں شاید اور کچھ بھی نہ تھا صرف ایک خط تھا۔

ڈاکیا صرف ایک خط پہنچانے کے لیے اس کی جانب چلا آتا تھا..

اور اگر اس کے نام کا کوئی خط تھا تو پھر اسی کا ہو سکتا تھا...

اتنے طویل برسوں کے بعد..اسی کا ہو سکتا تھا..

اگر اس کا نہیں تو پھر کس کا ہو سکتا تھا..

کسی کا بھی نہیں!

صرف اس کا جس کے صحن کی بیلیں دیوار سے اکھڑ گئی تھیں..

بزدلی' نامردی سے بڑھ کر شرمناک ہوتی ہے..ایک مرد کے لیے!

اور یہ بزدل..بکری کا دل حیرت انگیز طور پر اس کے..جو دیا سلائی کے بھڑکنے سے پلٹی تھی' اس کے بدن میں نہیں تھا..جس نے دیا سلائی بھڑکائی تھی' اس کے اندر تھا..

بے شک لاکھ جواز ہوں کہ وہ اس کی جان کے ڈر سے پیچھے ہٹا تھا' لیکن پھر بھی یہ بزدلی تھی' جو نامردی سے بڑھ کر شرمناک ہوتی ہے..مرد اوّل تو عشق کے ہاتھی تلے مکمل طور پر روندا نہیں جاتا اور اگر ایسا ہو جائے تو بھی اپنے حواس میں رہتا ہے اور جواز تلاش کرتا ہے جو اس لمحے جب وہ پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کرتا ہے اگرچہ مکمل سچائی کے سوا کچھ نہیں ہوتے لیکن وقت کے گزرنے سے جو شدید اندوہ لپیٹ میں لے لیتا ہے جو پچھتاوا جنم لیتا ہے وہ اسے مطعون کرتا رہتا ہے کہ یہ محض بزدلی تھی' اگر جان جانے کا خدشہ تھا تو ملاپ کا بھی بے شک موہوم سہی امکان تو تھا اور تو نے اس امکان کو گنوا دیا..اسے چنداں ملال نہ ہوتا اگر وہ تمہارے لیے جان سے چلی جاتی..مگر اب عمر بھر کا ملال ہے..رنجیدگی اور شکایت ہے..

سڑک پار کرنے کے لیے زیبرا کراسنگ کی سفید دھاریاں تھیں..

جو اُن کے قدموں تلے آئیں اور ابھی دیا سلائی کے بھڑکنے کے بعد چند روز ہی گزرے تھے..

انہوں نے ایک دوسرے کو چھوا تک نہیں تھا۔

اگر ایک بندوق کلام کر سکتی ہے..چمڑے کی ایک بیلٹ بول سکتی ہے تو وہ سفید دھاریاں بھی زبان رکھ سکتی تھیں' جن پر سڑک عبور کرتے ہوئے وہ شانہ بشانہ چلے تھے تو ان دھاریوں میں سے ایک نے تو ضرور دیکھا ہو گا کہ ان دونوں کے ہاتھ شعوری طور پر یا اتفاقاً ایک دوسرے

سے چھوتے ہوئے آپس میں جڑ گئے تھے اور یہ قضیہ بہت دیر تک چلا کہ پہل کس نے کی تھی..
دونوں میں سے کوئی ایک بھی ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ اس کا ہاتھ تھا' جس نے دوسرے کے ہاتھ کی خواہش کی تھی..

زیبرا کراسنگ کی وہ ایک دھاری گواہی دے سکتی تھی لیکن وہ تو کب کی ٹائروں اور جوتوں کی رگڑ کی زد میں آ آ کر معدوم ہو چکی تھی اور اس پر تازہ پینٹ متعدد بار ہو چکا تھا' جس کے نیچے وہ دفن ہو چکی تھی اور دفن ہو چکی' بے شک ایک دھاری ہو وہ گواہی نہیں دے سکتی..

ویسے اور بہت کچھ بول سکتا تھا..

وہ رکشا بھی بول سکتا تھا جس کا دروازہ کھٹ سے بند ہوا.. وہ تو اسے کھلا رکھنا چاہتی تھی اسے ایک نظر دیکھنے کی خاطر لیکن اس کے سپرنگ اس کے بس میں نہ تھے اور وہ کھٹ سے بند ہو گیا.. بند ہوا تو اس کی سفید شال کا ایک حصہ باہر رہ گیا اور جب وہ رکشا دور ہوتا گیا تو بھری پُری ٹریفک کے ہجوم اور شور میں سفید شال کا وہ حصہ جدائی کے ایک پرچم کی مانند دور تک پھڑ پھڑاتا دکھائی دیا..

زیبرا کراسنگ کی وہ سفید دھاری نہ سہی اُس مکان کی کوئی نہ کوئی اینٹ تو موجود تھی جو گواہی دے سکتی تھی کہ اس نے اپنے ڈھکے ہوئے سر کو مزید ڈھک کر اس استفسار پر کہ یہ ممکنات میں سے ہے کہ ''دو بول'' پڑھ لیے جائیں.. اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا..

وہ جس آہنی کرسی پر آ بیٹھی تھی.. پہلی بار اپنا مکھ دکھلاتی تھی اس کی سخت نشست اس کی پیٹھ کے بھار سے آہنی ہونے کے باوجود دب گئی تھی.. اس کی پشت اس پر ایسے ثبت ہو گئی تھی جیسے گورودوارہ پنجہ صاحب کے ایک پتھر پر گورونانک کا ہاتھ..

جان چلی جانے.. اس کی جان جانے کے ڈر سے جب وہ پسپا ہوا تو اس کے بعد جواب میں مردہ شاعرہ کا شعر آیا..

اور اس کے بعد..

شہر کی ایک پرہجوم شاہراہ کے فٹ پاتھ پر.. کئی ماہ کے بعد.. وہ اچانک اُسے نظر آ گئی..

اس کی چال اب بھی شاہانہ اور زرد شہزادیوں کی طرح بلند اور پروقار تھی لیکن یہ ایک مصری ممی کی مانند مردہ اور بے روح تھی.. وہ اپنے لواحقین کی جلو میں اپنی شادی کے لیے مناسب لباس کے انتخاب کرنے کے لیے نکلی تھی... وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے بدن کے گرد سفید سوتی پٹیاں

ہیں جنہوں نے اسے حنوط کر رکھا ہے اور یہ پٹیاں اس کی پسپائی کے سُوت سے بُنی ہوئی تھیں..

وہ ایسا جولاہا تھا جو اس کے لیے شادی کا لباس تیار نہ کر سکا اور اپنی بزدلی کی کھڈی پر اسے ہمیشہ کے لیے حنوط کرنے کے لیے یہ سوتی پٹیاں بُنتا رہا..

اسے یقین تھا کہ اس نے شاید ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی تھی.. اس کی آنکھوں میں کچھ شرارے اسے پہچان کر بھڑکے تھے اور پھر اس نے کچھ ضبط کیا.. اس کی.. بقول اس کے.. پسپائی کو یاد کیا.. بزدلی اور نامردی کو یاد کیا اور پھر ایک اجنبی کی مانند چلتی گئی..

اس اچٹتی ہوئی نظر میں بزدلی کے طعنے کا وہ تیر تھا جو نامردی سے بڑھ کر شرمناک ہوتا ہے.. اور یہ تیر اس کے بدن میں ایسے پیوست ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ تھا وہ باہر آنے کے لیے بے اختیار ہوا اور وہ ایک مرتے ہوئے شخص کی مانند منہ کھول کر غاں غاں کرتا دوہرا ہوا اور فٹ پاتھ پر قے کرنے لگا..

آیندہ زمانوں میں.. برسوں بعد.. بیس پچیس برسوں بعد بھی وہ جب کبھی ادھر سے گزرا.. سفید بالوں اور جُھریوں سے بھرے چہرے کے ساتھ تو بھی فٹ پاتھ کے اس حصے سے نظر چرا کر گزرا.. جہاں اب تک نشان باقی تھے.. اس کی قے اور بزدلی کے نشان باقی تھے...

تو وہ خط کس کا ہوسکتا تھا..

اگر وہ محض ایک ڈاکیا ہی تھا..

کوئی اور نہ تھا..

کچھ اور نہ تھا..

وہ خط کس کا ہوسکتا تھا؟

شاید مردہ شاعر کا..

اب یہ سوال میں نہیں ''وہ'' پوچھ رہا ہے کہ میں نے اسے یعنی اپنے آپ کو اپنے ہی مقابل کھڑا کرلیا ہے تاکہ ''وہ'' مجھ سے سوال پوچھے اور میں جواب دینے کی سعی کروں کہ میں اپنے آپ سے کب تک باتیں کرسکتا ہوں' اس لیے ''وہ'' میری مجبوری ہے.. چنانچہ میں فرض کر لیتا ہوں کہ یہ خط اس کے نام کا تھا لیکن اسے وصول میں نے کیا تھا۔

تو بس وہی یہ پوچھ رہا ہے کہ یہ خط کس کا ہوسکتا تھا؟

بھئی یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ تم ساری حیات اس خط کی خواہش میں ہی سرگرداں رہے.. دربدر ہوتے بھٹکتے رہے.. اس کی تلاش میں نکلے.. تم نے آوارگی کا بہانہ کیا' آشفتہ سری کو ڈھال کیا.. صحرانوردی میں پناہ لی.. پتھروں سے کلام کیا.. تاکہ تمہارا بھید ظاہر نہ ہو جائے.. اور بھید یہی تھا کہ تم اس خط کے منتظر تھے جو کہیں نہ کہیں آ جانا تھا.. اندلس میں.. ارض روم میں.. بلیک فارسٹ میں.. جھیل جنیوا کے کناروں پر یا شاہ گوری کی برفیلی قربت میں کہیں بھی آ جانا تھا.. پتھروں سے بھی تم نے یہی پوچھا کہ میرے نام کا کوئی خط ہے..

اور خط تھے..

لیکن تمہارے نام کے نہیں تھے..

بہت بار ایسا ہوا کہ کوئی خط ملا جو تمہارا نہیں تھا لیکن تم نے وصول کرلیا.. اور وہ کسی اور کے نام کا تھا.. تم اس ''کسی اور'' کو بھی جانتے تھے' اس لیے تم نے اسے کھولا نہیں بلکہ ری ڈائریکٹ کر دیا..

پھر کوئی ایک خط ایسا بھی تھا.. تم جانتے تھے.. یقین رکھتے تھے لیکن ثابت نہیں کر سکتے تھے.. جو لکھا تو گیا تھا آبِ حیات کے پانیوں سے.. ان مِٹ.. نصیب کے پُورنوں کے ساتھ لیکن وہ پوسٹ نہ ہوا.. اسی لیے تم تک نہ پہنچا.. اور یہ یقین کہاں سے آیا کہ خط تمہارے نام کسی نہ کسی نے کہیں نہ کہیں لکھا لیکن کوئی نہ کوئی مجبوری تھی ایسی کہ وہ پوسٹ نہ کیا جا سکا.. کسی نے خبر کی؟ سرگوشی کی تمہارے کان میں؟ کسی وہم میں آیا.. کسی خیال میں کوئی دستک ہوئی اور تم جان گئے کہ ایک خط لکھا جا چکا ہے۔ ایک تحریر کورے کاغذ پر منتقل ہو چکی جو تمہارے لیے ہے.. اور اسے پوسٹ نہ کیا جا سکا..

دنیا کے ہر حصے میں تم اس خط کے منتظر رہے جو نہ آنا تھا نہ آیا کہ اسے پوسٹ ہی نہیں کیا گیا تھا..

لیکن ایک خط تو بہرطور پوسٹ ہو چکا تھا.. آبِ حیات سے نصیب کے پُورنوں کا ان مِٹ خط.. جس کے لیے تم سرگرداں تھے..

ایک عام خط تو دو چار دن میں مل جاتا ہے.. تو اس ایک خط نے وادیٔ شگر سے پرے بدخشانی گھوڑے پر سوار ڈاکیے کے چرمی تھیلے میں پہنچنے کے لیے اتنے ڈھیر سارے برس کیوں لگا دیئے.. جب کہ تمہارے سر کے علاوہ بدن کے دیگر حصوں کے بال بھی سفید اور مرجھا چکے تھے.. تمہارا ماس ڈھلک گیا تھا.. دانت جھڑ رہے تھے اور بینائی میں فرق آ رہا تھا تو اتنی دیر کیوں ہوگئی.. یہ ''وہ'' پوچھ رہا تھا.. میں نہیں!

میرا گمان ہے کہ یہ خط لکھا تو گیا لیکن پوسٹ بہت بعد میں ہوا..

ہر شخص کی زندگی میں ایک خط ہوتا ہے!

کسی کو وہ مل جاتا ہے..

اور کسی کو نہیں ملتا..

جس کو وہ مل جاتا ہے وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا.. کرتھیا تھیا ناچنے لگتا ہے۔ اناالحق

کے نعرے لگاتا دار کی جانب چلنے لگتا ہے..کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو بھٹکتا ایک اندھے کنویں میں دفن ہو جاتا ہے۔عشق کے ہاتھی تلے بخوشی روندا جاتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے..اور جس کو یہ خط نہیں ملتا وہ شکوک اور تذبذب کی دلدل میں حیات گزار دیتا ہے اور نہیں جانتا کہ اسے وہ خط لکھا بھی گیا ہے یا نہیں.. اگر لکھا گیا ہے تو ابھی تک آیا کیوں نہیں..

تو ہر شخص.. ہر ذی روح.. ہر شہر' گل بوٹے.. یہاں تک کہ ہر پتھر کے نام بھی ایک خط ہوتا ہے..جو کبھی مل جاتا ہے..اور کبھی نہیں ملتا..

وہ اس خط کے لیے بھٹکتا رہتا ہے..

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خط اس کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے..وہ چاہتا ہے کہ اسے وصول کیا جائے اور جس کے نام وہ ہوتا ہے وہ ملتا نہیں..

بھٹکے ہوئے خط اور روحیں بہت خطرناک ہوتے ہیں۔

اور کبھی کبھار وہ آپس میں گٹھ جوڑ بھی کر لیتے ہیں..

خط کو وصول کرنے والا نہیں ملتا اور روح کو بدن نہیں ملتا۔

وہ دونوں..بے اثر..رائیگاں اور مایوس ہو کر..آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اب اگر کوئی وصول کرنے والا سامنے آ جائے تو ہم نے وصول نہیں ہونا اور اگر کوئی بدن آ جائے تو ہم نے اس میں حلول نہیں کرنا..

تب ''وہ'' بولا...

وہ تنگ آ چکا تھا ''تم بھی تو خطوں اور روحوں کی مانند بھٹک رہے ہو۔تم صرف یہ بتاؤ کہ ایک ایسا خط جس پر ہمارا نام درج ہو..اگر آتا ہے تو کس کا ہو سکتا ہے؟

''میں نہیں جانتا اسی لیے تو بھٹک رہا ہوں۔''

''کچھ قیاس کرو..مہمیز دو اپنے تخیل کو..''

''یہ مسئلہ یوں حل ہونے کا نہیں..اسے حل کرنے کے لیے بھی تھوڑا بھٹکنا پڑے گا.. بہت سے زنگ آلود قفل توڑنے ہوں گے..بند دروازوں پر دستک دینی ہوگی..کائی زدہ پتھروں کو اٹھا کر ان کے نیچے جو روئیدگی ہوتی ہے' اس پر جھکنا ہوگا..بہت سے اندھے کنوؤں میں جھانکنا ہوگا..دھوپ میں آئے ہوئے بدنوں پر جو سنہری روئیں چھب دکھاتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو قریب سے دیکھنا ہوگا۔''

اگرچہ ایک زنگ آلود قفل کا..ایک بند دروازے اور کائی زدہ پتھر کا..اندھے کنویں کا اور ایک دھوپ میں بدن سے الگ ہوتے سنہری روئیں کا آپس میں کوئی ربط نہیں لیکن اس مسئلے کا حل اس بے ربطی میں پوشیدہ ہے۔

یہ ایک مردہ شاعرہ کی انگلیوں..مردہ انگلیوں سے لکھا گیا ایک بے ربط خط بھی تو ہو سکتا ہے۔

مردہ شاعرہ کو زندہ حالت میں اس نے بہت کم دیکھا تھا..

وہ ایک دوسرے کے وجود سے تو آگاہ تھے' لیکن ایک دوسرے کو جانتے نہ تھے.. کبھی کسی محفل میں آمنا سامنا ہونے پر ماتھے تک جاتا ہوا ایک ہاتھ.. کسی مشاعرے میں ایک ہلکی سی.. پہچان والی مسکراہٹ.. کبھی کسی ناشر کی سیڑھیاں چڑھتے..اور وہ اترتی.. آپ کیسی ہیں؟..اور آپ کیسے ہیں؟.. کسی شادی میں کسی اور کی متلاشی نظروں میں اس کا چہرہ فوکس میں آ جاتا تو وہ ٹھٹک جاتی.. یہ لوگ آپ کے بھی عزیز ہیں؟..اور اس کے سوا اخباروں میں رنگین تصاویر..اور وہ تصویر کھنچوانے میں بے حد محتاط تھی..اس امر سے بخوبی آگاہ کے چہرے کے کون سے رخ کے ساتھ کیمرہ اچھا سلوک کرتا ہے اور کون سا موڈ اس کی شاعری کی نمائندگی کرتا ہے..ٹیلی ویژن پر انٹرویو اور میزبانی کے فرائض..ادبی جرائد میں کلام..بس اتنا ہی ربط تھا.. جو سینکڑوں لوگوں کے درمیان ہوتا ہے...

ایک واقف کار جو اسے کالج کے زمانے میں جانتا تھا' اس کا کہنا تھا کہ بس اس کا چہرہ ہے اور اس کے نیچے وہ قدرے ناتواں اور میدانی ہے..لیکن جب اس کا چہرہ بنتا تھا احتیاط اور حسن جمال کے ذوق کو بروئے کار لا کر میک اپ کے ساتھ..تو جب وہ چہرہ تیار ہوتا تھا' بنتا تھا تو ایسا چہرہ ہو جاتا تھا جو ہیلن آف ٹرائے کی مانند ایک ہزار بحری جہازوں کے بادبان کھول سکتا تھا..

وہ بے پناہ مقبولیت میں سانس لیتی تھی..اس کے شعر شکایتی خطوں میں Quote کیے جاتے تھے..اور تیروں کی طرح نشانے پر بیٹھتے تھے۔ بے وفائی..نارسائی.....راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے پر ایک ایسی اوس کی طرح گرتے تھے جو کسک تو کم کرتی تھی لیکن اس کی اذیت کا لطف برقرار رکھتی تھی.. یہ نہیں کہ وہ صرف کچی عمر کے جذبوں کی شاعرہ تھی بلکہ پکی عمر والے بھی جب کبھی کسی

ناگہانی عشق کی آفت میں مبتلا ہوتے تھے تو وہ بھی اس کے شعروں کا سہارا لیتے تھے.. کیونکہ وہ ایک...شاعرہ...تھی..

اور تیروں کی طرح نشانے پر بیٹھنے والے اس کے شعروں میں ایک شعر ایسا تھا جو اس کے سینے میں نہ صرف آج تک پیوست تھا..آج تک ایک پھانس کی مانند اٹکا ہوا اسے مجرم بناتا تھا کہ اس نے اپنے آخری خط میں مردہ شاعرہ کے اس شعر کا حوالہ دے کر اسے بے عزت کیا تھا.. کیونکہ وہ شعر اس کی بزدلی اور کم حوصلگی کے عین مطابق تھا..اس شعر کے حوالے کے بعد ہی اس نے مردہ شاعرہ کے لیے ایک شدید ناپسندیدگی کا رویہ اختیار کر لیا..وہ اگر یہ شعر نہ لکھتی تو وہ ابھی تک باعزت ہوتا..محفلوں میں وہ نظریں چرا لیتا..سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ نظریں نیچی کر لیتا اور جب وہ کہتی کہ...جی آپ کیسے ہیں تو وہ مصنوعی ہڑبڑاہٹ سے بوکھلا کر کہتا..اچھا آپ ہیں میں نے دیکھا ہی نہیں.. یہاں تک کہ اس کی تصویر بھی اسے مجرم بنا دیتی..ظاہر ہے مردہ شاعرہ کو قطعی علم نہ تھا کہ یہ شخص اتنا روکھا کیوں ہو گیا ہے..اور نہ اسے پروا تھی..سینکڑوں اتفاقی ملاقاتیوں میں سے ایک کا رویہ اگر بدل جائے تو کیسے علم ہو سکتا ہے..

چنانچہ مردہ شاعرہ کو زندہ حالت میں اس نے بہت کم دیکھا تھا..

وہ اکثر بہت ڈھیلے ڈھالے گاؤن نما لباس زیب تن کرتی جن سے نشیب و فراز کی کم مائیگی کا اندازہ نہ ہو اور وہ بہت شاہانہ دکھائی دیتی..ہر نظر..ہر کیمرے کا فوکس اس کے چہرے پر ہوتا جو ان ہزاروں بحری جہازوں میں سے چند ایک کے بادبان اس محفل میں کھول دیتا..

حسب معمول اس سویر بھی..تقریباً ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ وہ اس ایک چوک میں سے گزر کر شاہراہ کی جانب مڑا..جس چوک میں سے گزر کر وہ ہمیشہ اسی وقت شاہراہ کی جانب مڑتا تھا..تو اس نے ایک ہجوم دیکھا..

وہ چوک میں سے گزر کر شاہراہ کی جانب بائیں ہاتھ پر مڑنے کو تھا جب اس نے ایک ہجوم دیکھا..

یہ کوئی سیاسی ہجوم نہ تھا کہ خاموش تھا.. یوں بھی اس مقام پر ہجوم کو جمع ہونے کا موقع پولیس نہیں دیتی تھی کہ عین سامنے شاہراہ کے آخر میں صدارتی محل تھا..صدر صاحب..ایک جمہوریہ کے صدر صاحب..جیسے تیسے بھی ہوں..بے شک پتلی تماشا ہوں..ایک قصر صدارت کے آس پاس

دو چار کلومیٹر کے دائرے میں ظاہر ہے ایسا ہجوم برداشت نہیں کر سکتے جو سیاسی ہو..

ہجوم خاموش تھا اور اس کے درمیان میں کوئی ایسی شے تھی جسے ''وہ'' پُرتشویش نگاہوں سے تک رہا تھا۔

''یہاں کیا ہوا ہے منظور..'' اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا جس نے کار کی رفتار کم کر دی تھی..

''کیا پتہ صاحب.. آپ کہو تو گاڑی روکتا ہوں اور پتہ کرتا ہوں..''

''نہیں.. تم چلے چلو..''

''کوئی حادثہ ہوا لگتا ہے صاحب.. ایک کار کچھ تباہ ہو گیا لگتا ہے صاحب..''

حادثے تو ہوتے رہتے تھے..

تو کسی ایک حادثے کے لیے اپنا پینڈا کھوٹا کرنا.. چہ معنی..

''تم چلے چلو..''

کام سے واپسی پر.. اس نے اپنے میر پوری ملازم کی موٹی بیوی کے ہاتھوں کا بنایا ہوا بدمزہ کھانا کھایا اور کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا.. کمرے میں مکمل تاریکی تھی اور یہ معلوم نہ پڑتا تھا کہ باہر ابھی دوپہر ہے.. دھوپ ہے.. جب فون کی گھنٹی اس کی تھکاوٹ اور بے سکونی کو کچوکے دیتی بجنے لگی.. چُپ نہ ہوئی..

دوسری جانب اس کا ایک متشرع اور عزیز دوست تھا.. اور شاعر بھی تھا..

''تمہیں پتہ ہے شاعرہ مر گئی ہے؟''

''کون سی شاعرہ؟''

''شہر میں ایک ہی تو شاعرہ تھی.. وہی مر گئی ہے۔''

''کیسے؟'' اس کا سوال اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا..

''آج صبح.. وہ دفتر کے راستے میں تھی.. سامنے سے ایک اور کار سیدھی اس کی ونڈ سکرین پر آ گئی.. فلاں چوک سے مڑتے ہوئے.. ڈرائیور بھی مر گیا ہے.. وہ پچھلی نشست پر تھی۔''

ایک سینئر شاعرہ جو حیرت انگیز طور پر خوشی اور غمی کے ہر موقع پر موجود ہو جاتی تھی.. تسلی بخش فقرے ایک تسلسل سے کہتی چلی جاتی تھی۔ اس نے بتایا ''اسے بمشکل اکٹھا کیا گیا... اس کا چہرہ.. جو ایک ہزار بحری جہازوں کے بادبان کھول دینے پر قادر تھا.. حادثے کی شدت سے پھٹ گیا

تھا.. اسے یکجا کرنے کے لیے سیا گیا تھا.. عجیب دھاگے کو سوئی دھاگے سے پھوسے بنایا گیا تھا..''

''تمہیں اطلاع کرنی تھی کہ جنازہ پچھلے پہر ہے'' متشرع شاعر نے اطلاع کی اور فون بند کر دیا..

اسے شاعرہ کی موت کا دکھ نہیں ہوا تھا.. ہاں ایک ایسی موت کا دکھ ہوا تھا جو یونہی بے وقت سرسری طور پر درمیانی عمر میں پہنچتے ہی آ گئی تھی جب کہ اصولی طور پر اسے بہت بعد میں آنا چاہیے تھا..

وہ ان لوگوں کے جنازوں میں بھی چلا جاتا تھا' جنہوں نے زندگی بھر اسے زچ کیا تھا.. اس کی راہ میں روڑے اٹکائے تھے.. اس لیے نہیں کہ وہ ایک طمانیت محسوس کرتا تھا کہ وہ اس سے پہلے رخصت ہو گئے بلکہ اس لیے کہ موت تمام تر رنج اور شکایتیں تلف کر دیتی ہے.. اگر نہیں تلف کرتی تو حیوانوں کے لیے نہیں کرتی انسانوں کے لیے کر دیتی ہے..

تو شاعرہ کے جنازے پر اسے بہرصورت پہنچنا تھا کہ اگر وہ دوست نہ تھی تو دشمن بھی ہرگز نہ تھی..

بہت کم لوگ تھے..

اتنے کم کہ جنازگاہ میں پہنچ کر اسے اس کی موت کا زیادہ دکھ ہوا..

مقبولیت آپ کے جنازے کو بڑا نہیں کر سکتی..

لوگ آپ کے لفظ کے شیدائی ہوتے ہیں آپ کے نہیں..

آپ کی بجائے اگر آپ کے لفظ مر جائیں تو ان کا جنازہ بہت بڑا ہو گا..

البتہ ایسا جنازہ اخباروں اور ٹیلی ویژن پر آہستہ آہستہ بہت بڑا ہو جاتا ہے جب سوگوار ہم عصر نہایت دکھی شکلیں بنائے بھرائی ہوئی آواز میں شاعرہ کے ساتھ دیرینہ اور نہایت قریبی تعلقات کے دعوے کرتے ان آنسوؤں کو پونچھتے ہیں جو وہاں نہیں ہوتے اور پھر پوچھا کرتے ہیں کہ یار تم نے شاعرہ کی موت پر میرا کالم پڑھا تھا.. میرا بیان دیکھا تھا..

لیکن اس کے جنازے پر وہ نہیں پہنچ پاتے..

چنانچہ اتنے کم لوگ دیکھ کر اسے اس کی موت کا مزید دکھ ہوا.. وہ اتنے کم تھے کہ دور سے یہی لگتا تھا کہ چند لوگ قبرستان کی تنہائی میں کوئی خفیہ بات کرنے آئے ہیں..

نماز کے بعد اس کی سیاہ پوش چارپائی اٹھائے ہوئے جب وہ اس کے سرکاری محکمے کی

تن دہی کی بدولت پہلے سے کھودی گئی قبر کی جانب جاتے تھے تو کندھا دینے کی باری بار بار آ جاتی تھی کہ بس اتنے ہی لوگ تھے..

چارپائی قبر میں سے کھودی جانے والی مٹی کے ڈھیر پر رکھی گئی تو اس کے تینوں پائے تو مٹی پر جم گئے لیکن چوتھا ڈھلوان پر ٹیڑھا ہو کر پڑا.. چارپائی کا توازن بگڑا تو سیاہ چادر تلے کفن میں لپٹی لاش لڑھک کر اس کی ریلنگ کے ساتھ آ لگی.. اس ریلنگ کا یہی مقصد تھا کہ مردہ بدن ادھر ادھر ڈھلک کر چارپائی سے گر نہ جائے..

قبر میں اتارنے سے پیشتر اعلان کیا گیا کہ جنازہ زنانہ ہے.. اسے صرف حقیقی رشتے دار ہی اٹھا سکتے ہیں.. نامحرم ہاتھ نہیں لگا سکتے..

قریبی رشتے دار اس لمحے صرف ایک ہی تھا جو ایئرپورٹ سے براہ راست ابھی ابھی قبرستان پہنچا تھا... کراچی سے آیا تھا اور بوکھلایا ہوا تھا.. اس نے کچھ توقف کیا اور پھر اس کے ذہن میں آیا کہ اسی کو قبر میں اتر کر اپنی عزیزہ کو وصول کرنا ہے.. ظاہر ہے اسے قبروں میں اترنے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ اس لیے وہ جھجکتا ہوا.. ایک دو ہاتھوں کو تھامتا نیچے اترا..

اب کسی نہ کسی کو اسے.. شاعرہ کو چارپائی سے اٹھا کر.. یوں اٹھا کر کہ سفید کفن میں لپٹی.. سلی سلائی مردہ شاعرہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے مضبوطی سے یوں جکڑنا تھا کہ اس کا بقیہ بدن بھی ڈھلک نہ جائے.. نیچے بانہیں پھیلائے قریبی عزیز کے ہاتھوں میں دینا تھا.. کسی نہ کسی کو..

سبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے..

یہاں اگر شاعرہ کی کوئی دوست ہوتی.. کوئی عزیزہ' کوئی چاہنے والی ہوتی تو یہ کام کتنا آسان ہو جاتا لیکن اس کی اجازت نہ تھی..

ایک عورت مرنے کے بعد بھی کتنی لاچار اور تنہا ہوتی ہے کہ اسے اس کی کوئی ہم جنس قبر میں بھی اتار نہیں سکتی کہ اس کی اجازت نہ تھی..

ایک ہم عصر معنک شاعر جو اس کی از حد تعظیم کرتے تھے' آگے بڑھے اور جھک کر مردہ شاعرہ کے بدن کو.. کچھ اور لوگوں.. نامحرم لوگوں کی مدد سے اٹھایا اور اسے قبر کے اندر کھڑے قریبی عزیز تک پہنچانے کے لیے جھکنے کو تھے کہ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا. لرزنے لگے.. انہیں دل کا عارضہ تھا اور اس لمحے یکدم دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ لاش ان کے ہاتھوں میں سے گرنے والی تھی جب انہوں نے اسے اپنے سامنے مٹی کے ڈھیر پر کھڑے دیکھا اور کہا ''یار.. تم آ جاؤ پلیز..

مجھ سے یہ نہیں سنبھلتی..''

وہ جو ایک تماشائی کی طرح اس ڈھیر پر کھڑا پردہ گرنے کا منتظر تھا.. معنک شاعر کی پکار پر قدرے بوکھلا گیا اور آگے ہو کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔ اس کے ڈھلکے ہوئے کفن میں لپٹے بدن کو سنبھال لیا..

اگرچہ ہر لاش اپنی زندگی کی نسبت موت میں زیادہ بھاری ہو جاتی ہے لیکن مردہ شاعرہ کا بدن مور کے رنگین پر ایسا ہلکا تھا..

مٹی کے ڈھیر پر کھڑے لوگ اسے مسلسل ہدایات دے رہے تھے.. کمر پر گرفت مضبوط رکھیں.. سر کے ڈھلکنے کا خیال رکھیں..

اور تب.. جب وہ اسے قبر میں اتار رہا تھا.. قریبی عزیز کے بڑھے ہوئے ہاتھوں تک اتار رہا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ کفن کے اندر مردہ شاعرہ کا جو ہاتھ تھا.. مردہ ہاتھ تھا وہ اس کے فی الحال زندہ ہاتھ کی گرفت میں آ گیا۔ یوں آیا کہ اس کی ایک ایک ڈھلکی ہوئی مردہ انگلی کے درمیان جیسے کفن کا کپڑا نہ ہوا.. اور وہ اسے زندگی میں تھامے ہوئے ہو.. یہ ایک ناقابل بیان سنسنی تھی اور وہ سناٹے میں آ گیا.. اس کا ہاتھ ایک سوئے ہوئے بچے کی طرح بے جان اور بے حس تھا.. اور اس لمحے اس سناٹے میں ایک خیال تیرا.. کہ انہی انگلیوں نے وہ شعر لکھا تھا جسے اس نے اپنے آخری خط میں Quote کر کے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا.. انہی انگلیوں نے.. جس شعر نے اسے زندگی بھر کے لیے مجرم بنا دیا تھا.. وہ انہی بے جان انگلیوں نے لکھا تھا جب ان میں جان تھی.. زندگی کی حدت دمکتی تھی..

یہ لمحہ بھی اس کی مانند سناٹے میں آ کر ٹھہر گیا.. جامد ہو گیا.. پتھر ہو گیا.. ایک مجسمے میں بدل گیا..

ایک ایسا مجسمہ جسے آج تک کسی سنگ تراش نے تراشا نہ تھا.. جس کی کوئی مثال نہ تھی..

سوائے ایک مثال کے..

روم کے کلیسائے سینٹ پیٹر کے گنبد تلے البتہ ایک مجسمہ تھا..

بی بی مریم سر جھکائے.. سر کو چادر سے ڈھکے.. سنگ مرمر کی اس سفید چادر سے ڈھکے جسے مائیکل اینجلو نے تراشا تھا.. اپنے بیٹے عیسیٰ کی لاش کو بازوؤں میں تھامے.. ڈھلکتی ہوئی.. بازو ڈھلکے ہوئے.. ٹانگیں مردہ اور ان کی رگیں ڈھیلی.. بی بی مریم بیٹھی ہیں.. اپنے بیٹے کی لاش کو اپنے

زانوؤں پر رکھے' سر جھکائے..ان کے ہاتھ زندگی میں ہیں اور بیٹے کی انگلیوں میں جان نہیں ہے..

بس یہی ایک مثال تھی..

یہ مجسمہ اس کے سامنے ہمیشہ آویزاں رہا..شاعرہ کی لاش اٹھائے ہوئے اس کی مردہ انگلیوں کو گرفت میں لیے ہوئے.. ہر چوک میں.. ہر شاہراہ پر..اس کے بستر کی سائیڈ ٹیبل پر..ٹیبل لیمپ کے عین نیچے یہی مجسمہ سجا رہا..کفن میں پوشیدہ انگلیوں پر اس کی زندہ گرفت..پتھر ہو گئے..

اس لمحے جب وہ مجسمہ تخلیق ہونے کو تھا تو اس نے شکایت تو کی تھی کہ اے مردہ انگلیوں' تم نے وہ شعر کیوں لکھا جس نے مجھے بے توقیر کیا..

تو اس شکایت کے جواب میں ان مردہ انگلیوں نے کچھ نہ کچھ تو لکھا ہوگا..

کیڑے مکوڑوں کا رزق بننے سے پہلے..

مردہ انگلیاں اگر لکھ سکتیں تو کیا لکھتیں..

شاید انہوں نے اس مردہ حالت میں بھی ایک شعر اُس کے لیے لکھا ہو..

اسے لفافے میں بند کر کے اسے پوسٹ کیا ہو..

اور ڈاکیا اسی مردہ شاعرہ کا خط لیے اُس کی جانب آ رہا ہو..

کیا پتہ...

کون؟

کون...کوئی ایک فرد بھی ہو سکتا ہے..ایک انسان..

کون..ایک بُوٹا ہو سکتا ہے..ایک کونپل ہو سکتی ہے..چند روزہ حیات کی پھڑ پھڑاہٹ کی حامل ایک تتلی..ایک پتنگا..برسات میں زمین سے نکلنے والی ایک بیر بہوٹی بھی ہو سکتی ہے..

کون..ایک خیال بھی تو ہو سکتا ہے جو ماورا ہوتا ہے کہ کون زمان و مکاں کے کس لمحے میں وہ حیات کر رہا ہے اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا..

ایک بُوٹا..کسی ڈائناسورس کے بھاری دھمک والے پاؤں تلے روندا جانے والا بُوٹا...یا پھر کسی کوہ نورد کے بھاری بوٹوں سے کچلا جانے والا وہ بُوٹا جو 2003ء میں نانگا پربت کے راستے میں رُوپل وادی میں سر اٹھاتا ہے..اس بُوٹے کی فہم میں یہ نہیں ڈالا گیا کہ وہ زمان و مکاں کے کون سے لمحے میں زندہ ہے اور پھر اگلے لمحے میں کچلا گیا ہے...

چند روزہ حیات کی تتلی جو ایک اٹھارہ برس کے فرعون کے مقبرے میں رہ گئی تھی جب کہ اسے دفن کرنے والے اس کے زیرِ زمین مقبرے کو پتھر کی سِلوں سے بند کر کے چلے گئے تھے تو وہ اُس کے تابوت کے سنہری نقاب پر بیٹھ کر یہ سوچتی تھی کہ میں کہاں ہوں...یہ تتلی اس تتلی سے مختلف نہیں ہوتی جو 2002ء میں تقریباً تین ہزار برس بعد سنولیک کی برفوں میں گر کر حنوط ہو جاتی ہے۔

اسے جو مقبرے میں رہ گئی تھی اسے جو کچلی گئی تھی اور اسے جو برف میں مدفون ہو گئی تھی' اُن تینوں کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کون سے زمانے میں پھڑ پھڑاتی تھیں..

اور اسی طور ایک بُوٹے ایک تتلی کی مانند انسان بھی اگرچہ کبھی ڈائناسورس کو شکار کرنے کی سعی کرتا تھا اور کبھی چاند پر قدم رکھتا تھا لیکن وہ بھی نہیں جانتا کہ اُن زمانوں میں کون سا زمانہ ہے..جس میں وہ سانس لیتا ہے زندگی کرتا ہے۔

وہ...انسان..محض ورغلایا جاتا ہے...تاریخ اور عقیدے کے کٹڑ بے لچک اور متعصب حوالوں سے کہ تم فلاں عہد میں سانس لے رہے ہو..ورنہ اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کوئی علم نہیں ہوتا..

وہ ایک بُوٹے ایک تتلی کی مانند اپنا فرض پورا کر رہا ہوتا ہے۔زندہ رہنے اور اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کے لیے...تاریخ اور عقیدہ اسے ورغلاتا ہے..

معاشرہ اور اس معاشرے کی سازش سے چلنے والی تمام گھڑیاں اسے کسی ایک لمحے میں قید کر کے اسے یقین دلا دیتی ہیں کہ تم محض اس زمان و مکاں کے باسی ہو..

جب کہ ایسا ہوتا نہیں..

ایک بُوٹے..ایک تتلی اور ایک انسان کی مانند ڈاکیا محمد علی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زمان و مکان کے کسی ایک لمحے میں..وقت کی کسی ایک طے شدہ کترن میں..اپنے گھوڑے کی بادامی رنگت کی لشکتی پشت تھپکتا میری جانب نہیں آ رہا..بلکہ وہ ہمیشہ سے جب دھند پانیوں پر تیرتی تھی اور ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی اور روشنی کو ہو جانے کا اذن نہیں ملا تھا اور جسے ازل بھی کہتے ہیں تب سے میری جانب چلا آ رہا تھا..اور وہ جو میری طرح بھولے بھٹکے اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں' متلاشی ہوتے ہیں ہمیشہ منتظر ہوتے ہیں ہمیشہ اس سے پوچھتے ہیں کہ میرے نام کا کوئی خط تو نہیں؟..

اور اگر اس کے نام کا کوئی خط اس کے چرمی تھیلے میں ہوتا ہے تو وہ منتظر وہ متلاشی برگزیدہ ہو جاتا ہے..

محمد علی ڈاکیا چونکہ ہمیشہ سے جسے ازل کہتے ہیں کسی نہ کسی کی جانب اپنے گھوڑے کی پشت کو تھپکتا چلا آ رہا ہے' اس لیے وہ کبھی تو ایک جلتی ہوئی جھاڑی کی قربت میں نظر آتا ہے اور اس کا گھوڑا کوہ طور کے پتھروں پر بے آواز چلتا آتا ہے..کبھی وہ ایک صلیب کے سامنے کھڑا دکھائی دیتا ہے اور اس خط کو دیکھتا ہے جو اس کے نام آیا تھا جس نے دوسروں کے گناہ اپنے سر لے لیے تھے..ڈاکیا کسی اندھے کنویں میں جھانک کر یوسف کو بھی تلاش کرتا ہے..اس نے عین وقت پر پہنچ کر اسماعیل کی گردن پر رکھی چھری کو ہٹایا تھا..کبھی وہ غار حرا کے آس پاس منڈلاتا ہے...

وہ کسی بھی زمان و مکاں کے کسی ایک لمحے میں قید نہیں..اگرچہ وہ بھی نہیں جانتا اور یہی قیاس کرتا ہے کہ سامنے سے جو کوہ نورد چلا آ رہا ہے کیا اس کے نام کا بھی کوئی خط میرے پاس ہے یا نہیں...

اسی ڈاکیے نے شاہ گوری کے نیلونیل بدن پر خطوں کے پھاہے بھی رکھے تھے..جہاں جہاں چمڑے کی بیلٹ اس کے بدن میں کھب کر اپنے نشان چھوڑ گئی تھی' وہاں وہاں اس نے ایک ایک خط رکھا تھا..

ایک خط شکاری کی لبلبی کو دبانے والی انگلی پر چپکا دیا تھا تا کہ نشانہ خطا ہو جائے..

عجیب ڈاکیا تھا جو کولرج کے افیون کے گولے کو ایک خط میں لپیٹتا تھا..غالب کے روزِ ابر و اور شب ماہتاب کے شراب میں جھلکتا تھا..قراۃ العین طاہرہ کو تلاش کرنے کے لیے کنویں میں جھانکتا تھا..ابونواس کے جام میں گھلتا تھا..کبھی ایک ویران ریلوے سٹیشن کے بنچ پر ایک خط رکھتا تھا' جس پر ٹالسٹائی نے آ کر مر جانا تھا..کالی داس کی شکنتلا کے قلانچیں بھرتے ہوئے ایک ہرن کے آگے اپنا گھوڑا کھڑا کر کے اسے روکتا تھا اور ایک خط اس کے نام کا اس کے آگے رکھتا تھا...

کہیں یہ ڈاکیا وہ تو نہیں جس کی ہر ذی روح کو ازل سے تلاش ہے کہ وہ آئے اور اس جہان سے آگے ایک اور حیات کی نوید دے...

وہ خوب آگاہ تھا کہ کس کے نام کون سا خط ہے...اگر ہے تو...اور وہ انہیں گڈمڈ نہیں کرتا تھا..جانتا اس لیے تھا کہ یہ سب خط اسے اس کے پوسٹ ماسٹر نے دیئے تھے پہنچانے کے لیے...اور وہ تو صرف ڈیوٹی دے رہا تھا...جسے جو خط جس لمحے..جہاں پہنچانا تھا...پہنچا رہا تھا...

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ صرف میں نہ تھا جو وادیٔ شگر سے پرے...خوبانیوں کے سورجوں سے لدے پیڑ اور حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے کہیں آگے ڈاکیے کو اپنی جانب آتے دیکھتا تھا..

صرف میں نہ تھا..

آپ سب بھی تھے..

سبھی جو منتظر اور متلاشی ہوتے ہیں..وہ سب تھے...

میں تنہا نہ تھا..

آپ سب بھی تھے...

اور جب میں صیغہ واحد متکلم استعمال کر رہا ہوں تو اسے جمع کر لیجیے...کہ یہ صرف میں

نہیں آپ سب بھی ہیں...

ہم سا نجھے متلاشی اور منتظر ہیں..

اسی طور وہ جو سامنے سے چلا آ رہا ہے' وہ بھی محض ایک ڈاکیا نہیں ہے..کچھ اور ہے... کیا ہے؟..اس کی تو تلاش ہے کہ کیا ہے..

نہ وہ کسی ایک لمحے میں..کسی بھی زمان و مکان میں..قید تھا اور نہ میں..

اور ہم دونوں ازل سے ایک دوسرے کو ڈھونڈتے آئے تھے..

اس کے پاس بہر صورت میرے نام کا ایک خط ہونا تھا..اگر نہ ہوتا تو وہ سامنے سے کیوں آ رہا ہوتا..اسی لمحے..اسی مقام پر وہ کیوں دکھائی دیتا...وہ ڈاکیا صرف اسی صورت ہو سکتا تھا...اس کے ڈاکیا ہونے کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ اس کے چرمی بیگ میں میرے نام کا ایک خط تھا...

اگر اس کے چرمی بیگ میں میرے نام کا کوئی خط نہ تھا...تو اس کے سامنے سے آنے کا کوئی جواز نہ تھا...اس مقام..اس لمحے یہاں نمودار ہونے کا کوئی جواز نہ تھا..اگر خط نہ تھا اور پھر بھی وہ سامنے سے آ رہا تھا تو وہ ڈاکیا نہ تھا' ایک بہروپیہ تھا..

اس کے بہروپ نے ہی تو تمام تر شک و شبہات کو جنم دیا تھا...

بہروپ کا ہی سارا فساد تھا..

میں نا ہیں..سب توں اور انا الحق کا فساد..

اگر میں نہیں تو وہ ہے...وہ ہے تو میں ہوں..

اسی لیے وہ اپنے ہونے کا انحصار مجھ پر کرتا ہے..میں..جو انسان ہوں..چاہوں تو وہ ہو..نہ چاہوں..مُنکر ہو جاؤں تو وہ نہیں ہے..

وہ بہروپ نہ بھرتا تو کسی کو کوئی شک شبہ نہ ہوتا۔ ہر کوئی چین اور آنند کی نیند سوتا..کوئی بھی تشکیک کا شکار نہ ہوتا..

لیکن میں کہاں سے کہاں چلا گیا ہوں..میں یقیناً بھٹک گیا ہوں..راہِ راست سے بھٹک کر کہیں اور نکل گیا ہوں..

میں تو محض ایک عام سے..معمولی ڈاکیے کو بیان کر رہا تھا..اس قسم کا ڈاکیا جس کے وجود سے بھی ہم واقف نہیں ہوتے..وہ باقاعدگی سے آ کر ڈاک پھینک کر چلا جاتا ہے..اور کبھی دو چار

ہفتوں کے بعد اگر کوئی رجسٹری خط آ جائے تو دستخط کروا کے چلا جاتا ہے..عید' بقر عید..پر عیدی لے کر چلا جاتا ہے۔

محض ایک معمولی سا ڈاکیا..بس اسی نوعیت کا ایک ڈاکیا لمحۂ موجود میں میری جانب چلا آتا تھا..

ویسے میں راہِ راست سے بھٹک کر اگر کہیں اور نکل گیا ہوں تو مجھے بھٹکانے اور راہ راست سے ہٹانے والا بھی تو وہی ہے کہ سب کچھ اس نے اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے...اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا..یہ پتہ جو انسان ہے اگر ہلتا ہے بھٹکتا ہے تو اسے کون ہلاتا ہے' بھٹکاتا ہے..قضا اور قدر کا مسئلہ تو اسی نے کھڑا کیا ہے ورنہ انسان تو سر جھکا کر بے شک بے شک کہنے والوں میں سے ہے..کس نے قراۃ العین طاہرہ کو ورغلایا...راہ راست سے بھٹکایا' طے شدہ شریعت سے انحراف کرنے پر مجبور کیا...اس نے نہیں تو کس نے؟ طاہرہ کی کوبہ کو، کوچہ بہ کوچہ درماندگی اور آوارگی کا کون ذمہ دار ہے..طاہرہ...جس کے بس میں کچھ نہ تھا یا وہ...جس کے بس میں بقول اس کے سب کچھ ہے...اس کے شریعت سے انحراف اور محبت کی ایک نئی شریعت کے اعلان کو کس کی پشت پناہی حاصل تھی..اس کی نہیں تو کس کی..؟ وہ خود تو ایک گوشت پوست کے ایک عارضی وجود کے سوا کیا تھی جو بالآخر ہر انسان کی مانند قبر کے کیڑوں کی خوراک بنی..اس کنویں کی قبر کے کیڑوں کی خوراک جس میں ایک ریشمی رومال سے اس کا گلا گھونٹ کر پھینک دیا گیا تھا اور کُنویں کو مٹی سے پُر کر دیا گیا تھا...

ہاں واقعی...میں کچھ زیادہ ہی بھٹک گیا ہوں..متعینہ راہِ راست سے کچھ زیادہ ہی ہٹ گیا ہوں..

میں نے اسے موت کے سیاہ پوش کی صورت میں وادیٔ سوختر آباد میں پامیر کے سائے میں دیکھا تھا لیکن تب یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ محمد علی ڈاکیے کا ہی ایک بہروپ ہے جو میرا پیچھا کر رہا ہے...یہ اس کی موجودگی تھی جو ہر منظر ہر چہرے کو حسن اور بے مثالی کی شعاعیں عطا کرتی تھی جن کی زد میں آ جانے والا شخص...فاتر العقل ہو کر انہیں پوجنے لگتا ہے کہ اس سیاہ پوش کی موجودگی اسے احساس دلاتی ہے کہ یہ منظر ہمیشہ رہے گا اور تم نہیں رہو گے اور یہ چہرہ بھی فنا ہو جائے گا اس لیے اسے جی بھر کے دیکھ لو...

اگرچہ ایک بوٹا' ایک تتلی اور ایک انسان یہ نہیں جانتے کہ وہ زمان و مکاں کے کون سے

لمحے میں سانس لے رہے ہیں...مجبور اور بے بس ہیں...کوئی ایک ڈائناسورس کے پاؤں تلے آ جانے پر...کوئی برف کی سلطنت میں حنوط ہو جانے پر..اور کوئی لکھی گئی تقدیر کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے..اور اس کے باوجود یہ سب..ایک بوٹا' ایک تتلی' ایک انسان گواہی دے سکتے ہیں کہ محمد علی ڈاکیے کا وجود ہے..

یہ نہ ہوں تو محمد علی ڈاکیے کا بھی کوئی وجود نہ ہو..

جولاہے کو ابھی ابھی ایک بے وقوفی کا احساس ہوا ہے..

وہ بے شک بے وقوف ہے لیکن کوئی عام جولاہا نہیں' اس لیے اسے اس کا احساس ہوا ہے..

اس بیانیے کو پڑھتے ہوئے اس پر کھلا ہے کہ شاید پڑھنے والے کے دل میں ایک غلط فہمی جنم لے چکی ہو..

کہ یہ صرف جولاہے کی سرگزشت ہے..

کہ وادیٔ شگر سے پرے خوبانیوں سے حامل اور بوجھل ہوتے درخت کے آگے اس پہاڑی نالے کے پار سے آنے والے ڈاکیے کو صرف اس نے دیکھا ہے..اس کے بدخشانی گھوڑے کی لشکتی جلد کو صرف اس نے دیکھا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔

وہ سب جو اس جہانِ رنگ و بو میں لمحۂ موجود میں سانس لے رہے ہیں' ان سب نے اسے دیکھا ہے..اپنی جانب بڑھتے ہوئے..

جولاہے کی وہاں اس وقت کی کترن میں موجودگی محض علامتی ہے..اس کی وہاں موجودگی ان سب کی موجودگی ہے جو اس جہانِ رنگ و بو میں سانس لے رہے ہیں..

جولاہا ایک نمائندہ ہے..

ہر اُس شخص کا جو شعور کی سرحدوں کو پار کر کے..شعور کی وہ سرحدیں جنہیں معاشرہ اپنی بنیاد پرستی کی تلوار سے ایک گھاؤ کی مانند کھینچ دیتا ہے..اور وہ شخص جب دوسروں سے الگ اور مختلف ہو جاتا ہے..اخلاقیات اور محسوسات کے پیمانے اس کے سب سے الگ ہو جاتے ہیں تو ہر اس شخص کے سامنے سے ڈاکیا محمد علی اپنا چرمی تھیلا گھوڑے کی لشکتی جلد پر جھلاتا چلا آتا ہے۔

ہر اس شخص کے لیے اس کے تھیلے میں کوئی نہ کوئی سندیسہ ضرور ہوتا ہے' چنانچہ جو کچھ یہ جولاہا بیان کر رہا ہے' وہ آپ بیتی ہرگز نہیں.. جگ بیتی ہے اور وہ محض ایک علامت ہے..ایک نمائندہ ہے.. یوں بھی حیات ایک کاک ٹیل کی مانند ہے جس کا ایک گھونٹ بھرنے سے قطعی طور پر اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں کون کون سی شرابیں شامل ہیں..

جولاہے کو ابھی ابھی اس بے وقوفی کا احساس ہوا ہے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ صرف اور صرف اس کی زندگی کا بیان ہے..

جو کچھ آپ پر..اس لمحۂ موجود میں سانس لینے والے ہر شخص پر بیتا ہے وہی بیان کیا جا رہا ہے۔

جولاہا فقط ایک نمائندہ ہے۔

چرمی بیگ میں کسی کے نام کا بھی ایک خط ہوسکتا ہے..

لمحۂ موجود میں سانس لینے والے کسی بھی ایک شخص کے نام..

جولاہا تو محض ایک نمائندہ ہے..

ہر شخص اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی جرم کرتا ہے..

یہ جرم جان بوجھ کر منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں کیا جاتا..ہو جاتا ہے...ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ تو ایک جرم تھا' جو ہو گیا ہے..

کوئی اپنی من پسند کتاب ایک بک شاپ کے مالک کی نظروں سے اوجھل ہو کر اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس کر باہر آ جاتا ہے..گھر پہنچنے پر پچھتاتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا..میں اسے خرید سکتا تھا تو چوری کر کے کیوں لے آیا..پچھتاوے کی تاب نہ لا کر اسے واپس جا کر اس شیلف میں رکھ دینا چاہتا ہے اور بعض اوقات ایسا کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے اور دفاع میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیک ہے میں نے اسے چوری کیا تھا' لیکن میں تو اب اسے واپس رکھ رہا تھا اور دیگر گاہکوں کی موجودگی میں بے عزت کر کے بک شاپ سے باہر دھکیل دیا جاتا ہے..اور اکثر اوقات احساس جرم کی شدت کے باوجود اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس کتاب کو واپس رکھ آئے اور وہ ایک کتاب زندگی بھر اسے چین نہیں لینے دیتی' کچوکے لگاتی رہتی ہے..

اس کا جرم قدرے سنگین نوعیت کا ہے..

اس میں ساڑھے پانچ انچ لمبا ایک نشان ہے جو ایک کومل پیٹ پر کھنچا ہوا ہے..

شمس الدین تجربہ کار..بہت تجربہ کار تھا..

وہ پاکستان سے گیا تو بہت کچا تھا.. یورپ کے مختلف ملکوں کی گوریوں نے اسے اپنی بھٹیوں کی آگ میں ڈال کر پکایا اور پکا کر دیا..

اور وہ ایک عام پاکستانی مڈل کلاس نوجوان کی مانند سب کچھ جانتا تو تھا لیکن کسی بھی عملی تجربے میں سے گزرنے کے بغیر بس جانتا تھا...جیسے ''تیرا کی سیکھئے'' کی گائیڈ بک پڑھ کر آپ یہ تو جان جاتے ہیں کہ پانی میں اترنے کے بعد سطح پر رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں کیسے مارتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جان سکتے کہ جب سچ مچ پانی میں اترا جائے تو پھر کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے..

لیکن ''وہ'' یعنی شمس الدین متعدد بار پانی میں اتر چکا تھا بلکہ پانی کا کیڑا تھا اور خوب جانتا تھا کہ ایک چھوٹی سی آہستہ روندی میں.. یا ایک تند اور خودسر پہاڑی نالے میں جو اپنے آپ میں قدم رکھنے نہیں دیتا یا ایک جوہڑ میں داخل ہو کر کیسے اس میں نہایا جا سکتا ہے..

وہ اکثر بھیگا رہتا تھا..

''ڈونٹ ٹیل می ذیٹ'' اس کے شمس الدین کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی..

اور ہاں شمس الدین اس کے بچپن کا یار تھا۔ یورپ میں منافع بخش اطمینان سے زندگی گزارتا تھا اور ان دنوں اپنی ماں کی ناگہانی موت پر بہن بھائیوں کے سامنے صرف سرخرو ہونے کے لیے چند روز کے لیے پاکستان میں تھا تو اس کے چہرے پر بے یقینی تھی' جب اس نے کہا ''ڈونٹ ٹیل می ذیٹ'' یعنی تم ابھی تک ورجن ہو...تمہارا مطلب ہے کہ تم ابھی تک.. یو ڈونٹ نو وہاٹ اے وومین از..''

''نہیں..'' اس نے خجل ہو کر انکار میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں..کیوں نہیں؟''

''اپنے ملک میں گوریاں نہیں ہوتیں شمس الدین۔''

''ہوتی ہیں جان.. بلکہ ان سے بھی کہیں آسان ہوتی ہیں.. یورپ میں تو محبت کا ڈھونگ رچانا پڑتا ہے۔ کچھ ادب آداب ہوتے ہیں..اور وہ مرضی کی مالک ہوتی ہیں..مرضی نہ ہو تو آئس برگ سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہو جاتی ہیں..منت سماجت کرنی پڑتی ہے..ماحول تخلیق کرنا پڑتا

ہے..اور یہاں محض ایک لمس کافی ہوتا ہے اور پگھلاؤ شروع ہو جاتا ہے....بہت آسانی ہے..آؤ میرے ساتھ چلو..تمہاری کنوارپن کی مہر توڑتے ہیں..''

''میں اس بازار میں نہیں جاؤں گا..''

''نہ..وہاں نہیں۔''

''تو پھر کہاں؟''

''رہتے تم ہو پاکستان میں اور بتانا مجھے پڑتا ہے کہ اب ادھر ہر بازار..وہ بازار ہے..بس دیکھنے والے کی نظر چاہیے..آؤ..''

گلبرگ کا مین بلیوارڈ..ڈیفنس کی وہ سڑک جس کے آس پاس غیر ملکی خوراک گھر ہیں..

رات کو نہیں..

دن کے وقت..کڑکتی دھوپ میں..پچھلے پہر..

شمس الدین کی ہونڈا باہر کے موسموں سے بے خبر ٹھنڈک میں ہولے ہولے کروز کر رہی تھی..

''یار..یہاں کیا ہو سکتا ہے؟''

''یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اور..ہوتا ہے..''

''میں اکثر ان علاقوں میں سے گزرتا ہوں..کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

''تم موٹر سائیکل پر گزرتے ہو۔''

''کچھ ہونے کے لیے ایک ہونڈا کار بنیادی شرط ہے؟''

''ہاں..ایک نئی کار اور..دیکھنے والی نظر..''

''جو میرے پاس نہیں..''

''نہیں..میں نے پچھلے دو تین ہفتوں میں اس شہر کی اس رگ کو جان لیا ہے' جس پر صرف ہاتھ رکھنے کی دیر ہے اور وہ دھک دھک کرتی پگھلنے لگتی ہے...میں اماں کے چالیسویں تک یونہی سوکھا پڑا نہیں رہ سکتا' مجھے گیلاہٹ چاہیے تھی..اور وہ میں نے تلاش کر لی..اور اتنی آسان گیلاہٹ جو محض چھو لینے سے بہنے لگتی ہے..''

اسے وہ بہت برا لگا..

وہ اس کے دیس کی لڑکیوں کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اسے بہت برا لگا..

اسے یقین تھا کہ وہ ایسی نہیں ہیں اور وہ انتظار کرنے لگا کہ شمس الدین اس مشن میں ناکام ہو اور پھر وہ اسے ذلیل کرے لیکن یہ موقع اس کے نصیب میں نہ تھا..

مین بلیوارڈ کے بڑے پانی کی دھاریں بوچھاڑیں اگلتے فوآرے کے قریب جو بھی سٹاپ ہے' اس کے عقب میں درختوں کی اوٹ میں بظاہر چہل قدمی کرتیں دو لڑکیاں تھیں..وہ عام سے لباس میں عام سی نارمل قسم کی لڑکیاں تھیں..

اس نے نہیں..شمس الدین کی نظر نے نوٹ کیا کہ دیکھنے والی نظر وہ رکھتا تھا کہ ان میں سے ایک کبھی کبھار مڑ کر ادھر دیکھتی ہے جدھر مین بلیوارڈ کی ٹریفک رواں تھی..

شمس الدین کی ہونڈا ان کی چلنے کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے لگی..

انہوں نے نظریں اٹھا کر قطعی طور پر یہ نہ دیکھا کہ ان کے برابر میں ایک کار انہی کی رفتار سے دھیرے دھیرے چلتی ہے اور اس میں دو نوجوان ہیں جن میں سے ایک کا چہرہ پُراعتماد..کسی حد تک پُرتکبر..ہے اور دوسرا اپنی نشست میں دھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے..

''ہیلو..''

وہ بدستور چلتی رہیں۔

''ہیلو..'' ظاہر ہے یہ شمس الدین تھا..

آپس میں کھسر پھسر کرتی وہ چلتی گئیں..

''دیکھیں..اگر آپ نے کہیں ڈراپ ہونا ہے تو ہم آپ کو ڈراپ کر سکتے ہیں..''

ان میں سے ایک نے ایک مختصر پل میں ان کی جانب دیکھا..

شمس الدین نے بریک پر پاؤں رکھ دیا ''پلیز آ جائیے..ہم آپ کو ڈراپ کر دیں گے..''

وہ اپنے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا نروس تھا..اسے معلوم تھا کہ شمس الدین کی اس پیشکش پر یا تو وہ اسے گالیوں سے نوازیں گی یا زیرلب بڑبڑاتی چلی جائیں گی..لیکن وہ بالکل سناٹے میں آ گیا جب وہ دونوں کچھ بھی کہے بغیر شمس الدین کے دھکیلے ہوئے دروازے میں سے داخل ہو کر کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں..

''ہم دونوں میکڈونلڈ جا رہے تھے' ایک آئس کریم کے لیے..تو کیا آپ..''

''نہیں..''

''پلیز..''

''آپ ہمیں ڈراپ کر دیں..''

''صرف پانچ منٹ لگیں گے آئس کریم کے لیے..پلیز..''

''نہیں..''

''ہم آپ کو اس کے فوراً بعد آپ کے ہوسٹل اتار دیں گے..''

''آپ کیسے جانتے ہیں کہ ہم ہوسٹلائٹ ہیں..'' وہ ہنسنے لگیں..

''میں نے یونہی اندازہ لگایا تھا..پلیز..صرف ایک آئس کریم ہمارے ساتھ شیئر کریں..پلیز..''

''اوکے..''

اس ایڈونچر کے کچھ روز بعد شمس الدین نے اسے بتایا تھا کہ یہ تمہارے شہر کے تازہ ترین رواج ہیں اور تم نہیں جانتے..یہ ایک روٹین بن چکی ہے۔اس میں کوئی خدشہ نہیں' کوئی خطرہ نہیں...ہوسٹلوں میں رہنے والی کچھ لڑکیاں..ورکنگ وومن ہوسٹلز یا یونیورسٹی کالج کے ہوسٹلز میں رہنے والی کچھ لڑکیاں گیم ہوتی ہیں..کیبل اور وی سی آر کی ڈسی ہوئی..بلیو فلموں کو دیکھ دیکھ کر نڈھال..ایک آدھ تجربے والی ساتھی کی پُرجوش باتیں سُن سُن کر..یہ گیم ہو جاتی ہیں..فاسٹ فوڈ جوائنٹس کی شائق..یونہی پچھلے پہر جوڑوں میں چہل قدمی کرتی ہیں..اپنا نام نہیں بتاتیں..پتہ فون نمبر روپوش رکھتی ہیں اور جسٹ فارفن کے ضمن میں آپ کے ساتھ ایک برگر یا آئس کریم میں شریک ہو کر چلی جاتی ہیں..جسٹ فارفن..وہ اس حد سے آگے جانے کی نہ خواہش رکھتی ہیں..اور نہ ان میں سکت ہوتی ہے..جب تک کہ کوئی شمس الدین ایسا معصوم دکھائی دیتا اندر سے گھاگ نوجوان ان کی ناتجربہ کاری میں اپنا تجربہ داخل نہ کر دے..

اس کے حصے میں جو لڑکی آئی تھی..اور شمس الدین نے ان کے برابر میں کار روکنے سے پیشتر ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ جو قدرے فربہ اپنی قمیص میں پھنسی ہوئی ہے' وہ میری ہے..اور جو ذرا دبلی پتلی اور گھبرائی ہوئی ہے وہ تمہاری ہے..

تو دبلی پتلی اور گھبرائی ہوئی اس کے حصے میں آئی تھی اور وہ اس سے کہیں بڑھ کر گھبرایا ہوا تھا..

''دیکھو میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں..'' شمس الدین نے اس ایڈونچر پر نکلنے سے پیشتر اسے لیکچر دیا تھا ''یورپی لڑکی جونہی اپنی پریم سے باہر قدم رکھتی ہے' وہ اپنی دوشیزگی کے

پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے کہ جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کر کے اطمینان کا سانس لوں اور جب اس کی کوششیں بارآور ثابت ہوتی ہیں تو وہ کہتی ہے شکر ہے خدا کا یہ بوجھ تھا میرے دماغ پر جو اتر گیا..لیکن عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ وہ مشکل ہوتی چلی جاتی ہے..آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتی کہ آپ کی ہر چال کو وہ سمجھتی ہے..کیونکہ اس کے ساتھ بہت سے نوجوان یہ چالیں چل چکے ہوتے ہیں..آپ اسے ورغلا نہیں سکتے..فریب نہیں دے سکتے..منت سماجت سے بھی اپنا کام نہیں نکال سکتے..یوں بھی اس کا بدن ڈھیٹ ہو چکا ہوتا ہے اور وہ بے شک پوری شب بنا حجاب کے آپ کے ساتھ گزار دے لیکن آپ کو گزرنے نہیں دے گی..وہ اپنی گانٹھ کی پکی ہوتی ہے اور اسے کھولتی نہیں..جب تک کہ اس کی اپنی مرضی نہ ہو..اسے کھولنے کی..اور اس کے برعکس یہاں کی لڑکی..اگرچہ جانتی بہت کچھ ہے..اس نے بہت کچھ پڑھ رکھا ہوتا ہے..دیکھ رکھا ہوتا ہے جو ''نیلا ہٹ'' کے زمرے میں آتا ہے لیکن وہ ان چھوئی ہوتی ہے..اور جب زندگی میں پہلی بار تنہائی میں چھوئی جاتی ہے تو وہ پگھل جاتی ہے' بے بس ہو جاتی ہے..جدوجہد کرنا بھی چاہے تو اس کا بدن ساتھ نہیں دیتا..اسی لیے وہ ایک یورپی لڑکی کی نسبت کہیں زیادہ آسان ہو جاتی ہے..''

اور بالکل ایسا ہی ہوا تھا..

بات آئس کریم تک ہی محدود نہیں رہی تھی..

دبلی پتلی لڑکی کے ساتھ الگ سے دو چار رومانوی ملاقاتوں کے بعد جب اس نے ایک تنہائی میں اسے سرسری سا چھوا تو اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور وہ بے بس اور ڈھیلی ہو گئی..اتنی ڈھیلی کہ وہ اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود اس میں تیرنے لگا..

یہ کسی حد تک..بلکہ یقینی طور پر ایک بالجبر عمل تھا کہ اس میں دبلی پتلی لڑکی کی منشا شامل نہ تھی' محض اس کے بدن کی ان چھوئی زمین پر ایک مرد کا پہلا ہاتھ تھا..

تجربے کی شرافت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی حاملہ نہیں ہوتا..

وہ ہو گئی..

کیونکہ دونوں کے پاس تجربے کی شرافت نہ تھی..

سرگودھا کے کسی چک سے لاہور کے ایک ہوسٹل میں آئی ہوئی لڑکی...جس کے والدین معمولی مزارع تھے اور خواہش کرتے تھے کہ ان کی بیٹی چودھرانیوں کی فربہ رانیں ساری عمر دبانے کے بجائے پڑھ لکھ کر سکول ٹیچر ہو جائے۔لیہ سے لاہور شہر میں آ جانے والی اپنی روم میٹ

کے جھانسے میں آ گئی کہ..تم چلو تو سہی..کچھ نہیں ہوتا..تھوڑی سی ڈرائیو اور پھر ایک آئس کریم یا برگر...جسٹ فار فن یار...اور لیّہ سے آنے والی دو ماہ پیشتر لاہور کی ایک لڑکی...جس کے والدین انگلستان میں مقیم تھے...اس کے بھرّے میں آ گئی تھی کہ چلو کچھ نہیں ہوتا..اور واقعی پہلے کچھ بھی نہیں ہوا تھا..اور تب کچھ ہو گیا...

لیّہ سے آنے والی لاہور والی سے گُر سیکھ چکی تھی' اس لیے اس کا پیٹ ہموار رہا...

اور دبلی پتلی کا پیٹ پھولنے لگا..

جب پہلی بار انکشاف ہوا تو وہ دونوں اتنے نروس ہوئے کہ رونے لگے..

ان کی ہچکیاں بندھ گئیں...

انہیں تو یاد بھی نہ تھا کہ تب کیا ہوا تھا اور کیسے ہو گیا تھا..

ناتجربہ کاری بھی کتنی بڑی لعنت ہوتی ہے..

اس ناتجربہ کاری کی بنا پر وہ بہت دن تک منتظر رہے کہ نہیں یہ نہیں ہو گا..کچھ نہ کچھ ایسا ہو گا کہ پیٹ پھولنے سے باز آ کر پھر سے ہموار ہو جائے گا..

ایسا کچھ بھی نہ ہوا..اور جب نہ ہوا تو ٹیمپل روڈ پر واقع ایک معروف کلینک کی کل لاہور میں ان کاموں کے لیے شہرت رکھتی بوڑھی لیڈی ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا ''تم دونوں نے اگر جھک مارنی تھی تو پہلے دو چار ہفتوں میں کیوں نہیں آئے...اب چار ماہ کے بعد تو نارمل ابورشن نہیں ہو سکتی..سیزیرین کر کے نکالنا ہو گا..تو اتنی فیس ہو گی..''

اتنی فیس کے لیے اس کا موٹر سائیکل فروخت ہو گیا..

دبلی پتلی لڑکی جو اب اتنی دبلی پتلی نہ رہی تھی' اس نے پتہ نہیں کیسے کیسے بہانے تراش کر سرگودھا کے چک سے جتنی رقم منگا سکتی تھی..منگائی..

تب جا کر ایک ایسی دوپہر آئی جب وہ دو گھنٹے کے بعد کلینک سے نکلی تو اس کا چہرہ ہلدی سے بھی زیادہ زرد اور پژمردہ تھا اور وہ چل نہیں سکتی تھی...

انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ ان کی ذات..الگ الگ تھی..وہ اس مجبوری کے تحت بھی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے...انہیں ایک دوسرے کے ساتھ عشق وغیرہ بھی نہ تھا..محض ناتجربہ کاری کے ہاتھوں مارے گئے تھے..

انہوں نے اس وقوعہ کے بعد بہت کم آپس میں ربط رکھا' ڈرتے تھے ایک دوسرے کی

آواز سے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ہماری آوازیں مل کر پھر وہی نتیجہ نہ برآمد کر دیں..

ایم بی اے مکمل کر کے وہ امریکہ چلا گیا..سینٹ ویلنٹائن ڈے تھا' جب اس نے..بس اس کا جی چاہا..اور اس نے اسے ایک کارڈ روانہ کر دیا ''کیا میں اب بھی تمہیں یاد آتا ہوں''

اور اس نے اپنے نام کے بغیر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ بھیجا تھا ''میرے پیٹ پر ایک ساڑھے پانچ انچ کا نشان تمہیں یاد رکھنے کے لیے کافی ہے۔''

اس کی شادی ایک ایسے زمیندار سے ہو گئی جو مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے پیٹوں کو جانتا تھا..بہت دنوں اس نے روشنی میں اسے اپنا آپ دیکھنے نہ دیا اور ایک شب جب اس نے اس نشان کو محسوس کیا تو فوراً ٹیبل لیمپ آن کر کے ہاتھ کے نیچے آئی ہوئی پیٹ کی کھردری سطح کو دیکھا ''یہ کس کا تھا جسے تم نے ضائع کر دیا..مجھے احمق سمجھتی ہو..''

شادی کے چند ہفتوں بعد اس نے اپنی مرضی سے یا خاوند کے کہنے پر خودکشی کر لی تھی..

اپنے ساڑھے پانچ انچ لمبے نشان کے ساتھ!

ہر شخص زندگی میں کوئی نہ کوئی جرم کرتا ہے..

یہ جرم جان بوجھ کر نہیں کیا جاتا..بہت دیر بعد احساس ہوتا ہے کہ جرم ہو گیا ہے..تو وادیٔ شگر سے پار..خوبانیوں کے بوجھ سے حاملہ درخت سے آگے..ایک پرشور برفانی نالے کے دوسری جانب..ڈاکیا چلا آتا ہے اور اس کے چرمی بیگ میں ایک ساڑھے پانچ انچ لمبے نشان کا بھی تو ایک خط اس کے نام ہو سکتا ہے جو اس نے خودکشی سے پہلے لکھا تھا...

میں نے ایک اور شدید حماقت کی ہے..

ایک حماقت تو میں نے ایک ایسا ناول شروع کر کے کی ہے جو ناول نہیں ہے اور دوسری حماقت یہ سرزد ہوئی ہے.. جب کہ جو کچھ ابھی تک لکھ چکا ہوں اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے.. مجھے اس دوسری حماقت کا احساس ہوا ہے..

یہ خیال ابھی ابھی میری کھڈی کے تانے بانے میں ایک کنکر کی مانند اٹک گیا ہے اور کھڈی کھٹ کھٹ نہیں اٹک اٹک کر کھٹک کھٹک چلتی ہے اور اٹکتی ہے.. میں نے پہلے سے ہی یہ قیاس کیوں کر لیا کہ وہ خط جو میرے نام کا آ سکتا ہے ایک لفافے میں ہی بند ہوگا.. ایک پوسٹ کارڈ کی صورت میں نہ ہوگا.. بس یہی حماقت ہوگئی ہے کہ میں ابھی تک اس خط کو ایک لفافے میں بند خیال کرتا رہا ہوں..

جب کہ یہ ایک پوسٹ کارڈ بھی ہو سکتا ہے..

اگر پوسٹ کارڈ ہو تو اس میں بہت سی آسانیاں ہو سکتی ہیں..

اسے پڑھے بغیر.. صرف دیکھ کر ہی انسان جان جاتا ہے کہ یہ زندگی کی نوید دیتا ہے یا کسی موت کی خبر.. اسے نزدیک کی عینک ناک پر جما کر پڑھنے کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی.. ایک ان پڑھ کے گھر میں بھی جب ایک پوسٹ کارڈ آتا ہے تو وہ اسے اپنی چوکھٹ سے اٹھاتے ہوئے یہ جان جاتا ہے کہ مجھ تک زندگی کے تسلسل اور سکھ چین کا سندیسہ آیا ہے یا آنے والے دن ماتم کے ہیں..

لیکن یہ تو گئے زمانوں کے.. گزر چکے زمانوں کی بات ہے.. شاید اب بھی کہیں کہیں دور افتادہ دیہات میں اُن زمانوں کے آخری سانس ہچکیاں لے رہے ہوں۔ جب ایک موت کی

اطلاع دور پار کے عزیزوں کو ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے ہی بھجوائی جاتی تھی.. ایسا پوسٹ کارڈ گاؤں کا ڈاکیا اسے ذاتی طور پر نہیں تھماتا تھا جس کے وہ نام آتا تھا بلکہ مکینوں کو اپنا چہرہ دکھائے بغیر صحن میں پھینک کر چلا جاتا تھا.. وہ جس کے نام یہ پوسٹ کارڈ آتا تھا وہ جھکتا تھا' اسے کچے فرش سے اٹھا کر پڑھے بغیر یہ جان جاتا تھا کہ یہ کسی موت کی خبر آئی ہے..

اور اس کچے صحن کے مکین جو حرف سے ناآشنائی رکھتے تھے.. ان پڑھ ہوا کرتے تھے وہ اس پوسٹ کارڈ کو فرش پر پڑا دیکھتے ہی بین کرنے لگتے تھے.. اسے پڑھے بغیر کہ وہ پڑھ نہیں سکتے تھے..

صرف دیکھتے تھے اور آہ وزاری ان کے کچے کوٹھے سے بلند ہو کر پورے گاؤں کے دروازوں پر موت کی دستک دینے لگتی تھی...

اس لیے کہ... پوسٹ کارڈ کا ایک کونہ پھٹا ہوا ہوتا تھا.. پھاڑ دیا جاتا تھا کہ یہی موت کا سندیسہ بھیجنے کا طریقہ تھا...

تو میں.. جو طے کر چکا تھا کہ کوئی سندیسہ صرف ایک لفافے میں ہی بند ہو سکتا ہے اپنے نام ایک پوسٹ کارڈ آنے پر.. اسے دیکھتے ہی یہ اطمینان کر سکتا تھا کہ اس کے چاروں کونے موجود ہیں.. اگر ایک کونہ.. عام طور پر دائیں جانب والا کونہ اگر نا موجود ہے تو مجھے اسے پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی اور میں فی الفور جان جاتا کہ یہ خبر بری ہے..

یہ کتنی بڑی آسانی ہوتی..

ہاں.. اگر ایک کونہ پھٹا ہوا ہوتا تو میں اسے دیکھ کر قطعی طور پر آہ وزاری نہ کرتا.. بین نہ کرتا.. بھلا کوئی اپنی ہی موت کی خبر پر بین کر سکتا ہے.. آہ وزاری کر سکتا ہے..

لیکن میں ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ ڈاکیے کے پاس میرے نام کا کوئی سندیسہ ہے بھی یا نہیں..

اگر ہے تو ایک لفافے کی صورت میں ہے یا کسی پوسٹ کارڈ پر میرا نام درج ہے.. اور اسے بھیجنے والا کون ہے..

بس یہی حماقت مجھ سے ہوگئی کہ لفافہ یا پوسٹ کارڈ..

اب میں جان گیا ہوں کہ ان دونوں میں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے..

بس ہوا میں گرتی گئی..

ایک پر کٹے پرندے کی مانند گرتی گئی..

بس کے مسافروں کے چہرے جیسے حنوط ہو گئے.. ٹھہر گئے انہی تاثرات میں منجمد ہو گئے جو شاہراہ پر ابھی پل دو پل پہلے ہنسنے سے.. مسکرانے سے.. بور ہونے سے یا اونگھنے سے ان کے چہروں پر آئے تھے.. ان تاثرات کو.. پھیلی ہوئی مسکراہٹ' جوانی کی جنسی خوشی اور بوریت کی لکیروں کو ابھی علم ہی نہیں ہوا تھا کہ ان پر پل دو پل میں زندگی یا موت کے دروازے کھلنے والے ہیں.. ان کے چہرے رک گئے تھے' تاثرات کی روانی میں یکدم ٹھہر گئے تھے..

بس کے اندرون کی خاموشی بے یقینی میں تھی..

ان میں سے بیشتر یورپی اور امریکی سیاح تھے جو استنبول سے تہران جانے والی اس بس میں آ بیٹھے تھے اور جب بیٹھ رہے تھے تو ان کی سفر کی خوشی اور آنے والی اجنبی بستیوں کی منتظر چلبلاہٹ کو گمان بھی نہ تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہ بس ایک سرخ ٹرک کو بچانے کے لیے باسفورس پر معلق پُل کی ایک ریلنگ سے ٹکرائے گی اور ہوا میں گرتی جائے گی' ایک پر کٹے پرندے کی مانند گرتی جائے گی..

بس کے اندرون کی خاموشی کچھ دیر بے یقینی میں ٹھہری رہی اور پھر صدمے کی شدت سے یکدم شور و غوغا میں بدل گئی۔ جتنی قومیتوں کے لوگ اس میں تہران جانے کی آس میں تھے' ان سب کی الگ الگ زبانوں میں جو آہ و بقا بلند ہوئی' اسے تو عام حالات میں بھی سمجھ جانا مشکل تھا چہ جائیکہ موت میں گرنے کے ایک لمحے میں ان کی کچھ تفہیم ہو جائے..

نیچے سمندر تھا..

وہاں آبنائے سسلی کے درمیان میں سے گزرتے ہوئے یونانی دیومالائی سمندری جہازوں کو کم از کم یہ سہولت تھی کہ وہ شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے گرداب کے درمیان چناؤ کر سکتے تھے.. یہاں صرف گہرا نیلا سمندر نیچے تھا' جس میں گر جانا تھا..

ایک یقینی موت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے سامنے پا کر اس لمحے تمہیں خدا یاد آتا ہے' پھر اپنے پیاروں کے چہرے سامنے آنے لگتے ہیں.. لیکن ایسا ہوتا نہیں' کم از کم اس کے ساتھ تو نہیں ہوا.. کچھ بھی یاد نہیں آتا.. نہ خدا.. نہ اپنے پیارے.. انسان ایک سحر زدہ سناٹے میں چلا جاتا ہے اور اس پتھریلے بے جان سکوت میں انتظار کرتا ہے..

اس انتظار کا خاتمہ سمندر میں گرنے کے شڑاپ آبی شور سے نہیں ہوا بلکہ ایک ملفوف سی دَھپ سے ہوا جیسے ایک سکائی سکریپر سے کودنے والے شخص کا وجود نیچے ساٹھویں منزل سے نیچے گر کر فٹ پاتھ پر دھپ سے گر کر فٹ پاتھ کے پتھروں کے درمیان خون بہانے لگتا ہے...

بس زمین پر گری تھی..

سمندر صرف چند میٹر کے فاصلے پر منتظر جھاگ اڑاتا تھا لیکن وہ سب ذرا دھرا گرے تھے اور بھربھری مٹی کے ایک بند پر آ گرے تھے اور یوں بس اس مٹی میں دھنس کر ٹھہر گئی..

یہ نہیں کہ بس ایک ملفوف سی دَھپ سے خاموشی سے گری تھی بلکہ زمین کے روکنے پر اس کے اندر ایک بھونچال آیا تھا اور سب کچھ اتھل پتھل ہو کر اپنے اپنے مقام سے ہٹ گیا تھا.. شکست و ریخت کے عناصر بس کے اندرون میں اڑنے لگے تھے..

ان آخری لمحوں میں اگرچہ اس نے اگلی نشست کو اس آس میں مضبوطی سے اپنے سناٹے میں آئے ہوئے ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا' دانت سختی سے بھینچ لیے تھے کہ کریش کی اس شدّت کو کسی نہ کسی طور سہہ جائے' لیکن جونہی بس کے ڈھانچے کے نیچے زمین کی دیوار آئی تو اس کی انگلیاں اگلی نشست کی پکڑ سے یوں الگ ہوئیں جیسے اس میں بجلی کا کرنٹ آ گیا ہو.. وہ اس جھٹکے کے بے مہار زور سے اپنی نشست پر سے ایک کھلونے کی مانند اوپر اٹھا' ذرا معلق ہوا اور پھر گر گیا.. اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے بدن کے کون کون سے حصے کہاں کہاں ٹکرائے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی ربط رہا بھی ہے یا نہیں..

یکدم آہ و بقا کی چیخ پکار تھم گئی.. سکوت اتر آیا جیسے ابھی حادثہ ہونے کو ہے اور پھر اذیت اور خوف کے در کھل گئے.. منہ کھل گئے اور ان میں سے حرف برآمد نہیں ہوتے تھے' محض ڈر اور

خوف کی گھگھیائی ہوئی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور ان سب کی زبان ایک تھی۔

ہر کوئی بس کے انجر پنجر ہو چکے ڈھانچے میں سے فی الفور نکل جانا چاہتا تھا' چاہے وہ کسی نشست میں پھنسا ہوا تھا' زخمی تھا یا مر چکا تھا' نکل جانا چاہتا تھا..

کسی کے تحت الشعور میں ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی ایک فلم چلتی تھی کہ ایسے حادثے کے فوراً بعد کار یا بس کو آگ لگ جاتی ہے اور اس میں سوار افراد بھسم ہو جاتے ہیں..

چند لمحوں کے مردہ اور بے یقین سناٹے کے بعد اس پر بھی انکشاف ہوا کہ اگر وہ بچ گیا ہے...زخمی نہیں ہے...ابھی مرا نہیں ہے تو ابھی یہ بس آگ کے ایک گولے میں بدل جائے گی اور وہ بھسم ہو جائے گا...

بس کا دروازہ حادثے کی شدت سے جکڑا جا چکا تھا اور سیاح مسخ شدہ کھڑکیوں اور کرچی کرچی ہو چکی ونڈ سکرین کے راستے باہر چھلانگیں لگا رہے تھے..اس کی نشست کے برابر میں جو کھڑکی تھی' بدقسمتی سے اس کا شیشہ سلامت رہا تھا..اسے اور کچھ نہ سوجھا اور اس کے ہاتھ میں اس کا اشائی پینٹکس کیمرہ آ گیا جو قدیمی ہونے کے باعث خاصا بھاری تھا..اور اسے اس نے ایک پتھر کے طور پر استعمال کیا اور کھڑکی کے شیشے پر مار کر اسے چور کر دیا..کھڑکی میں سے اپنے آپ کو باہر دھکیلتے ہوئے بچے کھچے شیشے کی نوکدار کرچیوں نے اس کے بدن سے خون آلود خراشوں کا خراج وصول کیا...اور وہ باہر اسی بھربھری مٹی پر جا گرا جس میں بس گری تھی..

وہ کچھ دیر تو وہیں ایک بوکھلائے ہوئے فاتر العقل شخص کی مانند گرا رہا.. ہانپتا رہا..خوف سے لرزتے بدن کی ہر رگ کے دھڑکنے کو محسوس کرتا رہا اور پھر اسے خیال آیا کہ اس کا سفری تھیلا' پاسپورٹ اور ٹریولر چیک تو وہیں رہ گئے تھے...وہ اگر ابھی مرا نہیں تھا تو ان کے بغیر بھی وہ زندوں سے بدتر ہو سکتا تھا..

اس نے اپنا سانس درست کیا..بس سے ذرا دور ہو کر اسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تکتا رہا کہ یہ ابھی ایک دھماکے سے شعلوں میں بدل جائے گی اور جب وہ بے جان اور بے آگ رہی تو وہ اس کھڑکی کے راستے پھر سے اندر داخل ہوا جب کہ اس کے آس پاس' وہاٹ دے فلنگ ہیل آر یو ڈوئنگ..اوئے کیا کر رہے ہو..موت کے منہ میں جا رہے ہو..کی صدائیں بلند ہوتی تھیں..اس نے نشست پر سے اپنا سفری تھیلا اٹھایا اور پھر سے باہر کود گیا..

بھربھری مٹی کے بند پر بے سُدھ پڑے..لیٹے ہوئے اور بمشکل بیٹھے ہوئے حادثے

کے صدمے میں جکڑے ہوئے سیاح کچھ بے حواس تھے اور کچھ اپنے زخم سہلا رہے تھے۔

وہ بھی ان میں سے ایک تھا..

ایک جرمن سیاح نے..اور جرمن بے حد تنظیم پسند ٹھنڈے اور کٹھور ہوتے ہیں..اپنے بیگ میں سے سکاچ وہسکی کی بوتل نکالی اور کہنے لگا ''اگرچہ میں نے یہ سکاچ بُرے موسموں کے لیے سنبھال رکھی تھی' لیکن اس سے برے موسم اور کیا ہوں گے کہ تم سب جو ابھی مرنے لگے تھے یا کچھ مر بھی گئے ہیں تو تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے..اپنے اپنے زخم ننگے کر دو کہ اس سے بہتر اینٹی سیپٹک کوئی نہیں'' وہ بند بوتل اپنے دائیں کان کے قریب لایا اور اس کے ڈھکن کو گھماتے ہوئے جو ایک ٹوٹنے کی سرگوشی ہوئی' اس سے لطف اندوز ہو کر اس کے منہ سے منہ لگا کر ایک طویل شکرانے سے لبریز گھونٹ بھرا ''کون کون امیدوار ہے؟''

یوں مٹی پر لیٹے بیٹھے اوندھے پڑے..ابھی تک صدمے میں' موت سے بچ نکلنے کی بے یقینی میں..دوسرے سیاحوں کی پیروی میں..اس نے بمشکل اپنی تنگ نیلی جین کے پائینچے چڑھا کر اپنے زخموں کو عیاں کیا..دونوں ٹانگوں پر..گھٹنوں سے نیچے پنڈلیوں پر زخم تھے..کہیں خون تھا اور کہیں مردہ نیلاہٹ..بقیہ بدن پر خراشیں اذیت کی لکیریں کھینچتی تھیں..وہسکی کے چھینٹے پڑے تو وہ درد سے دوہرا ہو گیا..الکوحل تیزاب کی مانند زخموں اور خراشوں کو جیسے زندہ جلانے لگا..

ایک امریکی لڑکی نے ایک اور سیاح خاتون کی مدد سے اپنا خون آلود بلاؤز کھولا تو اس کی چھاتیاں جیسے ذبح ہو چکی تھی..کسی نے بھی اس کی مدھر چھاتیوں کو کو ان نظروں سے نہ دیکھا جو مردوں کی حریص نظریں ہوتی ہیں بلکہ ان میں شدید ہمدردی اور دوستی کا رچاؤ تھا..جرمن نے ان پر وہسکی کا چھڑکاؤ کیا تو لڑکی تڑپنے لگی..مٹی پر لوٹنے لگی..

صرف ایک سیاح ایسا تھا جس کی جانب کوئی توجہ نہ کرتا تھا..کیونکہ اسے کسی اینٹی سیپٹک کی ضرورت نہ تھی..وہ مر چکا تھا اور اس کی ساتھی لڑکی اپنے حواس کھو چکی تھی اور جرمن زبان میں جانے کس کو پکار رہی تھی..

تھوڑی دیر بعد ایک ایمبولینس کے سائرن سنائی دینے لگے..

پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں..

اب جو ترک سپاہی آئے وہ اس امریکی لڑکی کی خون آلود چھاتیوں کو انہی نظروں سے دیکھ رہے تھے جو کہ مردوں کی ہوتی ہیں کیونکہ اس نے انہیں ڈھکا نہیں تھا..

پولیس والوں کے لیے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ زخمی مسافروں میں کوئی ترک نہ تھا.. اور یہ جو غیر ملکی تھے' اگر سمندر میں ڈوب جاتے یا سب کے سب مر جاتے تو بھی وہ سوگوار نہ ہوتے..اس شام تیز ترک وائن سے حسب معمول لطف اندوز ہوتے..وہ قطعی طور پر ہمدرد نہ تھے بلکہ اس پوری صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے..اور سیاح خواتین کے بارے میں ریمارکس کس رہے تھے..

کچھ لوگ بس کے ڈھانچے کو ایک کلہاڑے کی مدد سے کاٹنے کی کوشش میں تھے..

''کیا ہوا ہے؟''

''ڈرائیور کی نشست کے عین پیچھے جو اطالوی لڑکا بیٹھا ہوا تھا' اس کا بدن سٹیئرنگ میں پرویا گیا ہے اسے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں..وہ ابھی تک سانس لے رہا ہے..''

''کیا؟'' وہ حواس باختہ سا ہو گیا..

اسے فرانسسکو کا خیال ہی نہ رہا تھا..موت کے ڈر اور زخموں کی اذیت نے وہ پوری دوپہر فراموش کر دی تھی جو اس نے اس اطالوی کے ہمراہ شہزادوں کے جزیرے کی ایک ڈھلوان پر لیٹے ایک خمار آلود کیفیت میں نیچے نیلے سمندر میں تیرتے سفید بادبانوں کو دیکھنے میں گزاری تھی..

وہیں فرانسسکو نے اسے بتایا تھا کہ میرے والدین بے حد وہمی ہیں..شگونوں پر یقین رکھتے ہیں اور وہ مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیتے تھے..بھلا مجھے کیا ہونا ہے..ہزاروں نوجوان سیاحت کے لیے گھر سے نکلتے ہیں..انہیں کیا ہوتا ہے..لیکن اسے..فرانسسکو کو وہ ہو گیا تھا اور سٹیئرنگ اس کی پسلیوں میں پرویا گیا تھا..

سفر کے آغاز میں وہ اپنی نشست..ڈرائیور کے عین پیچھے والی نشست سے کھڑا ہوا تھا اور اسے ہاتھ ہلا کر خوش دلی سے کہا تھا..یہ بس ذرا شہر سے نکل لے تو میں تمہارے پاس آ بیٹھوں گا..

اس ڈھلوان پر لیٹے جب وہ محویت سے سمندر میں تصویر ہوتی سفید بادبان والی ایک کشتی تکتا تھا تو اس نے پوچھا تھا کہ فرانسسکو کیا دیکھ رہے ہو؟..تو اس نے کہا تھا.''زندگی..زندگی کتنی خوبصورت ہے'' اور اب وہ سٹیئرنگ کی پلاسٹک کی سلاخوں میں پرویا ہوا تڑپ رہا تھا..زندگی!

وہ اس ''زندگی'' کا سامنا کرنے سے گریزاں تھا اور اس جانب دیکھنے سے گریزاں تھا' جہاں کچھ لوگ فرانسسکو کو سٹیئرنگ سے آزاد کرنے کی سعی کر رہے تھے..

مٹی کے بند کی ڈھلوان پر جو سیاح مردہ پڑا تھا..ڈھلوان کی وجہ سے لگتا تھا کہ وہ ابھی کھڑا ہو جائے گا..وہ اب تنہا تھا کیونکہ اس کی ساتھی لڑکی اس کی موت سے سمجھوتہ کر کے اس سے کچھ دور بیٹھی اپنے زخم سہلا رہی تھی..

اس نے دل کڑا کر کے..فرانسسکو کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر اٹھنے کی کوشش کی تو گر گیا..خراشیں اور زخم ٹھنڈے ہو رہے تھے..خون جم گیا تھا..بدن اکڑ گیا تھا اور اٹھنا ممکن نظر نہ آتا تھا..اس کے پاؤں جیسے جوگرز کی سلائیاں ادھیڑ کر تسمے توڑ کر باہر آنے کو تھے کہ وہ حادثے کی شدت سے خمیرے آٹے کی مانند سوج چکے تھے....اب اسے ترکی ایران اور افغانستان کی سرزمینوں پر تقریباً ننگے پاؤں چلنا تھا..انہیں کوڑھ کے مریضوں کی مانند پٹیوں میں لپیٹ کر چلنا تھا کہ ان کی سوجن کے باعث وہ کسی جوگر یا بوٹ میں سما نہیں سکتے تھے..

اور شام ہو رہی تھی..

اپنے گھر سے..وطن سے دور ایک اجنبی دیار میں..

اور یہ کوئی تسلی نہ تھی کہ اس دیار کے لوگ اس کے ہم مذہب ہیں..

تسلی صرف اپنی دھرتی کے سینے کے ساتھ لگ کر ہوتی ہے..بے شک اس دھرتی کا مذہب تمہارے مذہب سے جدا ہو..وہ ایک پاکستانی عیسائی بابا جی کو جانتا تھا جو امریکہ میں قیام پذیر تھے' لیکن انہوں نے وصیت کی کہ اگر میں مر جاؤں تو مجھے گوروں کے اس دیس میں نہیں اپنے پنجاب کے اس گاؤں میں دفن کیا جائے' جہاں میں پیدا ہوا تھا..اور ایسا ہی ہوا..

اور شام ہو چکی تھی..

ان کے اوپر باسفورس کے نئے پل پر سے گزرتی رینگتی بے شمار ٹریفک کی بے شمار لائٹس حرکت کر رہی تھیں اور وہ نہیں جانتی تھیں کہ نیچے ایک بھربھری مٹی کے بند پر ایک تباہ شدہ بس کے ڈھانچے کے آس پاس چالیس پچاس غیر ملکی سیاح کیسے اپنے اپنے وطن کو..اور ماؤں کو یاد کرتے بے آسرا اور زخموں سے بھرے پڑے ہیں..بے شک ان میں ان کا ایک ہم مذہب بھی کراہ رہا ہے..

سٹریچر اس کے قریب سے گزر گیا..

سٹریچر پر فرانسسکو کا خون آلود بدن بھاری ہو رہا تھا..اس کے بازو سٹریچر سے لٹکے ہوئے تھے..اور برابر میں اس کا اطالوی ہم سفر اسے پھٹی پھٹی نظروں سے تکتا اس سے باتیں کرتا

جاتا تھا جو..فرانسسکو تو نہیں سن رہا تھا کہ اس کا سینہ چاک تھا..

جونہی وہ سٹریچر اس سے دور ہوا تو اسے یاد آیا کہ اس فرانسسکو نے اپنا رُک سیک اس کے حوالے کیا تھا کہ آگے ڈرائیور کی نشست کے پیچھے اس کے لیے جگہ نہیں ہے..تم رکھ لو..تہران پہنچ کر تم سے وصول کرلوں گا..اور وہ رک سیک ابھی تک وہیں تھا..بس کے اندر!

اس نے اپنے اکڑے ہوئے بدن پر بوجھ ڈالتے ہوئے جھک کر جوگرز کے اب اذیت دیتے ہوئے تسموں کو کھولا..اپنے سُوجے ہوئے پاؤں کو آزاد کیا اور لڑکھڑاتا ہوا اٹھا..اب تک یہ تو طے ہو چکا تھا کہ بس کا تباہ شدہ ڈھانچہ آگ نہیں پکڑے گا..اس لیے دوبارہ اس کے اندر جانے میں کوئی قباحت نہ تھی..اس کے سُوجے ہوئے پاؤں اس کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہوتے تھے اور اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اٹھا اور بس کے اندر جا کر فرانسسکو کا رُک سیک اٹھا لایا..وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ رُک سیک اب کس کے حوالے کرنا چاہیے..زندگی!

پولیس نے انہیں بھیڑوں کی مانند دھکیل کر ایک ٹرک میں سوار کیا اور ایک عجیب ویرانی میں سے سفر کرتے..جہاں روشنیاں بہت کم تھیں..اندھیرے راستے تھے..کہیں شائبہ نہ ہوتا تھا کہ یہ مشرق کا روم استنبول ہے۔ایک نیم تاریک پولیس سٹیشن میں لے گئی..جہاں پر کارروائی ہونی تھی..حادثے کا شکار سیاحوں نے کچھ سرکاری کاغذات پر دستخط کرنے تھے..بیان دینے تھے..اگرچہ وہ دستخط کرنے یا بیان دینے کی حالت میں ہرگز نہ تھے..کہ وہ سب کے سب بے حد بھوکے پیاسے ہو چکے تھے اور زخمی تھے..وہاں اس ٹرک میں سے جب ان بھیڑوں کو نکال کر نیم تاریک پولیس سٹیشن میں انڈیل دیا گیا' تب معلوم ہوا کہ جس نے ان سے دستخط کروانے ہیں..بیان ریکارڈ کرنے ہیں' وہ پولیس افسر ابھی وہاں موجود نہ تھا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کے ختنے آج ہو رہے تھے اور وہ اس رسم سے فراغت کے بعد ہی ادھر آئے گا..

چنانچہ وہ سب..اس تھانے سے باہر کھلی جگہ پر آ کر ادھر ادھر بیٹھ گئے..

کچھ نڈھال ہو کر لیٹ گئے..اور کچھ رونے لگے..ہاں بلکتے ہوئے رونے لگے اور کچھ گانے لگے..

حادثے نے ان سب کو ایک برادری بنا دیا تھا..

عارضی طور پر رنگ' نسل' قومیت کا فرق مٹ گیا تھا..

سب ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے تھے..ڈھارس بندھاتے تھے..ٹھنڈے ہو چکے

زخموں کے اکڑاؤ کو سہتے پوچھتے تھے..آر یو آل رائٹ..تم ٹھیک ہو..زیادہ چوٹ تو نہیں آئی..اگرچہ خود زخموں سے کراہتے تھے..

جنہیں بہت چوٹیں آئی تھیں..ابھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہڈیوں کی کیا کیفیت ہے..شاید کچھ ٹوٹ چکی ہیں' وہ بھی اپنے زخموں سے بے نیاز پوچھتے تھے..آر یو آل رائٹ..کین آئی ہیلپ یو..؟اور پھر جس کے سفری تھیلے میں کھانے پینے کا جو بھی سامان تھا باہر آ گیا..

سوس ٹابلر چاکلیٹ کون کھائے گا..؟کون کھائے گا..

چکن سینڈوچ..ڈبل روٹی..پنیر..دودھ اور بیئر کے ڈبے..وائن کی بوتلیں..اور ٹین بند خوراکوں اور سوپوں کے ڈھیر..چولہے گرم ہو گئے..اور ایک اوپن ایئر پکنک شروع ہو گئی..کراہتے..کبھی تاب نہ لا کر چلا اٹھتے..کبھی بے دم ہو کر گر بھی جاتے..سیاحوں کے لیے ایک پکنک کا اہتمام ہو گیا..ہر ایک کی پوری اور پرخلوص کوشش تھی کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ خود استعمال نہ کرے بلکہ دوسروں کے کام آئے..

بازنطائن' قسطنطنیہ' کانسٹن ٹنوپل' استنبول' سات پہاڑیوں پر آباد دوسرا روم..کانسٹنٹائن اور سلطان محمد کا شہر جہاں مسلمانوں نے عیسائیوں کے چاند کو اپنے لیے منتخب کر کے اسے اپنا نشان بنا لیا..ڈھلوانوں پر شہر کی روشنیاں اترتی سمندر تک جاتی تھیں..

رات بیت رہی تھی..

پکنک کا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا اور زخم ٹھنڈے ہو کر دراڑیں بنتے تھے اور ان کی ٹیسیں برداشت سے باہر ہوتی تھیں..

لگتا تھا کہ اس کے پاؤں بھی سُوج سُوج کر اتنے بڑے اور بھاری ہو جائیں گے جیسے ان کے ساتھ چکی کے پاٹ بندھے ہوں..

اور وہ اس پولیس افسر کے منتظر تھے جس نے ان کا بیان ریکارڈ کر کے انہیں آزاد کرنا تھا..

اور وہ آ ہی نہیں پا رہا تھا..

جن کے گھر قدرے قریب تھے..جرمنی' اطالیہ یا انگلستان میں تھے' وہ بقیہ سفر کا ارادہ ترک کر کے اپنے اپنے وطن یہیں سے لوٹ جانے کا سوچ رہے تھے..انہوں نے خواہش کے تمام دریاؤں' صحراؤں اور پہاڑوں کو ترک کر دیا تھا..وہ اپنے گھروں کی عافیت میں پہنچ کر دبک جانا

چاہتے تھے..لیکن اس سفر کو جاری رکھنا چاہے ہر روز ایک حادثہ ہو جائے اس کی مجبوری تھی کہ اس کا گھر کہیں آس پاس نہ تھا بہت دور تھا..سُوجے ہوئے پاؤں کے ساتھ بے شک پیدل چل کر اسے تو اپنے گھر پہنچنا تھا..

البتہ امریکی سیاح تذبذب میں تھے' ان کا گھر اس کے گھر سے بھی کہیں دور رہ گیا تھا..

ایک امریکی سیاح جس کے بال شانوں پر آتے تھے اور اس نے ناک میں سونے کا ایک چھلا جھلایا ہوا تھا' اس تاریک اور مرگ آور ماحول میں بھی نچلا نہیں بیٹھتا تھا..مسلسل باتیں کرتا جا رہا تھا..ہے گائز ہم کسی تدفین پر تو اکٹھے نہیں ہوئے تو اتنے سنجیدہ چہرے کیوں..تمہیں تو پرمسرت ہو کر یاہو یاہو کے نعرے لگانے چاہئیں کہ تم اور ہم سب زندہ بچ گئے ہیں..ہم زندہ ہیں ڈیم اِٹ..سانس لیتے ہیں..مردہ نہیں ہیں تو اتنی سوگواری کیوں..

کسی نے اسے فرانسسکو کے بارے میں بتایا..اس جرمن کے بارے میں بتایا جس کی لاش کسی ہسپتال کے مردہ خانے میں پڑی تھی..

''تو پھر کیا ہوا..اگر وہ مر گئے ہیں..تو وہ مر گئے ہیں..ہم تو نہیں مرے..چلو اس زندگی کے انعام کا جشن مناتے ہیں..'' اس نے اپنی گٹار کو کیس میں سے باہر نکالا اور اس کی تاروں کو چھیڑنے لگا..کنٹری میوزک کی کوئی دُھن بجانے لگا اور گانے لگا..

سبھی چپ رہے..کچھ نہ بولے..سنتے رہے..

وہ اپنی گٹار پر جھکا گانے میں مگن رہا..اور پھر یکدم اپنی جین کے درمیان میں ہاتھ مار کر بولا..''ہے..میں پچھلے چھ گھنٹوں سے ہر شے روکے ہوئے ہوں..ٹائلٹ نہیں گیا اور دیٹس اے ریکارڈ..میں ذرا اپنے آپ کو ہلکا کر آؤں..کوئی میرے ساتھ آئے گا..؟ نہیں؟ تو پھر مجھے معاف کیجیے گا..''

وہ اس گروہ سے الگ ہو کر تاریکی میں چلا گیا..واپس آیا تو ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا..

وہ بہت دیر تک خود ہی ہنستا رہا اور کسی نے بھی یہ نہ پوچھا کہ اس طرح کیوں ہنسے جا رہے ہو..ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو تا دیر چپ رہنے کے بعد یکدم قہقہے لگانے لگتے تھے اور پھر چپ ہو جاتے تھے' تو یہ صورت حال انوکھی نہ تھی..اس لیے اس سے کسی نے کچھ نہ پوچھا..

''ہے گائز..سنو..میرے پاس ایک خبر ہے..'' اس نے سب کو متوجہ کیا..''میں ابھی اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے لیے ادھر تاریکی میں گیا..ذرا دور گیا تو پتہ ہے میں نے وہاں کیا دیکھا..تم

سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں نے کیا دیکھا..بھلا میں نے کیا دیکھا..'' وہ چپ ہو گیا کہ شاید کوئی تو پوچھے گا کہ کیا دیکھا لیکن جب کسی نے نہ پوچھا تو اسی عالم سرخوشی میں ہنستا ہوا بولا''وہاں اس تاریکی سے پرے ایک بہت بڑا اور قدیم ترک قبرستان ہے..ہزاروں قبریں ہیں اور سب کی سب بلڈی ٹرکس کی..اور تم ایک قبر کو دور سے دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ یہ ایک مرد کی ہے یا عورت کی..مردوں کی قبروں پر پتھر کی پگڑیاں ہیں اور عورتوں کے سرہانے پتھریلے پھول ہیں..میرا خیال ہے یہ ایک زبردست اور انوکھی رسم ہے..ہمیں بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے امریکہ میں..وہاں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس قبر میں کون ہے..ہم تو ترکوں کی مانند پگڑیاں نہیں پہنتے تو ہم ان پر ہیٹ ہی سجا سکتے ہیں اور عورتوں کی قبروں کے لیے..یہی پھول مناسب رہیں گے..کیا خیال ہے..؟''

کسی نے کچھ نہ کہا..

''لیکن سرپرائز تو ابھی باقی ہے..میں نے جب اس قبرستان کو دیکھا تو سوچا کہ اگر آج ہم سب مر جاتے تو یہی قبرستان ہم جیسے غیر ملکیوں سے لبریز ہو جاتا..دیٹ گریو یارڈ وُڈ ہیو بین فُل آف بلڈی فارنرز..ذرا سوچو کہ یہ کتنی مزاحیہ بات ہوتی کہ اس میں دفن ترک اتنے غیر ملکیوں اور غیر مذہب کے لوگوں کی آمد سے کتنے بے آرام ہوتے..''

واقعی وہ قبرستان بلڈی فارنرز سے فُل ہو جاتا..لیکن کم از کم ایک فارنر کی آمد سے..کہ وہ بھی ان کا ہم مذہب تھا..وہ بے آرام نہ ہوتے..

''گائز..'' امریکی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا..''ذرا سوچو ہم وہاں اس لمحے دفن ہو رہے ہوتے..اگر نہیں ہوئے تو ہم خوش نصیب ہیں تو اتنی سوگواری کیوں؟''

بہت غور سے دیکھنے پر..پولیس سٹیشن کے باہر اس ویرانے میں جہاں وہ بیٹھے تھے' اس سے پرے تاریکی میں قبروں کے شائبے استنبول کی اس بے مہر رات میں دکھائی پڑتے تھے...امریکی درست کہہ رہا تھا..جائے حادثہ سے قریب ترین یہی قبرستان تھا..اور اگر وہ لاوارث لاشیں ہوتے جو کہ وہ ہو جاتے کہ یہاں کون ان کا وارث تھا تو اسی قبرستان میں انہیں جگہ ملتی..اور کسی کو ملتی یا نہ ملتی..کم از کم اسے مل جاتی کہ وہ پورے گروپ میں واحد اسلامی بھائی تھا..بقیہ حضرات اپنے اپنے عقیدے کے قبرستان میں جا کر آرام کرتے..استنبول میں عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے بھی مناسب بندوبست تھا..

''ہے گائز..'' وہ امریکی باز نہیں آتا تھا..بولتا چلا جاتا تھا''کم آن...وو ئی آر ناٹ

ڈیڈ..ووئی آر الائیو اینڈ کِکنگ..اور اگر تم موت کا کوئی گیت ہی سننا چاہتے ہو تو وہ بھی میں سنا سکتا ہوں..میں تم کو ٹام ڈولی کی پھانسی کا گیت سنا دیتا ہوں..''

''ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈولی.. ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ اینڈ کرائی..

کاز ٹومارو یو آر گوئنگ ٹو ڈائی..''

ٹام ڈولی اپنا سر جھکا لو..اور سر جھکا کر رونے لگو..کہ کل سویرے تمہیں پھانسی پر چڑھ جانا ہے..

اگرچہ یہ امریکی کنٹری میوزک کا ایک بہت ہی المناک گیت تھا' لیکن وہ امریکی اسے جھوم جھوم کر..خوش ہوتے..مسکراتے ہوئے گائے چلا جا رہا تھا..

کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور پھر وہ امریکی لڑکی جس کی چھاتیاں زخموں سے چھلنی تھیں اور وہ ان کی اذیت میں مبتلا دوہری ہوتی جاتی تھی' سر اٹھا کر ایک رندھی ہوئی آواز میں اس کا ساتھ دینے لگی.. ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈولی..آہستہ آہستہ جیسے خوابیدہ لوگ بیدار ہوتے ہیں.. بقیہ سیاح بھی..جو انگریزی جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے وہ بھی ان دونوں کی آواز میں آواز ملانے لگے..

ٹام ڈُولی..ٹام ڈُولی..تم نے کل صبح پھانسی پر جھول جانا ہے..

یہ ٹام ڈولی کسی اور ثقافت کی نمائندگی کرتا تھا..وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا اور کیوں پھانسی لگایا گیا اور اس کے بارے میں یہ لوک گیت کیوں لکھا گیا لیکن اس کے باوجود وہ بھی ان میں شامل ہو کر ٹام ڈولی ٹام ڈولی الاپنے لگا..

موت کے اس گیت نے حیرت انگیز طور پر سب لوگوں کو حادثے کے صدمے سے نکال کر نارمل کر دیا..وہ جرمن سیاح جس نے وہسکی کی ایک بوتل بُرے وقتوں کے لیے سنبھال رکھی تھی اور اسے بے دریغ ان کے زخموں پر چھڑک رہا تھا' اٹھا اور اسی بوتل کو منہ لگا کر ایک طویل طمانیت کا گھونٹ بھر کر کہنے لگا..''ابھی اس میں کچھ سکاچ باقی ہے اور یہ صرف بدن کے ہی نہیں روح کے زخموں کو بھی مندمل کرتی ہے..اور آپ سب اس میں سے اپنا اپنا حصہ لے سکتے ہیں..کون امیدوار ہے..؟''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ ایک عجیب سوگوار مے خانہ کھل گیا...

تقریباً ہر ایک کے پاس..اُس کے سوا..برے وقتوں کے لیے کچھ نہ کچھ موجود تھا..اور

اس سے بُرے وقت اور کیا ہو سکتے تھے..

اس سوگوار مے خانے میں جتنے بھی شرابی تھے' ان کے لیے محض ایک ایک گھونٹ ہی کافی تھا..نشہ شراب کی مقدار پر نہیں موقوف..

فرانسسکو کے بارے میں بھی اطلاع آ چکی تھی کہ اس کی حیات منقطع ہونے سے بچ گئی ہے..

رات آدھی ہو گئی..

لیکن اب کسے پروا تھی..زخم بھول گئے تھے..وہ اپنے سُوجے ہوئے پاؤں اور خون آلود خراشیں فراموش کر چکا تھا..نہ وہ اس مردہ جرمن کے بارے میں سوگوار تھے کہ یہاں ایک نامانوس پولیس سٹیشن کے باہر تاریک ویرانے میں..جانے کون سے مقام پر..استنبول میں..ایک قدیمی قبرستان کے کنارے چالیس کے لگ بھگ غیر ملکی تھے..اپنے گھروں سے کہیں دور اور گلے پھاڑ پھاڑ کر گائے چلے جا رہے تھے''ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈولی..ٹام ڈولی..ٹام..ڈولی..''

ڈبل روٹی اور پنیر کھا رہے تھے..چاکلیٹ ہڑپ کر رہے تھے اور خود فراموشی کی منزلوں پر تھے..جب پولیس سٹیشن کی جانب سے ایک باوردی ترک نمودار ہوا..یہ وہی پولیس افسر تھا جس نے ان کے بیان لینے تھے..اس نے شدید حیرت میں اپنے سامنے غیر ملکیوں کے اس گروہ کو غل غپاڑہ کرتے دیکھا اور یقین نہ کر سکا کہ ابھی اسی شام یہی لوگ تھے جن کی بس فضا میں اڑتی باسفورس کے کناروں پر جا کر ریش ہوئی تھی..یہ سب زخمی اور لاچار ہیں..ان کا ایک ساتھی مر چکا ہے..ایک اور ساتھی ہسپتال میں ٹوٹی ہوئی پسلیوں کے ساتھ بے ہوش پڑا ہے اور پھر بھی یہ کوئی جشن منا رہے ہیں..ان میں سے ایک جو گٹار بجا رہا تھا' قہقہے لگاتا اس کے قریب آیا اور منہ پھاڑ کر کہنے لگا''ہیلو..ٹام ڈولی..''

پرے ایک قدیم قبرستان پھیلا ہوا تھا..اور اگر اس میں کوئی جگہ باقی تھی تو وہ اس لمحے بلڈی فارنرز کی لاشوں سے پُر ہوتا..

وہاں زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا بھی تھا جو اس کے حصے میں آ سکتا تھا..

اس کی قبر بن سکتا تھا..اور نہ بنا..

یہ خط اس خالی زمین کا بھی ہو سکتا تھا کہ میں تمہاری منتظر رہی تم کیوں مجھ میں دفن نہ

ہوئے..تمہارے سُوجے ہوئے پاؤں کے لیے مجھ میں بہت گنجائش ہوتی..

ہوسکتا ہے وہ قبر..استنبول کے اس قدیمی قبرستان میں ایک مدت تک اس کے انتظار میں رہی اور اب جا کر وہ بے صبر ہوئی اور اس نے یہ خط لکھا ہو کہ آ جاؤ..میں اب بھی تمہارے انتظار میں خالی پڑی ہوں..

اس قبر کا خط اگر ہے تو یقیناً ترکی زبان میں ہوگا..اور من ترکی نمی دانم!

گاؤں کی سردیوں کی ایک اور رات ہے..

جولاہوں کا کچا صحن..برنے کا پیڑ اور اس سے ملحقہ مسجد کے مینار وہی ہیں..

فرش پر چوکڑیاں مار کر بیٹھے ہوئے جولاہے..میراثی..ترکھان..لوہار..جاٹ..وغیرہ بھی وہی ہیں..

لیکن..یہ رات اور ہے..

آج رات برنے کے پیڑ سے بندھے رسّے کے ساتھ نورا ماچھی یا دینا تیلی نہیں جھول رہا بلکہ وہ جولاہا حال کھیل رہا ہے جو اندھیری کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے ایک ایسا کھیس بننے کی سعی کر رہا تھا' جس کے سارے دھاگے الجھے ہوئے ہیں..

آج وہ جھول رہا ہے..

یہ نہیں کہ وہ اپنی کھڈی کو چھوڑ کر ادھر آ جھولا ہے..نہیں' کھیس کی بُنت بھی جاری ہے اور رسّے سے الٹا لٹکے جھولنا بھی جاری ہے..

اس کے بدن کو اب کوئی بھی نہیں جُھلا رہا' اس میں بھی دس بیلوں کا زور آ چکا ہے اور اس کی ناک برنے کے پتوں کو چھوتی آسمان کو اپنے بدن میں اتارتی ہے..

فرش پر چوکڑیاں مار کر بیٹھے کمبلوں اور کھیسوں کی بکلوں میں سے صرف جن کے سر دکھائی دیتے ہیں' وہ سارے لوگ اور وہ ایک بچہ بھی چوری چھپے یہاں آیا ہے..یہ سب کے سب اسے فراموش کر چکے ہیں..جسے انہوں نے رسّے سے باندھا تھا اور قوالوں کے سُروں کے ساتھ سُر ہلاتے ہیں..یوہ ماگ کی اس ایک سرد رات میں بھول چکے ہیں کہ ان پر سایہ فگن ایک برنے کا شجر ہے جس کی ڈال سے بندھے رسّے کے ساتھ وہ جولاہا اپنے زور میں جھومتا چلا جا رہا ہے..

البتہ بہت سوں کے ذہن میں ایک سوال کلبلاتا ہے کہ نُورے ماچھی یا دینے تیلی کو رسّے سے باندھنا تو ہمیں یاد پڑتا ہے' اس جولاہے کو ہم نے کب باندھا تھا.. یہ کچھ یاد نہیں آ رہا.. یا ہم قوالی میں غافل تھے اور اسے کوئی اور باندھ گیا.. ہم نے ہی اس کے پاؤں کو باندھا ہوگا' اس کی تڑپ کے آزار کو کم کرنے کے لیے اور ہمیں یاد نہیں آ رہا ورنہ یہ اپنے آپ کو تو الٹا نہیں باندھ سکتا..

چنانچہ اب دو فریق ہیں..

ایک زمین پر.. کچے فرش میں سرایت کرتی ہوئی بخ کو اپنی پیٹھ کی کاٹھی پر محسوس کرتے' پہلو بدلتے.. قوالوں کے شعروں کو نہ سمجھتے ہوئے بھی.. جھومتے.. مارا بہ غمزہ کشت و قضارا بہانہ ساز.. دعارا بہانہ ساز.. بہانہ ساز... نہ سمجھتے ہوئے بھی.. جھومتے..

اور دوسرا فریق ان کے سروں کے عین اوپر برنے کی ڈال سے بندھے رسّے کے ساتھ ہلارے لیتا.. موج کرتا..

اور دونوں ایک دوسرے کی غفلت کے مارے ہوئے..

وہ.. قضارا بہانہ ساز میں مست.. اور وہ اپنے 'ہلارے میں گم..

جولاہا ایک گُجری.. ایک تنے بدن کی لشکتی جِلد والی.. جیسی جِلد ایک بدخشانی گھوڑے کی ہوتی ہے ویسی جِلد کی گُجری کی طرح اپنی وحشت اور جنسی بے اختیاری میں خود ہی زور لگاتا.. اپنی دیوانگی کی سرمستی میں خود ہی ٹانگیں سمیٹ کر.. اپنے سر سے اپنے ہی پاؤں کو جا چھوتا برنے کی بلندیاں تک چلا جا رہا تھا.. پھر واپس آ رہا تھا اور پھر ٹانگیں سمیٹ کر اپنے آپ زور لگاتا اوپر شاخوں تک جا پہنچتا تھا..

جولاہے کو خود بھی یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس رسّے کے ساتھ اس کے پاؤں کس نے باندھے تھے..

اگرچہ اس کے پاؤں بندھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کھڈی کے پیڈل کو دباتے تھے.. تانا پیٹا کھلتا تھا اور اس میں سے نال گزرتی تھی.. کھٹ کی آواز اور کھیس کی بُنت میں ایک اور دھاگے کی بُنت کا اضافہ ہو جاتا تھا..

اگر اس لمحے کوئی اس کی اندھیری کچی کوٹھڑی میں جھانکتا تو وہ وہاں تھا..

اور جو اس سے غافل ہو چکے تھے ان میں سے کوئی نظر اٹھا کر اوپر برنے کو دیکھتا تو وہ وہاں بھی تھا..

وہ بھی شاہ حسین کی مانند ذات جولاہے کی رکھتا تھا...

''فقیر حسین جلاہا..

نہ اس مول نہ لاہا..

نہ گھر باری.. ناں اوہ مسافر..

جو آہا سو آہا..!

یا پھر جو بھی عشق آتش میں بھسم ہوتا ہے وہ جولاہا ہو جاتا ہے..

ازل سے جیسے ڈاکیا ایک ہے.. جس پوسٹ ماسٹر نے اسے روانہ کیا ہے' وہ ایک ہے ایسے ہی برنے کا پیڑ بھی ایک ہے اور اس کی ڈال سے بندھا رسہ بھی وہی ہے البتہ اس کے ساتھ جھولنے والے بدل جاتے ہیں..

کیفیت وہی رہتی ہے لیکن جھولنے کے انداز بدل جاتے ہیں..

کبھی نامہ بر اور قاصد کا انتظار ہوا کرتا تھا' اس کے آنے سے پیشتر ہی یہ جان لیا جاتا تھا کہ وہ کیا لکھیں گے جواب میں اور ایک اور خط لکھ لیا جاتا تھا.. سیّاں جی کے نام چٹھی لکھی جاتی تھی اور اکثر لکھوائی جاتی تھی..

زمانے بدل گئے تھے!

قاصد.. نامہ بر اور چٹھیاں متروک ہو گئی تھیں.. جیسے زمانوں کے بدلنے سے خدا متروک ہو جاتے ہیں' ایسے وہ دور بھی ماضی کی گپھا میں گم ہوا اور ان کی جگہ براہ راست صوت و آواز وصیلۂ وصل و جدائی ٹھہرے... کمپیوٹر پر ای میل اور واٹس چیٹ سے رابطے ہونے لگے.. ٹیلی فون نامہ بر ہو گیا..

زمانے بہت بدل گئے.. وقت بہت گزر گئے.. پوشاکیں.. رہائش گاہیں اور مذہب اور کے اور ہو گئے لیکن حافظ برخوردار کے عشق کا ہاتھی نہ بدلا وہ اب بھی اسی طور روندتا تھا.. پوش کریندا پوش...

عشق اور جنسی عمل ایک ہوتے ہیں..

جیسے جنس کا حرکتی عمل آدم سے لے کر لمحۂ موجود تک.. زمانے اور وقت سے ماورا ایک ہی انداز میں... ایک اُکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ اسی ایک انداز میں چلا آتا ہے' اسی طور عشق بھی ہمیشہ سے وہی آگ ہے جو جلائے نہیں جلتی اور بجھائے تو بالکل نہیں بجھتی.. نہیں بنتی!

عشق اور جنس پر.. بلیک ہول اور روشنی کی تکونوں کا.. روشنی کی رفتار سے بھی تیز زمانوں کے گزرنے کا کچھ.. ذرّہ بھر اثر نہیں ہوتا.. یہ دونوں بہت ڈھیٹ ہیں اور اس کا جذبہ.. عشق کا.. اور اس کا تحرک.. جنس کا ہمیشہ ایک سا رہتا ہے..

ٹیلی فون قاصد ہے.. نامہ بر ہے.. لیکن یہ اپنی مرضی کا نامہ بر ہے... جی چاہے تو نامہ لے آئے نہ جی چاہے تو گنگ پڑا رہے..

ایک ایسا دربان بن چکا ہے یہ ٹیلی فون کہ جس کے اذن سے ہی محبوب تک رسائی ممکن ہوتی ہے.. بے شک مدتیں بیت جائیں اس کی گھنٹی بجتی ہے تو دل رُکتا ہے کہ شاید وہ ہو.. یہاں تک کہ ایک شاپنگ پلازہ.. کسی دوست کے گھر میں.. کسی پوسٹ آفس میں کھڑے اندر کہیں کسی کی میز پر فون کی گھنٹی بجتی ہے تو بھی اس کی آواز سن کر ایک لمحہ اسی آس کا اترتا ہے کہ شاید اس کا ہو.. اور اگلے ہی لمحے حماقت کا احساس ہوتا ہے اور پھر بھی مایوسی ہوتی ہے کہ یہ اس کا فون نہیں ہے..

وہ بھی ایک مدت سے منتظر تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجے اور دوسری جانب وہ ہو.. اور ایسا ہو نہیں رہا تھا.. وہ جو روندا جا چکا تھا.. اس کا حال اس انتظار میں سودائیوں ایسا ہو رہا تھا.. وہ اس بدصورت سیاہ رنگ کے بدہیئت آلے کو.. دن رات فراموش کر کے.. بھوک پیاس سے ماورا تکتا رہتا تھا اور اس کی منت کرتا تھا' اپنی آنکھوں سے.. اور کبھی دھمکیاں دیتا تھا کہ اے بے ہنگم شکل کے آلے تیرے اندر جو گھنٹی ہے وہ اس کے پوروں تلے دبتے نمبروں کے زور سے کیوں نہیں بجتی.. تیرے بخیے جئیں اس کی آواز سنا دے.. تو اگر ایسا کر دے تو میں تجھے دیسی گھی سے نچڑتی شکر بھری چُوری کھلاؤں.. تیرے پاؤں میں چاندی کی جھانجھریں باندھوں کہ تو وہ کاگا ہے جو پیا کا سندیسہ لا سکتا ہے.. اس پیا کا جس نے اپنے آخری خط میں مردہ شاعرہ کا شعر لکھ کر اسے بے عزت کر دیا تھا..

تو اس مدت میں کوئی ایک رات ہے..

شاید وہی رات ہے سردیوں کی جب اُدھر برنے سے وہ جولاہا جھول رہا ہے اور ادھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور دوسری جانب وہ ہے ''ہیلو..'' اور یہیں سے برنے کے پیڑ سے الٹا جھولتا حال کھیلتا جولاہا ٹیلی فون کے چونگے کو کان سے لگاتا ہے تو اس ایک ''ہیلو'' کو سنتا ہے جس کے لیے وہ صدیوں سے منتظر تھا..

باجھ سجن مینوں ہور نہ سُجھدا

تن تندور' آہیں دے لعبو سیج چڑھی مینڈھا تن من بُجھدا
تن دیاں تن جانے' من دیاں من جانے' محرم سو جو دل دیاں بُجھدا

تو وہ جسے اس کے سوا اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا.. جس کا تن تندور تھا.. جس میں آہوں کے الاؤ اب بھی بھڑکتے تھے وہ چونگے کو کان کے ساتھ اتنی شدت سے دبائے کہ وہ دکھنے کو آتے تھے اس وہم سے کہ کہیں اس کی آواز کوئی راہ پا کر فرار نہ ہو جائے۔ اپنی نشست سے اٹھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس ''ہیلو'' کے بعد جو کچھ کہا جانے کو ہے وہ کیسے وصول کرے اور جب اس کی سمجھ بوجھ جواب دے جاتی ہے تو وہ چونگے کو کان کے ساتھ بھینچے اٹھتا ہے اور ننگے فرش پر لیٹ جاتا ہے اور تڑپتا ہے.. نڈھال ہوتا مسرت سے اور اپنی خوش بختی پر یقین نہ کرتا ہوا.. اب بھی شک کرتا ہوا کہ یہ وہی ہے.. کوئی دھوکا فریب تو نہیں.. وہ بے قابو کیفیت میں لیکن یہ احتیاط کرتا کہ چونگا کان سے بال برابر بھی الگ نہ ہو.. وہ یوں تڑپتا ہے جیسے حال پڑ گیا ہو اور وہ اس سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے.. وہ اپنی کہے جاتی اور وہ اپنی.. نہ دونوں میں سے کوئی ایک سانس لیتا ہے اور نہ دوسرے کی سنتا ہے اور پھر بھی سب کچھ سجھائی دے رہا ہے..

وہ اس سے باتیں کرتا جاتا ہے.. ننگے فرش پر لوٹتا ہے.. بے سُدھ جولاہا..

اور وہ جانے کہاں ہے.. شاید کسی فائیو سٹار ہوٹل کی آسودگی میں.. کسی پبلک کال آفس میں یا کسی ایسے گھر کے صحن میں جس کی دیواروں کے ساتھ جو بیل چمٹی ہوئی تھی.. ایک فائر کی دہشت میں جو اکھڑ گئی تھی اور اب سوکھ چکی ہے' اس کی قربت میں وہ بیٹھی ہے اور اب اطمینان سے.. مایوسی از حد جو اطمینان تخلیق کرتی ہے اس میں.. وہ باتیں کرتی ہے اور خوب آگاہ ہے کہ دوسری جانب جو شخص ہے وہ اس کی آواز سن کر کیسے نڈھال ہو رہا ہے.. اگر آگاہ نہ ہوتی تو کبھی اپنی ملوک پوروں سے اس کا نمبر نہ دباتی..

اس کی باچھیں اس کے قابو میں نہ تھیں.. اتنا نڈھال اتنا خوش اور اس کا بدن ایک مدت کے تناؤ میں جکڑے رہنے کے بعد آزاد ہو گیا تھا اور وہ ننگے فرش پر بخوشی اپنی مرضی سے لوٹتا اس سے باتیں کرتا جاتا تھا..

کیا یہ ممکن ہے کہ جولاہا وہی ہو؟
گڑھے میں پاؤں لٹکائے کھیس بنتا..
برنے سے جھولتا..

اور کان سے فون کا چونگا چپکائے ننگے فرش پر لوٹتا..

عشق کا ممکنات سے کوئی واسطہ نہیں..

ہم جو ایک ہی زمان و مکاں کے عادی ہیں اور اس کے باسی ہیں ان کے دھیان محدود ہیں اور وہ ہر شے کو ممکن یا ناممکن کے سوا اور کچھ اس دھیان میں شامل کرنے سے قاصر ہیں..

یہ دھیان گیان.. سمجھ بوجھ اور فہم و فراست عشق کے زمان و مکاں کی تفسیر نہیں کر سکتے کہ وہ اس مقام پر آ کر اپاہج ہو جاتے ہیں..

اسی لیے وہ ممکن اور ناممکن کے الجھاؤ میں الجھے یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ایک جولاہا بیک وقت.. ایک ہی معینہ لمحے میں کھیس بھی بُن سکتا ہے.. برنے کے رسّے کے ساتھ بندھا جھول سکتا ہے اور ننگے فرش پر لوٹتا اس سجن کی آواز بھی سن سکتا ہے جس کے سوا اسے اور کوئی نہیں سوجھتا۔

کیا یہ تم ہو..

ہاں...

کیا یہ تم ہو..

ہاں..

اور اسے یقین نہیں آ رہا اور وہ ''کیا یہ تم ہو؟'' کی گردان کرتا.. پکارتا.. سسکتا.. کبھی چیختا اور کبھی سرگوشیاں کرتا کہ کیا یہ تم ہو.. ننگے فرش پر لوٹتا چلا جاتا ہے..

ہاں.. یہ میں ہوں!

ہاں.. یہ میں ہوں!

اور فون کے چونگے میں سے برآمد ہوتی جو اس کی آواز ''ہاں.. یہ میں ہوں.. ہاں یہ میں ہوں'' آتی تھی تو ایک مخصوص ردھم میں آتی تھی.. کھڈی کی کھٹ کھٹ ردھم میں اور.. ورق کوبوں کی سونے چاندی کے ورق ایک چوبی ہتھوڑے سے کوٹے جانے والی ردھم.. ردّی کاغذ میں سونے چاندی کے نامعلوم ذرے رکھ کر انہیں تب تک دھم دھم کوٹے جانے کی ردھم کہ جس کے نتیجے میں وہ ورقوں میں بدل جاتے تھے..

ان تینوں کی لے سانجھی تھی..

ورق کوبوں کی اس دھم دھم کی نغمگی کے تسلسل نے عطار کو کپڑے پھاڑ کر جنگل کی راہ دکھائی تھی..

کھڈی کی اس کھٹ کھٹ پر شاہ حسین نثار ہوا اور ہمیشہ ورق کوبوں کے محلے میں سے گزر کر ہر شام دریائے راوی کے کنارے پہنچتا تھا.. اپنے مادھو لال کے ساتھ!

ہاں... جیسے عشق اور جنسی عمل کبھی نہیں بدلتے.. ایسے ہی ایک جولاہا بھی کبھی نہیں بدلتا.. برنے کے پیڑ سے جھولتا' اندھیری کوٹھڑی میں کھیس بُنتا یا ننگے فرش پر کانوں سے چونگا لگائے تڑپتا بے حال ہوتا.. ایک ہی جولاہا ہوتا ہے..

لیکن ایک ایسا فون آیا ہی نہیں تھا جس کے دوسری جانب وہ ہوتی جس کے صحن کی دیوار سے چمٹی بیل ادھڑ کر نیچے آ گری تھی.. وہ ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی تھی اور باقی صرف نامردی' بزدلی اور ایک شعر رہ گیا تھا.. یہ جولاہے کا گمان تھا کہ ایک ایسا فون کبھی نہ کبھی آئے گا.. پر وہ نہ آیا..

اور یہ خط اسی کے نام کا ہو سکتا ہے.. اس کی جانب سے جو گم ہو چکی تھی..

اس کے.. جس نے یہ خط بھیجا تھا.. جس کسی نے بھی بھیجا تھا' اس کے بس میں یہ بھی تھا کہ اس جولاہے کی ناک جب برنے کی بلند ترین شاخ کو چھوئے تو یہ خط وہاں پیش کر دیا جائے..

جب اندھیاری کوٹھڑی میں وہ الجھاؤ والے دھاگوں سے کھیس کی بُنت کرتا تھا تب.. یا ننگے فرش پر لوٹتے ہوئے.. اگرچہ یہ ایک گمان تھا..

یہ تینوں پتے تو عیاں تھے.. خط ان پر جانا چاہیے تھا..

لیکن نہیں گیا..

ایک ایسے پتے پر گیا جو پتہ ہی نہ تھا..

وادیٔ شگر سے آگے.. پرشور نالے کے پار تو کوئی پتہ نہیں..

کہتے ہیں کہ فرشتۂ اجل تمہیں وہیں لے جاتا ہے جہاں اس نے طے کر رکھا ہوتا ہے کہ بس یہیں میں نے اس کی جان قبض کرنی ہے..

تو یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ اس جولاہے کو جو خط پہنچانا ہے وہ.. وادیٔ شگر سے آگے پرشور نالے کے پار ہی پہنچانا ہے..

تو یہی پتہ ہے!

اسی کا ہو سکتا ہے جو گم ہو چکی تھی...

جولاہا اپنی اندھیاری کوٹھڑی میں گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے سر جھکائے الجھے ہوئے دھاگوں سے ایک ایسا کھیس بُنتا جا رہا ہے جس کے ڈیزائن میں کوئی ربط نہیں...ایک پھول ابھرتا ہے تو کھٹ سے اس کی جگہ ایک خلاء آ جاتا ہے اور پھر کوئی سیاہ حاشیہ جنم لینے لگتا ہے جو غمِ حسین کے دھاگوں سے وجود میں آنے لگتا ہے..کبھی کوئی بیل دو چار پتے زرد رنگ کے ظاہر کرتی ہے تو اگلی کھٹ سے وہ سرخ ہو جاتے ہیں..

کھیس کی سطح بھی ہموار نہیں کہیں کہیں سُوت کی گانٹھیں ابھری ہوئی ہیں..

جولاہا سر جھکائے بُنتا جا رہا ہے..

ایک اور کھٹ ہوتی ہے اور کھڈی اٹک جاتی ہے..ایک دھاگہ کھیس کا حصہ بننے سے انکاری ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک بڑی پکی پیڈی گانٹھ ہے....

جولاہا زور لگاتا ہے کہ الجھا ہوا یہ دھاگا کھیس میں بُنا جائے..اور وہ نہیں بُنا جاتا۔

یہ گانٹھ ایک نادیدہ غیر قدرتی اور نہ سمجھ میں آنے والا عشق ہے جس کی بنیاد صرف خطوط تھے...

ان دونوں نے کبھی بھی..ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا..

یہ خط ایک نتالیہ کی جانب سے ایک اَن دیکھے رُودین کو لکھے گئے تھے..

کیوں نہ اس گانٹھ کو کھولنے کی سعی کی جائے..

برنے کے پیڑ کی شاخ سے بندھے رسّے کے ساتھ تو الٹا لٹکا جولاہا بھی جب ایک حیوانی زور لگاتا' اس ڈال سے بھی اوپر نکل جاتا ہے جس کے گرد وہ رسہ جکڑا ہوا ہے تو جن شاخوں کو اس کی ناک چھوتی ہے اس کے ہر پتے پر نتالیہ اور رُودین کی مہریں ثبت ہیں..اور وہ وہیں معلّق

رہتا ہے جھولتا ہوا نیچے نہیں آتا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ پتے خزاں رسیدہ ہو کر جھڑتے ہیں اور جب گرتے ہیں تو فل سکیپ لکیر دار کھردرے کاغذ پر لکھے ہوئے سینکڑوں خطوط کی صورت گرتے ہیں..

کیوں نہ جولاہے کو اس معلّق حالت سے نجات دلا دی جائے..تاکہ وہ پھر سے حال مست جھولنے لگے..

اور اس گانٹھ کو کھولنے کی کوشش کی جائے جس میں نتالیہ اور رُودین بندھے ہوئے ہیں..ایک نادیدہ' غیر قدرتی اور نہ سمجھ میں آنے والے عشق میں بندھے ہوئے ہیں..تار کھڈی پر سے رواں ہو جائے اور کھیس جیسا تیسا بھی ہے بُنا جائے..

محمد علی ڈاکیے کے چرمی بیگ میں ایک خط آستانۂ رومی سے بھی تو آ سکتا تھا..

برس ہا برس بعد جب وہ دونوں اپنی جھرّیوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور بالوں کو رنگتے تھے اور ایک دوسرے کے وجود اور مقام سے آگاہ تک نہ تھے کہ کون کہاں ہے' تب ایک نتالیہ اپنے رُودین کو ایک اور خط...برس ہا برس کے تعطل کے بعد بھی..لکھ سکتی تھی..

اگرچہ وہ ایک سیّد زادی تھی لیکن ذات کی وہ بھی جولاہی تھی اور برنے کی بلند ترین شاخ سے بندھے رسے میں بندھی بے سُدھ وہ بھی جھولتی تھی..

جُھولتی تھی اپنے گورے اَن چھوئے پنڈے کے ساتھ جس پر وہ ایک پارو شنی کی مانند ہتھیلیوں پر ہی نہیں اپنی ناف تلے جو سنہری تکون تھی' اس پر بھی مہندی سے نقش و نگار اُلیکتی تھی..تاکہ اسے کوئی دیکھے..لیکن ایک ان دیدہ عشق میں ایسے مقامات کیسے آ سکتے ہیں؟ وہ جھولتی تھی ان انگلیوں کی نزاکت کے ساتھ جنہیں آستانۂ رومی کے آس پاس جو دیہات تھے' وہاں سے آنے والی عورتیں مسلسل چومتی تھیں اپنے آنسو ان پر گراتی تھیں..ایک سیّد زادی کی انگلیاں چوم کر آخرت میں ثواب حاصل کرنے کے لیے..

اور یہ سیّد زادی دراصل ایک نتالیہ تھی..

اور دیہاتی عورتیں سیّدوں گدّی نشینوں کی عقیدت میں شرابور شرمسار اس کے دونوں ہاتھ ایک مقدس صحیفے کی مانند اپنے ہاتھ میں تھامے سر جھکائے اس کی انگلیوں کو چومتی جاتی تھی اور ان کے کھردرے ہاتھوں میں جو لہسن اور پیاز کی بُو رچی ہوتی تھی' وہ منتقل ہو جاتی تھی سیّد زادی کی انگلیوں کی پوروں میں..اور اسے ابکائی آتی تھی..اپنے ہاتھ جُھڑا کر وہ باتھ روم میں جا کر کسی امپورٹڈ

صابن سے انہیں خوب خوب دھوتی تھی.. بار بار پوروں کو سونگھتی تھی اور تب تک دھوتی رہتی تھی جب تک تسلی نہ ہو جاتی تھی اور پھر باہر صحن میں آ کر پلنگ پر بیٹھتی تھی تو پھر کوئی عورت سسکیاں بھرتی اپنی پھٹی ہوئی چادر چہرے پر کھینچے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی انگلیاں دبوچ کر انہیں چومنے لگتی تھی..

اس اَن چھوئے گورے پنڈے اور لامحی تھرتھراتی برف کی بنی ہوئی کونپلوں ایسی انگلیوں کے ساتھ وہ ایک نادیدہ عشق کے ہاتھی تلے گھر بیٹھے' چار دیواری سے نکلے بغیر اس بڑے صحن میں بیٹھے جس کی کچی دیواروں کے چوبی دروازے اتنے بلند تھے کہ ان میں سے اونٹ بھی گزر سکتے تھے.. وہیں بیٹھے بٹھائے وہ اس ہاتھی تلے روندی گئی..

سیّد زادی ذات کی جولاہی ہوگئی' برنے کے رسّے کے ساتھ بندھ ہوگئی اور عشق کی پینگ جھلانے لگی.. گھر بیٹھے بٹھائے..

عشق کے راستے نرالے ہوتے ہیں..

سٹرینج آر دی ویز آف لَو..

کانونٹ کے برآمدوں میں.. راہباؤں کے سفید پیراہنوں کی سرسراہٹ کے تقدس اور تسبیح میں چلتی وہ لڑکی ایک مذہبی خانوادے سے متعلق وہ لڑکی اپنے دل میں بزرگوں کے عقیدے کے مطابق ایک گناہ اور ارتداد پالتی تھی کہ وہ سیّد زادی نہ ہو ایک راہبہ ہو.. اس خواہش کا اقرار کرنے سے آستانۂ رومی کے در و دیوار اور گنبد منہدم ہو سکتے تھے.. تباہی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکل سکتا تھا' اس لیے وہ اقرار نہ کرتی تھی.. گنگ رہتی تھی صرف چاندی کی ایک صلیب اپنی رس بھری چھاتیوں کے درمیان میں پوشیدہ کرتی کانونٹ کے برآمدوں میں چلتی تھی.. اور مجرم محسوس کیے بغیر چیختی تھی.. اگرچہ وہ ایک خانقاہی ماحول کی پروردہ تھی.. شاید اسی لیے راہبانیت اس کے اندر جڑیں پکڑتی تھی..

چاندی کی صلیب شدید سردیوں میں اسے اپنی مردہ ٹھنڈک سے آزار دیتی تھی.. البتہ گرمیوں میں اس کی حدت اس کے بدن کی حرارت سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی..

اس کے سفید ریش ہر لحظہ ورد کرتے تسبیح پھرولتے عبادت میں مگن.. اپنے آپ میں گم ''بابا''... مرید جولاہوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے سفید پاکیزہ کھدر کے کرتے اور تہمد میں.. اسی کھدر کی ستھری دو چار تہوں کی سادہ پگڑی سے سر کو ڈھانکے بابا پچھلے پچیس برس سے اپنے

آستانے سے باہر نہیں آئے تھے.. نہ اپنے پیاروں کی شادیوں پر نہ ان کی موت پر.. باراتیں آستانے میں اترتیں.. دولہا دلہن اپنے سروں کو جھکا کر ان کا پیار اور دعائیں وصول کرتے اور چلے جاتے.. ان کے بیٹے بھی اور رخصت ہوتی بیٹیاں بھی.. اسی طور جنازے بھی آتے اور وہ آستانے کے صحن میں نماز جنازہ پڑھاتے.. کندھا دیتے اور دروازے سے واپس اپنے حجرے میں لوٹ جاتے..

سیدزادی ان کی فیورٹ پُتری تھی...

بچپن میں وہ ان کی گود میں کھیلتی ان کی سفید ریش میں سے پرندے تلاش کرتی.. اسے یقین تھا کہ اتنی گھنی داڑھی کے اندر پرندوں کے گھونسلے ہوں گے اور ان میں ان کے بچے ہوں گے.. انڈے ہوں گے..

''بابا پرندے کہاں ہیں..''

''تلاش کرو پُتری.. تلاش کرنے سے وہ کچھ بھی مل جاتا ہے جو نظر نہیں آتا..'' اور بابا اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے اسے اپنی داڑھی میں ننھی منی انگلیاں چلانے کی اجازت دے دیتے..

یہ کھیل تماشا اور پرندوں کی تلاش تب تک جاری رہتی جب تک کہ اس کی ماں اسے ڈھونڈتی ہوئی حجرے میں نہ آ نکلتی..

وہ اکثر غائب ہو جاتی..

ماں اس کے چھوٹے بھائی کو دودھ پلانے میں مصروف ہوتی.. وہ پچھلی کوٹھڑی کے اندر جا کر اس کے بلکتے منہ کے لیے اپنی قمیض اوپر کرتی تو وہ اس موقع کی تاک میں رہتی اور غائب ہو جاتی..

اس کے پاؤں ٹکتے نہ تھے کہ وہ شروع سے ایک آوارہ روح تھی..

سرسوں کے کھیتوں میں کُدکڑے مارتی.. ان میں سے لمبی سفید مولیاں کھینچ کر انہیں کچر کچر چباتی' بالآخر اس کی منزل بابا کا آستانہ ہوتا.. جہاں بابا اپنے استغراق میں گم ہونے کے باوجود اپنے بازو وا کر دیتے اور ان کے بازوؤں اور کھدر کے کرتے سے ایک نتھری نتھری مہک آتی.. وہ جو کچھ بھی پڑھنے میں مشغول ہوتے.. اسے مکمل کر کے اسے ایک ایسی مسکراہٹ سے نوازتے کہ وہ فوراً ان کی داڑھی میں انگلیاں چلا کر پرندے تلاش کرنے لگتی... اس سے پیشتر جب وہ اپنے ذکر میں مگن ہوتے تو چپ چاپ ان کی گود میں بیٹھی رہتی اور جونہی وہ مسکراتے اسے کھلی

چھٹی مل جاتی..

ماں حجرے میں داخل ہوتی اور یہ جانتی ہوئی کہ وہ یہیں ہوگی اور اس کے باوجود اسے بابا کی گود میں بیٹھے دیکھ کر ایک دھکا سا لگتا..وہ بل جاتی کہ یہ کہاں بیٹھی ہے اور کیا کر رہی ہے..وہ اس صدمے سے نڈھال اسے بازو سے پکڑ کر گود سے الگ کرتی اور شرمندہ کھڑی ہو جاتی..

بابا اس کو اپنے سے الگ کرنے پر کچھ نہ کہتے..ماں اسے گھسیٹتی ہوئی جب باہر لے جا رہی ہوتی تب وہ کہتے ''پتری کو کچھ نہ کہو..اسے تلاش ہے..تلاش کرنے والے کو وہ کچھ بھی مل جاتا ہے جو نظر نہیں آتا..'' اور پھر سے سر جھکا کر کچھ پڑھنے لگتے..لیکن ان کی آنکھیں اس پتری کا تب تک پیچھا کرتی رہتیں؛ جب تک اس کی ماں شرمندگی کے بوجھ تلے دبی اسے بازو سے پکڑے گھسیٹتی ہوئی خانقاہ کے بڑے دروازے سے باہر نہ نکل جاتی..

پھر وہ بڑی ہوگئی..

خانقاہی ماحول میں..اپنے حویلی نما گھر کی اونچی کچی دیواروں میں وہ بڑی ہوگئی..

اور اسے اپنے بچپن کے بیت جانے کا..اور بڑے ہو جانے کا احساس تب ہوا جب ایک سویر جب وہ صحن میں بچھے پلنگ پر سردیوں کی دھوپ میں ٹانگیں پسارے اونگھ رہی تھی تو کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلیوں کی پوروں کو چوم لیا..

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی..

زوہراں مصلّن پلنگ کے پائے کے ساتھ لگی زاروقطار روتی..اپنے سیاہ چہرے پر آنسوؤں کی دھاریں گراتی اس کی انگلیاں چوم رہی تھی اور کہہ رہی تھی ''آلِ نبی اولاد نبی..میرا خصم شیداں نائن کے ساتھ چلا گیا ہے..اسے واپس لے آؤ..''

''زوہراں میں اسے کیسے واپس لا سکتی ہوں جھلیے..''

''سیّدزادی میرے حق میں دعا کرے اور وہ اوترا واپس نہ آئے..توبہ..توبہ..''

پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا..

وہ بچپن کی سرحد کو پار کر کے ادھر بدن بھرنے کے زمانوں میں آئی تو اس عقیدت اور التفات سے لطف اندوز ہونے لگی..وہ ان دیہاتنوں کی آہ وزاری کے جواب میں کچھ نہ کچھ بڑبڑا دیتی اور وہ اسے دعائیں دیتی چلی جاتیں..

لیکن اس سارے عمل کا کھوکھلا پن اسے پریشان کرتا تھا..

خانقاہ کی اندھی پجارنوں کے ہاتھوں میں سے اس کی پوروں میں منتقل ہوتی لہسن اور پیاز کی بُو اسے پریشان کرتی تھی..

اگرچہ وہ بابا کی فیورٹ پتری تھی لیکن وہ ایک برگشتہ روح تھی..اگر ان کی پوتی..ایک سیّدزادی..ایک پیرانِ پیر کی پوتی..اپنی چھاتیوں کی وادی میں چاندی کی ایک صلیب چھپائے رکھتی ہے تو اس سے بڑھ کر برگشتہ اور اپنے عقیدے سے پھر جانے والی..ارتداد کی مرتکب روح اور کیا ہوگی..

لیکن یہ برگشتگی تب ابھری جب اسے نزدیکی شہر کے ایک کانونٹ میں داخل کروا دیا گیا..

یہ ایک اور خانقاہِ رومی تھی اگرچہ اس کا عقیدہ الگ تھا..

وہ بڑی ہو چکی تھی۔کانونٹ میں داخل ہو چکی تھی اور اس کے باوجود جب کبھی وہ گھر لوٹتی..اگرچہ اب اس کا چھوٹا بھائی بھی بڑا ہو چکا تھا اور ماں نے مدتوں پہلے اسے دودھ پلانا ترک کر دیا تھا..سفر کی تھکاوٹ اتارے بغیر اپنا سامان اور کتابیں اپنے کمرے میں پھینک کر اگلے لمحے حویلی سے باہر نکل کر خانقاہ کا رخ کر لیتی..

اگرچہ بابا کی گود مختصر ہو چکی تھی اور ان کے وا کیے جانے والے بازوؤں میں لرزش آ چکی تھی لیکن وہ سمٹ سمٹا کر اس میں بیٹھ جاتی اور آنکھیں بند کر کے کہتی ''بابا میری تلاش ختم نہیں ہوتی..''

''پتری یہ تو خوش بختی ہے..'' بابا چونک کر کہتے کہ بازو وا کرنے میں اسے گود میں لینے کے تمام تر عمل سے وہ اس لمحے تک غافل تھے اور موت کی بالآخر آمد سے آگاہ تھے ''تلاش اگر ختم ہو جائے اور وہ بھی مل جائے جو نظر نہیں آتا پھر بھی شک باقی رہتا ہے..شرک زور پکڑتا ہے؛ اس لیے یہ تیری خوش بختی ہے کہ تیری تلاش اختتام کو نہیں پہنچتی..تو میری داڑھی میں وہ پرندے تلاش کر جو وہاں نہیں ہیں..''

اور وہ سچ مچ اتنی بڑی اور بدن کے بھر جانے والی ہونے کے باوجود ایک ننھی بچی کی مانند بابا کی ریش میں اس آس میں پرندوں کے گھونسلے تلاش کرنے لگتی کہ اگر وہ اب تک نہیں ملے تو آج مل جائیں گے..

اور بابا اپنی نقاہت..عمر رسیدگی اور موت کی قربت میں تھوڑی اونچی کر کے اپنی پتری کو

اپنی سفید گھنی ریش میں سے وہ پرندے تلاش کرنے دیتے جو وہ جانتے تھے کہ وہ وہاں نہیں ہیں..

لیکن اگلی چھٹیوں میں جب 'پتری' گھر آئی تو وہ دیر تک سفر کی تھکاوٹ اتارتی رہی..نہ اس نے اپنا سامان اور کتابیں اپنے کمرے میں پھینکے اور نہ اگلے لمحے اس نے حویلی سے باہر نکل کر خانقاہ کا رخ کیا..

اس کے گلے میں ایک زنجیر سے بندھی چھاتیوں کی وادی میں آرام کرتی چاندی کی ایک صلیب تھی..

وہ قطعی طور پر مجرم محسوس نہیں کرتی تھی اس کے باوجود اسے خدشہ تھا..اور جب وہ اپنی ماں کے کہنے پر کہ ''تم ابھی تک بابا کو سلام کرنے نہیں گئیں..'' وہ گئی..حسب معمول بازو وا ہوئے.. وہ جھجکتی ہوئی سفید ریش کی ناتواں گود میں بیٹھی تو بابا اپنے استغراق سے بیدار ہوئے اور اس کے سیاہ بنگالی سحر والے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے ''پتری..تلاش کرنے والوں کو جدا جدا منزلیں ملتی ہیں..مومن لائی لگ سے کھوجی کافر بہتر ہوتا ہے کہ وہ تلاش کرتا ہے..تو بھی کھوج کرنے والوں میں سے ہے..نہ جھجک کہ میں آگاہ ہوں..تیرے سینے کے درمیان جو کچھ تجھے آسودگی دیتا ہے اسے میں جانتا ہوں..''

''یہ جرم ہے بابا..''

''نہیں..اُس ذات کی قربت میں جانے والا کوئی بھی راستہ جرم نہیں..سبھی راستے اس ایک چوٹی پر پہنچتے ہیں..کوئی ڈھلوان پر گرتا پڑتا اپنے ٹخنے گھٹنے چھیلتا خون آلود کرتا اوپر پہنچتا ہے.. اور کوئی کسی صراطِ مستقیم پر چلتا آسانی سے وہاں جا نکلتا ہے..چوٹی تک پہنچنا سچائی ہے..کس راستے پر چلتے ہوئے وہاں تک پہنچنا ہے' یہ ہمارے اختیار میں نہیں..''

''بابا..میں کیا کروں؟''

''تم میری داڑھی میں پرندے تلاش کرو کہ میں ایک عرصے سے تمہاری انگلیوں کا منتظر تھا..چلو 'پتری'..''

اور بابا نے اپنی ٹھوڑی اونچی کر دی..

اس کا باپ ایک آوارہ گرد شکاری تھا..لیکن ظالم نہ تھا' دھیما اور خاموش طبع تھا..

شکار کے شوقین عام طور پر منہ اندھیرے گھر سے نکلتے ہیں..جہاں شکار کی شنید ہو وہاں بروقت پہنچتے ہیں اور شام ڈھلے لوٹ آتے ہیں..کچھ وہاں جھیلوں جوہڑوں اور دریا میں ابھرتے ہوئے ریتلے ٹاپوؤں پر خیموں یا کچے کوٹھوں میں دو چار دن کے لیے مقیم ہو جاتے ہیں لیکن اس کا باپ گھر سے نکلتا تھا تو اکثر موسم بدل جانے پر ہی گھر واپس آتا تھا..مہینوں غائب رہتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو کبھی اس کے تھیلے میں شکار کیے گئے پرندے نہ ہوتے تھے..اس کی ماں سمجھوتہ کر چکی تھی کہ زندگی یونہی گزارنی ہے..

اور سید زادی کے لیے یہ باپ ایک ورائٹی تھی جسے کبھی کبھار دیکھ کر وہ اپنی آنکھوں کا ذائقہ بدل لیتی تھی..ورنہ اس کے لیے بابا کافی تھے..

بابا کو بھی اپنے نزدیکی عزیز کی اس آل اولاد سے غفلت کا شدید احساس ہوگا..

باپ کی ساری ڈاک وہ وصول کرتی..

اس کے نام جو خط آتے وہ اس کے باپ کے نام ہوتے اور وہ رودین کی ہینڈ رائٹنگ سے جان جاتی کہ یہ میرے لیے ہے..

کانونٹ کے بلند چھتوں والے گوتھک طرز کے کیتھڈرل میں جب یسوع کی شان میں گیت گائے جاتے تو وہ پچھلے بنچوں پر چپ بیٹھی رہتی اگرچہ راہباؤں کی خواہش ہوتی کہ غیر مذہب کی یہ کافر لڑکیاں گانے میں شامل ہو جائیں..کیا پتہ یہ سیدھے راستے پر آ جائیں' یسوع کی بھیڑیں بن جائیں اور ان کی عاقبت سنور جائے لیکن وہ چپ بیٹھی رہتی' البتہ ایک بار جب ڈچ مشنریوں اور راہباؤں کا ایک گروپ ان کے کانونٹ میں آیا اور انہوں نے آرگن کی بلند آہنگ..

مصلوب عیسیٰ کے مجسّموں سے ٹکراتی.. مریم کے پتھریلے لبادوں کو چومتی موسیقی کی ہمراہی میں ''آوے ماریا'' پورے منہ کھول کر مریم کی محبت میں سرشار ہو کر گانا شروع کیا تو اس کے لب خود بخود ہلنے لگے کہ اس گیت میں بلا کی کشش اور روحانی خوبصورتی تھی..

اسے محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں آرام کرتی چاندی کی صلیب خالی نہیں اس پر عیسیٰ کا مصلوب بدن ہے اور اس کے دامن میں بیٹھی مریم بین کر رہی ہے...

بابا کے علاوہ صرف ثریا آپا کو اس صلیب کی موجودگی کا علم تھا..

آپا ثریا کی شادی نہیں ہوئی تھی.. انہوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لیے وقف کر رکھا تھا' ہمیشہ سیاہ لباس میں سوگوار رہتی تھیں.. غم حسین میں سینہ کوبی کرتی تھیں اور دنیا کی آسائش سے منہ موڑے آستانۂ رومی میں راہبانیت کی زندگی گزارتی تھیں..

وہ اس سے اتنی بڑی تھیں کہ بچپن میں اسے نہلایا کرتی تھیں..

یہ نہلانا تب موقوف ہوا جب آپا ثریا کو اس کے تیزی سے تبدیل ہوتے بدن سے شرم آنے لگی.. اسے تو بالکل سمجھ نہ آتی کہ آپا ثریا اب اسے نہلانے سے کیوں اجتناب کرنے لگی ہیں.. نہلانے کا متبادل انہوں نے یہ سوچا کہ پتری کی گردن اور کندھوں پر باقاعدگی سے السی کے تیل کی مالش کی جائے تاکہ پڑھائی کی نشست میں اس کے جو پٹھے تن جاتے ہیں وہ ملائم اور پرسکون ہو جائیں۔

اسی ایک مالش کے دوران آپا ثریا کا ہاتھ اس کی گردن کے گرد گورے بدن پر لپٹی زنجیر پر پڑا اور انہوں نے محض تجسس کی خاطر اسے کھینچ کر دیکھا کہ اس کے ساتھ جو لاکٹ بندھا ہے اس پر اللہ کا نام ہے یا ہمارے پیغمبرؐ کا...

اور وہاں ایک صلیب تھی چاندی کی.. ثریا آپا کا رنگ فق ہو گیا.. ان کا پورا بدن لرزش میں آ گیا اور وہ بلند آواز میں لرزتی اور خوفزدہ آواز میں لاحول پڑھنے لگیں..

وہ.. ثریا آپا کے مشاق ہاتھوں کے لمس کے لطف میں ادھ موئی پڑی تھی اور اسے یکدم کچھ گمان نہ ہوا کہ کیا ہوا ہے۔ جب تک آپا نے زنجیر کو نہایت شدت سے کھینچ کر اسے توڑنے کی کوشش نہ کی.. تب وہ بیدار ہو گئی.. اور آپا کا ہاتھ پکڑ لیا..

''آپا.. کیا ہوا ہے؟''

آپا کا سانس اکھڑنے کو آ رہا تھا.. ''میں نے تو پہلے دن سے دہائی دی تھی کہ پتری کو ان

کرسٹانوں کے سکول میں داخل نہ کراؤ.. پہلے دن سے کہتی تھی... پتری تو اپنے حسب نسب کو بھول گئی..''

اسے احساس ہو گیا کہ کیا سانحہ ہو گیا ہے۔ ''آپا یہ تو فیشن ہے.. آپ پنج تن پاک کی قسم لے لو میں نے اسے محض فیشن کے طور پر پہنا ہے..''

وہ آپا کو یہ بتا ہی نہیں سکتی تھی کہ بابا کو بھی علم ہو گیا ہے اور انہوں نے کوئی سرزنش نہیں کی..

''تو پھر اس شیطانی شے کو اتار دو..'' وہ مسلسل کچھ نہ کچھ پڑھے جا رہی تھی... ''میں تو پہلے دن یہ کہتی تھی۔''

''اتار دی..'' اس نے زنجیر کھول دی..

''اب اسے پھینک دو..''

''کہاں؟''

''میں پھینک آتی ہوں.. اگرچہ میں اس ہاتھ لگانے سے آلودہ ہوتی ہوں۔''

''دراصل آپا یہ صلیب مجھے میری ایک نہایت عزیز کلاس فیلو نے سالگرہ کے تحفے کے طور پر دی تھی.. قیمتی ہے.. میں اسے واپس کر دوں گی.. کل ہی..''

''میں کل کے بعد اس منحوس شے کو نہ دیکھوں..''

''نہیں دیکھیں گی آپا.. وعدہ..''

ثریا آپا بڑبڑاتی ہوئی.. اپنے سیاہ پوش ان چھوئے بدن میں اپنی عبادت اور پاکیزگی کا بوجھ برداشت کرتی.. چلی گئیں..

اگلی بار جب ثریا آپا السی کے تیل کی کپّی تھامے اس کی گردن کی رگوں کو سکون دینے کی خاطر مالش کرنے آئیں تو اس نے انکار کر دیا.. ''ثریا آپا.. مجھے السی کے تیل سے الرجی ہے.. میرے پورے بدن پر پھپھولے سے ابھرنے لگتے ہیں..''

وہ ایک برگشتہ روح تھی.. لیکن اس کی برگشتگی ایک چاندی کی صلیب تک ہی محدود نہ تھی.. اس سے بہت آگے جاتی تھی..

وہ.. ایک نہایت پُریقین اور ایماندار کمیونسٹ بھی تھی..

یہ ایک عجیب و غریب کمبی نیشن تھا.. آستانۂ رومی کی سیّد زادی.. چاندی کی صلیب اور

مارکس اور لینن کی گرویدہ..

وہ پیدائشی طور پر سیدزادی تھی.. جذباتی طور پر ایک صلیب کی گرویدہ تھی اور انقلاب نے اسے موہ کر اس کی حسیات میں راستے بنائے تھے.. ان راستوں پر اسے اس کے بڑے بھائی سوان نے ڈالا تھا..

سوان خانقاہی ماحول کا ایک مخصوص کردار تھا۔ نکما' آوارہ گرد' اچھا پہننا' اچھا کھانا اور کچھ نہ کرنا.. سفید داڑھیوں والے خانقاہی درویش ہمہ وقت خدمت پر معمور اس کے پاؤں چھونے کو سعادت سمجھتے.. یہ چھوٹے شاہ صاحب بیشتر پیر بچوں کی مانند کند ذہن اور لڑاکے تھے.. گاؤں کے کسی لڑکے کی مجال نہ تھی کہ وہ قریب سے گزریں تو اپنا راستہ چھوڑ کر کھیت میں اتر کر ہاتھ باندھ کر وہ نظریں نیچی کیے تب تک کھڑا نہ رہے جب تک وہ گزر نہ جائیں.. چھوٹے شاہ صاحب کا ہاتھ بھی اکثر چھوٹ جاتا تھا اور وہ من کی موج میں آ کر کسی بھی مرید یا راہگیر کو پیٹ سکتے تھے اور وہ مار کھاتا ہوا بھی سر جھکائے رکھتا تھا کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے.. اس کے بزرگوں میں ایک ایسے بڑے پیر صاحب بھی گزرے تھے جو پیر مٹھا کہلاتے تھے کیونکہ انہیں مٹھائی بہت مرغوب تھی.. ان کا آستانہ طرح طرح کی مٹھائیوں سے بھرا رہتا اور ان کے پیروکاروں کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی کہ وہ ان کی پیش کردہ مٹھائی میں سے صرف ایک لڈو کو چکھ ہی لیں اور وہ اکثر سرفراز فرما دیتے.. پیر مٹھا صرف مٹھائی کے یوں شوقین تھے کہ انہیں کشف ہوا تھا کہ وہسکی کی سفید اور سیاہ کتوں والی پوری بوتل پینے کے بعد اگر مٹھائی کھائی جائے تو ایک اور بوتل کا نشہ ہو جاتا ہے.. پیر مٹھا ہمیشہ عالم جذب میں رہتے اس لیے باقاعدہ نماز پڑھنے کا اتفاق کم ہی ہوتا' البتہ کبھی کبھار اسی عالم سرشاری میں روحانی مستی میں اپنے مریدوں اور ملازموں کو حکم دیتے کہ کم بختو نماز پڑھو تم پر فرض ہے.. یہ حکم اکثر اوقات گئی رات ایسے وقتوں میں دیا جاتا' جب کسی بھی نماز کا وقت نہ ہوتا.. اور تاکید یہ کی جاتی کہ بلند آواز میں پڑھو تا کہ میں تمہاری گنوار پن کی عربی کا تلفظ درست کر سکوں.. مرید اور ملازم فوری طور پر قطار باندھ کر جانے کون سی نماز کی نیت کر کے کھڑے ہو جاتے اور بلند آواز میں کورس میں نماز پڑھنے لگتے.. اور پیر مٹھا کو یہ کریڈٹ بہر حال جاتا تھا کہ وہ عالم جذب میں بھی زیر زبر کا ایسا حساب رکھتے تھے کہ جونہی کسی سے تلفظ میں ذرا سی بھی چوک ہوئی وہ اس کی کمر پر ایک ٹھڈا رسید کر کے کہتے ''خبیث.. سراط کہہ رہا ہے.. کہہ صراط.. ص سے.. کم بخت کیوں جہنم خرید رہا ہے.. روز حشر تیرے منہ میں پیپ ڈالی جائے گی کہ غلط تلفظ سے نماز پڑھتا رہا ہے خبیث...''

مرید اور ملازمین حتی الوسع اپنا تلفظ درست کرنے کی سعی کرتے اور مسلسل نماز پڑھتے رہتے.. اس دوران پیر مٹھا یاد الٰہی میں اتنے مگن ہوتے کہ انہیں اپنی خبر نہ رہتی اور کچھ مریدین اپنی نماز توڑ کر انہیں بمشکل اٹھا کر کہ وہ قدرے فربہ تھے' ان کے فرانس سے لائے ہوئے بڑے پلنگ پر جا لٹاتے اور الٹے پاؤں لوٹ آتے..

کبھی کبھار پیر مٹھا وجدان میں آ کر مریدوں اور ملازموں.. جب کہ وہ ان کے حکم کے تابع نماز کی نیت میں ہوتے.. ان کے آگے ایک امام کی طرح کھڑے ہو کر بلند آواز میں تلاوت فرمانے لگتے..

نہ وہ کہیں لڑکھڑاتے.. نہ ڈولتے.. نہ ان کی زبان وہسکی کی پوری بوتل بھاری کر سکتی اور وہ بلند آواز میں مصری لہجے میں قرآن پاک کی قرآت کرنے لگتے.. پورا گاؤں.. سوتے ہوئے بیدار ہو جاتا.. ان کی بلند آہنگ تلاوت میں اتنا اثر تھا.. لوگ روتے روتے اپنے گال گیلے کر لیتے.. ان کی تلاوت میں شیرینی ایسی ہوا کرتی تھی..

سوان جو پیر مٹھا کی نسل سے بہت برس بعد وجود میں آیا تھا' اس کے بارے میں بھی گاؤں کے بڑے بوڑھے یہی پیش گوئی کرتے تھے کہ یہ سوان ایک اور پیر مٹھا ہوگا..

سوان.. ناکارہ اور کند ذہن.. مریدوں سے اپنا تن بدن دبواتا.. انہیں خواہ مخواہ زدوکوب کرتا' دو سفید اور سیاہ کتوں والی وہسکی نہیں پیتا تھا.. کیکر اور گنے کی شراب پیتا تھا.. اس میں بھی خوش الحانی بہت تھی.. اس نے بمشکل میٹرک پاس کیا اور پھر ایڈورڈز کالج میں ایک تگڑی سفارش کی بنا پر داخل ہو گیا.. ایف اے تک وہ وہیں رہا اور بی اے میں داخل ہوتے ہی وہ کچھ اور ہو گیا.. وہ منہ کھولے ایک ایسے عیسائی پروفیسر کے لیکچر سنتا رہا جو ایک عمر کنوارا رہنے کے بعد کسی احمدی خاتون سے شادی کر بیٹھا تھا...

پروفیسر اعجاز کے لیکچروں نے اسے ہلا کر رکھ دیا... اس کے آستانہ رومی کو ہلا کر رکھ دیا..

پروفیسر کے آس پاس کچھ اور انقلابی بھی تھے.. اور وہ ان کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے خاندانی پس منظر کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا...

اگرچہ کند ذہن تھا پر اس رفاقت میں اس کا ذہن کام کرنے لگا..

اسے اپنے آپ پر ندامت ہونے لگی..

کہ میں آج تک کیا کرتا آیا ہوں..

تب وہ ترقی پسند گروہ کے اراکین کی سفارش پر ایڈورڈ کالج سے معمولی سا بی اے کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ماسکو کی پیٹرس لومبا یونیورسٹی میں چلا گیا..

اور یہیں سے وہ کونپلیں پھوٹیں جو نتالیہ کے آستانۂ رومی میں شگاف کرتی ہوئیں ایک لادین نظام کے باوجود نہایت کومل اور مستقبل کی درخشندگی کی علامت تھیں..اگرچہ نہیں تھیں..

سوان اسے ماسکو کے عوامی اشاعت گھر سے شائع ہونے والے روسی ادب کے اردو میں ترجمہ شدہ پلندے بھیجتا..وہ روسی زندگی کی سادگی اور مزدوروں کی بے مثال قوت جو ایک کمیونسٹ معاشرہ تشکیل کرنے کے لیے دن رات خون پسینہ ایک کر رہی تھی ان کے قصے بیان کرتا..

یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے اپنے افریقی اور جنوبی امریکی ساتھیوں کے جوش اور ولولے کی داستانیں سناتا کہ وہ کیسے اپنے اپنے ملکوں میں واپسی پر غیر ملکی آقاؤں سے نجات حاصل کرنے اور وہاں برابری کا یہ نظام رائج کرنے کا عزم رکھتے تھے..کانگو کے ترقی پسند اور شعلہ بیان لیڈر پیٹرس لومبا کو جب استعماری طاقتوں نے اپنے راستے کی دیوار جان کر قتل کروا دیا تو ماسکو یونیورسٹی کا نام بدل کر اسے پیٹرس لومبا یونیورسٹی کا نام دے دیا گیا چنانچہ افریقی طالب علم تعداد میں یورپی' امریکی اور ایشیائی طالب علموں کی نسبت کہیں بڑھ کر تھے..سوان کے سرہانے ہمیشہ ''داس کیپٹل'' پڑی رہتی اور وہ اس کا مطالعہ اسی عقیدت اور جذبے سے کرتا جیسے ایک زمانے میں وہ اپنی مقدس کتاب کا کیا کرتا تھا..

وہ یکسر بدل چکا تھا..لینن کے ہر موضوع پر نظریات اسے ازبر تھے اور وہ سوویت یونین کو ایک رہنما ستارے کی حیثیت سے صدق دل سے قبول کرتا تھا جس کی روشنی میں وطن واپسی پر اس نے خانقاہی اور جاگیرداری نظام کا قلع قمع کرنے کی جدوجہد میں شامل ہو کر ایک بے مثال' آج تک انسانی سوچ میں نہ آیا ہوا ایک ایسا مساواتی نظام تشکیل دینا تھا' جس میں سوویت یونین کی مانند خلق خدا راج کرے گی اور تب تخت اچھالے جائیں گے اور راج کرے گی..خلق خدا..

وہ اکثر اپنے خطوں میں اپنی دوست روسی لڑکیوں کا تذکرہ کرتا اور نتالیہ اپنے گورے چہرے پر ایک نامعلوم لالی تیرتی محسوس کرتی۔ان کی تفصیل پڑھتی کہ کیسے وہ مردوں کی برابری میں ایک نیا نظام تشکیل دے رہی ہیں اور کیسے انہیں اپنے کلاسیکی شاعر اور ادیب ازبر ہیں اور وہ پوشکن اور گورکی کے حوالوں کے بغیر محبت بھی نہیں کر سکتیں..

نتالیہ آستانۂ رومی کے ماحول میں بیٹھی ہوئی ان اردو میں ترجمہ شدہ روسی ناولوں اور

شاعری سے متاثر ہونے لگی..وہ کسی حد تک ایک نسوانی سوان ہو گئی کہ اسے بھی اس خانقاہی اور جاگیرداری نظام کے کھوکھلے پن سے وحشت ہونے لگی اور وہ بھی ایک بڑے انقلاب کے خواب دیکھنے لگی..

اس کے سارے خواب سوویت یونین اور اس کے ادب اور شاعری سے منسلک ہو گئے..وہ ظ۔انصاری کے ترجمہ شدہ ناولوں کی خصوصی زبان اپنے اظہار کے لیے..گفتگو میں اور تحریر میں بھی لاشعوری طور پر اختیار کرنے لگی..آستانۂ رومی کے اردگرد جو ہرے بھرے حد نظر تک پھیلے کھیت اور چراگاہیں تھیں انہیں وہ دیکھتی تو ٹالسٹائی اور شولوخوف کے ''اور ڈان بہتا رہا'' کی نظر سے دیکھتی جیسے وہ روسی سرزمین اور وسیع میدانوں کے نقشے تحریر میں کھینچتے تھے..صرف پوشکن کی آوارہ منش شاعری اس کی چھاتیوں کے درمیان آرام کرتی چاندی کی صلیب کے نیچے جو دل تھا اس کی دھڑکن اتنی تیز کر دیتی کہ صلیب بے آرام ہونے لگتی..

وہ بھی سوان کو نہایت طویل خطوط لکھتی..اور اتنی طوالت عام رائٹنگ پیڈ میں نہ سما سکتی تھی' اس لیے وہ انہیں لکیردار رجسٹر کے فل سکیپ ورقوں پر لکھتی اور لکھتی چلی جاتی..

بابا کے پاس اس کی آمدورفت اتنی کم ہو گئی کہ بعض اوقات بابا کا پیغام آ جاتا کہ پتری بے شک تلاش جاری رکھو لیکن اپنے حال سے ناتا نہ توڑو..

انہی وقتوں میں اس نے ٹیلی ویژن پر رودین کو ''ادب اور معاشرہ'' کے موضوع پر ایک ٹاک شو میں گفتگو کرتے دیکھا..پھر کسی اور پروگرام میں اسے باتیں کرتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے دیکھا تو وہ اس کی گرویدہ ہو گئی..پوشکن کی ساری شاعری گویا اس کی شخصیت اور خیالات تھے..وہ جیسے چاندی کی ایک صلیب اور کمیونزم کے سحر میں آئی تھی ویسے ہی اس کے ڈل اتیج دھیمے پن اور سیاہ آنکھوں کی اسیر ہو گئی..اور تب اس نے اسے اپنا پہلا خط لکھا..رجسٹر کے اس لکیردار کھردرے فل سکیپ کاغذ پر..

تسلیمات!

آپ کو کافی دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر حوصلہ نہ پڑتا تھا۔خیال گزرتا تھا کہ آپ ایک بڑے آدمی ہیں' مشہور آدمی ہیں اس لیے مغرور بھی لازمی طور پر ہوں گے پھر مصروف بھی ہوتے ہوں گے۔ان سب باتوں کو سوچنے کے

باوجود بھی آخر آپ کو خط لکھنے کا حوصلہ کر ہی لیا۔ جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ آپ بُرے آدمی نہیں لگتے۔

عرض یہ ہے کہ جناب مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ نصاب کی کتب سے زیادہ (معیاری و مقبول) غیر نصابی کتب و رسائل و جرائد پڑھنے کا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ بچپن ہی سے مجھے کتابیں پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ میں گاؤں سے اپنے والد صاحب کے ہمراہ جب شہر جاتی تھی تو کھلونے یا کھانے پینے کی اشیاء کی بجائے ہمیشہ بچوں کے رسالے اور کہانیوں کی کتابیں خریدنے پر اصرار کرتی تھی۔

جب میں کالج میں پہنچی جناب تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں پڑھنے کے علاوہ کچھ لکھ بھی سکتی ہوں۔ اس طرح میں نے کالج میگزین میں لکھنا شروع کیا پھر جب بی۔اے کے فائنل ایئر میں پہنچی تو میگزین کے اُردو حصے کی انچارج بن گئی اور اخبارات وغیرہ میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔

بی۔اے کے بعد میرا شہر سے رابطہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ میں گھر میں ہوتی ہوں اور کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہوں اور پھاڑتی رہتی ہوں جیسے اطمینان نہیں ہوتا تسلی نہیں ہوتی۔ مجھے کوئی رہبری کرنے والا نہیں.... گاؤں کے ماحول اور لوگوں میں شعر کہنے یا افسانے لکھنے اور وہ بھی ایک لڑکی سے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ میرے بھائی اور والد ہیں انہوں نے کبھی میرے اس ذوق یا شوق کو سنجیدگی سے سمجھا ہی نہیں۔ سب ہنستے اور مذاق اُڑاتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں میرے اردگرد پھیلی ہوئی خوبصورت اور حسین چیزیں سرسوں کے کھیت' کیکر پھلاہی شیشم اور سرس کے درخت ہوا کے جھونکوں میں بسی ہوئی ان کی مہک ان کی شاخوں پر کوکتی فاختاؤں کی سوز و سکون بھری آوازیں' سبز کھیتوں اور مٹیالے میدانوں میں بل کھاتی پگڈنڈیاں' مویشی چراتے ہوئے لوگ' بے فکری اور آسودگی سے چرتی ہوئی گائیں' کنوئیں پر پانی بھرتی عورتیں' تسلے سروں پر رکھے گوبر چنتے بچے اور فصل کاٹتی عورتیں غرض کیا کیا لکھوں چھت پر کھڑی ہو کر اکثر صبح و شام کا نظارہ کرتی رہتی ہوں اور یہ سب چیزیں اور بے شمار دوسری معمولی اور غیر اہم چیزیں اردگرد پھیلے ہوئے لوگ جیسے سب کاغذ بن کر میرے قلم کے نیچے آ جاتے ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کچھ لکھو'

کچھ لکھو ہم نظر انداز کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ ہم میں ورڈز ورتھ ہے' ہم میں احمد ندیم قاسمی ہے' ہم میں قراۃ العین حیدر ہے' شوکت صدیقی ہے اور الطاف فاطمہ ہے۔ لکھو لکھو ضرور لکھو تم ہماری طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتیں کہ ہم تو تمہارا احساس ہیں' شعور ہیں۔

تو میں کیا کروں؟ آپ چونکہ خود فنکار ہیں' ادیب ہیں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پھر کیسی بے چینی' خلش اور خلا خلا میں محسوس کرتی ہوں اور اس وقت تک سکون نہیں ملتا جب تک کہ کچھ نہ کچھ لکھ نہ لوں۔ جناب میں نے کئی افسانے لکھے اور پھاڑ دیئے۔ دل کی تسلی اور اطمینان نہ ہو سکا جیسے یہ کچھ نہیں کچھ اور کروں' کچھ اور کروں پھر میں نے گزشتہ دنوں ایک ناول لکھنی شروع کی۔ مجھے صرف لڑکے اور لڑکی کی محبت کی کہانیاں پسند نہیں جیسی عام طور پر ہمارے عورتوں کے رسالوں اور ناولوں میں ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے محبت بھی زندگی کا' انسانوں کا ایک اہم جزو ہے مگر حقیقتیں کچھ اور بھی تو ہیں۔ دلفریب بھی' دل شکن بھی تو کچھ ایسے ہی خیالات اور پلاٹ یا مرکزی باتیں تھیں میرے ذہن میں جب میں نے اپنی کتاب لکھنی شروع کی۔ میں خود بھی حیران رہ گئی اور آپ بھی یہ جان کر حیران ہوں گے کہ جب میں نے کاغذ اور قلم سنبھالا تو خیالات' جذبات' الفاظ' مناظر' کردار سب کچھ میرے ذہن میں اس تیزی سے' اس خوبصورتی اور تسلسل سے آتے گئے اور کاغذ پر سنورتے گئے جیسے کہ یہ سب اصل واقعات' حالات کردار میرے دماغ میں کسی قید خانے میں تھے اور رہائی کے اس شدت سے منتظر تھے کہ دروازہ کھلتے ہی دوڑتے ہوئے باہر آنے شروع ہو گئے۔ میری والدہ اکثر مجھ پر ناراض ہو جاتیں' جھنجھلا جاتیں کہ تم کیا کرتی رہتی ہو۔ یہ کیا لکھتی رہتی ہو۔ مجھے بتایئے کہ میں انہیں کیا جواب دے سکتی تھی یا دے سکتی ہوں۔ خیر اب جب کہ یہ کتاب مکمل ہو گئی ہے (رف ہے ابھی) تو مجھے جیسے ایک بھاری بوجھ سے نجات مل گئی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ چھپے' یہ چھپنے کے قابل ہے الماری میں پڑے پڑے ضائع ہو جانے کے لیے نہیں ہے مگر سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں' ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل بے کار کتاب ہو' محض میری خوش فہمی ہو کہ یہ ایک اچھی تحریر ہے اور قابل اشاعت ہے.. کوئی اچھا ادیب یا نقاد ہو سکتا ہے کہ اسے

پڑھے تو مجھ پر ہنسے گویا مجھے بالکل پتہ نہیں کہ میری یہ تحریر کیا ہے' سونا ہے یا پیتل۔

آپ سے میں اسی سلسلے میں مدد چاہتی ہوں کیونکہ میں آپ پر آپ کی انسان دوستی اور انسانیت پر اعتماد کر سکتی ہوں۔ مجھے آپ سے توقع ہے کہ میری کتاب کا مسودہ اگر آپ کے خیال میں قابل اشاعت نکلا تو آپ اس میدان میں ایک بے بس اور بے سہارا دیہاتی لڑکی کی تخلیق چرائیں گے نہیں (سنا ہے کہ اکثر بے ضمیر لوگ نئے مجھ سے غریب لکھنے والوں کے ساتھ یہ کرتے ہیں) بلکہ کسی اچھے پبلشر سے اس کی اشاعت کے سلسلے میں میری مدد کریں گے' طریقہ کار بتائیں گے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا' کیا کر سکتی ہوں' میرے پاس بینک میں بارہ چودہ سو روپیہ بھی ہیں میرے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں اگر اس سے بھی کچھ ہو سکے تو کوئی بات نہیں مگر میں اپنے قلم کو اظہار ضرور دینا چاہتی ہوں' ضرور دینا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ یہاں اس گاؤں کی اس چھوٹی سی حویلی میں جو میرا گھر ہے دفن ہو کر رہ جائے اسی لیے میں نے بہت سوچ سوچ کر آپ کو مخاطب کیا ہے کہ آپ ہی میری دانست میں واحد صحیح انسان ہیں' میں شکر گزار ہوں ٹی وی کی کہ آپ سے متعارف کرایا اور میں آج آپ کو یہ خط لکھ سکی۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ جواب سے نوازیں گے' منفی یا مثبت جو بھی ہو۔

والسلام۔

آپ کی مخلص۔

''نتالیہ''

اس کا خط روایتی اردو سے ہٹ کر روسی ادب کے ترجمہ شدہ ناولوں کی زبان میں تھا..ایک سیدزادی اپنے آپ کو عیاں تو نہ کر سکتی تھی اس لیے وہ نتالیہ ہوگئی اور ایڈریس پر اس کے شکاری باپ کا نام تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہی ڈاک وصول کرتی تھی اور جان جاتی تھی کہ لفافے پر رودین کی تحریر ہے تو یہ اس کا خط ہے..اس میں کوئی خدشہ نہ تھا کہ شکاری جب اگر کبھی کبھار گھر موجود ہوتا تو ڈاک وصول کرنے کی ذمہ داری پھر بھی وہی نبھاتی تھی..

وہ دن بھی تھے جب آستانۂ رومی تک آنے والی کچی سڑک کو راتوں رات پختہ کیا

جانے لگا..گلیوں میں پکی نالیاں بن گئیں..کوڑے کے ڈھیر اٹھا لیے گئے..وردی پوش گاؤں کے ہر گھر میں..ہر کھڑکی میں سے سرسری طور پر جھانکتے چلے جاتے..

یہ وہی دن تھے جب ''بابا'' کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان زمانوں کا ایک حکمران اپنی نقلی بتیسی پر بمشکل اپنے ہونٹ پھیلائے اپنی عیار مسکراہٹ کو بمشکل سمیٹتا' مونچھیں سنوارتا..آستانۂ رومی میں حاضر ہوا..

بہت روز بعد پتری نے بابا کی سفید داڑھی تلے جو فراخ سینہ تھا اس پر سر رکھ کر اتنے آنسو بہائے کہ ان کے لبادے کو گیلا کرتے ہوئے وہ ان کے سفید بالوں تک پہنچے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے ان سے پوچھا ''بابا..آپ نے اس دُرّے لگانے والے اور پھانسیاں چڑھانے والے بہروپیے کو کیوں آستانے میں آنے دیا..'' تو بابا نے زندگی میں پہلی بار شرمندگی سے کہا ''پتری اسے میں نے تو نہیں بلایا تھا..وہ خود آیا تھا..''

''آپ نے اسے کیوں آنے دیا تھا؟''

''آستانے پر کوئی بھی آ سکتا ہے پتری..''

''چاہے وہ بہروپیا ہو..''

''ہاں..کہ یہ فیصلہ کرنے والوں میں سے ہم نہیں ہو سکتے کہ کون روپ میں ہے اور کون بہروپ میں..آج کے روپ کل کے بہروپ ہیں اور آج کے بہروپ کل کے روپ بھی ہو سکتے ہیں..ہم فیصلہ کرنے والوں میں سے نہیں ہو سکتے..''

''ہو سکتے ہیں بابا..ہم ہی فیصلہ کرنے والوں میں سے ہیں..اگر ہمیں اختیار نہیں تو اور کس کو ہے..''

''تُو تو سیانی ہوگئی ہے پتری..'' بابا نے اس کے گیلے رخساروں پر ایک بوسہ دیا ''تو تلاش میں ہے..اور یہ جان لے کہ آج جو فیصلے ہو رہے ہیں وہ کل کو باطل ہو جائیں گے..یہ بتا کہ سوان کا کوئی خط آیا ہے؟''

''ہاں..''

''وہ اسی طور ابل رہا ہے لاوے کی مانند پگھل رہا ہے..''

''ہاں بابا..وہ آپ کی مانند خلق خدا کے دکھ سے کٹ کر..لاتعلق ہو کر بیٹھ نہیں گیا..بابا اتنے برسوں سے آپ نے آستانے سے باہر قدم نہیں رکھا..آپ جانتے ہی نہیں کہ خلق خدا پر کیا

بیت رہی ہے..''

''پتری..'' بابا نے اس کے گھنے سیاہ بنگالنوں ایسے بالوں پر ہاتھ پھیرا'' تو تلاش کرتے کرتے کیسے واہموں میں گھر گئی ہے..'' انہوں نے اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے پتری پر نچھاور ہوتے ہوئے کہا'' ذرا میری داڑھی میں وہ پرندے تو تلاش کر جو اس میں گھونسلے بنائے بیٹھے ہیں..''

''نہیں بابا..اب میں بڑی ہوگئی ہوں..میں جانتی ہوں کہ آپ کی داڑھی میں پرندے نہیں ہیں..مجھے بے وقوف نہ بنائیے..'' وہ جیسے ان سے روٹھ گئی..

''پرندے ہیں..جو تلاش کرنے والوں کو مل جاتے ہیں..گویا تو نے اپنی تلاش ترک کردی..کیوں پتری..؟''

''نہیں بابا..''

''ہاں..تو دیکھ تو سہی..واہموں سے باہر آ کر دیکھ تو سہی..''

اس کی آنکھیں بھی اس کے سیاہ بالوں ایسی سیال اور سیاہ جھیلوں ایسی تھیں..انہوں نے بے یقینی میں پلکیں جھپکتے دیکھا کہ بابا کی سفید ریشمی داڑھی کے بھیتر میں سے..اس کے بالوں میں سے مختصر اور ناخنوں جتنے چھوٹے چھوٹے پرندے خوش رنگ پرندے..پھڑ پھڑاتے ہوئے سفید بالوں کی دُھند میں سے نمودار ہو رہے ہیں..

کسی ایک چھوٹے سے پرندے کے گلے میں اس کے سیّد زادی ہونے کا طوق ہے..

ایک اور غم آسیب پنچھی کے گلے میں چاندی کی ایک صلیب لٹک رہی ہے..

اور..بابا کی سفید ریش میں سے برآمد ہونے والا ایک پرندہ ایسا بھی ہے جس کے بال و پر تمام تر سرخ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں..

ان میں سے کون سا پرندہ ایسا ہے جس کی نتالیہ کو تلاش تھی..

سارے پرندے..کچھ طوق گلے میں سہارتے..ایک صلیب کا بوجھ برداشت کرتے اور بیشتر سرخ رنگ میں رنگے ہوئے بابا کی داڑھی میں سے نکل کر اس کے..پتری کے آس پاس پرواز کرنے لگے..وہ اس میں سے چہچہاتے ہوئے یوں غول کے غول برآمد ہوتے تھے' جیسے چھتے کے چھیڑنے سے اس میں سے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی نکلتی ہیں..

وہ بہت مختصر اور چھوٹے چھوٹے تھے..انگلی کی پور کی جسامت اتنے..ناخنوں جتنے..

داڑھی کے سفید راکھ جنگل میں سے نکلتے اس کی سفیدی کے پس منظر میں ان کے پروں کے رنگ

آنکھوں کو خیرہ کرتے..

نتالیہ کی سیال آنکھوں میں جو بے یقینی اور اچنبھا تھا' وہ دھیرے دھیرے سکون اور یقین میں بدلا..

وہ ان کے چہچہاتے غول میں سے جو حجرے کے گنبد کو بھی بھر رہا تھا وہ پرندہ تلاش کرنے لگی جو اس نے آستانۂ رومی کے دنیا جہان سے کٹے ہوئے ماحول میں..سوان کے روانہ کیے ہوئے روسی ناولوں کے اردو ترجمے میں..اور اس کھلی سرسبز تنہائی میں جو ان کے گاؤں کے آس پاس اتری ہوئی تھی..اس میں اس نے..نتالیہ نے تخلیق کیا تھا..

اس کے کچھ جذباتی..رومانی اور کچے معیار تھے..انہیں مارکس اور لینن کی تعلیمات نے اور چاندی کی صلیب نے کسی حد تک پکا دیا تھا..سیدزادی ہونے کی نسبت سے اس کی کچھ مجبوریاں تھیں جن سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتی تھی..اس خانقاہی ماحول سے بے شک جسمانی طور پر نہ سہی لیکن روحانی حوالے سے فرار ہونا چاہتی تھی چنانچہ اس نے اپنے لہو میں ایک اپنا من پسند تصوراتی روسی ناولوں کے کسی مڈل ایج کردار کی سوچ اور چال ڈھال ایسا ایک پرندہ تخلیق کر رکھا تھا..یہ اس کے لہو میں ہمہ وقت تیرتا تھا..اسے گہرا یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کا وجود ہے پر کہاں..

وہ اسی خود ساختہ..اپنی پسند کے رنگوں میں رنگے ہوئے پرندے کو بابا کی داڑھی کے گھنے پن کی سفیدی میں سے نکلتے ہوئے پرندوں میں تلاش کرتی تھی..

لیکن وہ وہاں نہیں تھا..

ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب بے انت ناخنوں پوروں جتنے پکھیرو جو اس کے بابا کی سفید ریش میں جانے کب سے..نسل در نسل چلے آئے تھے اور آج تک تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملے تھے' یہ سب اس کی..نتالیہ کی اپنی ذات کے پرتو تھے..عکس تھے..اسی لیے تو کسی کے گلے میں چاندی کی صلیب لٹکتی تھی..کوئی اپنے بھاری طوق کو مجبوراً سنبھالتا تھا اور کوئی شفق کی سرخی میں ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا..

اس کی سیال کھلی بھنورا سیاہ آنکھوں کے پانی گہرے اور اتھاہ تھے اور کسی ایک پرندے نے اس کی ناک کی قربت میں آ کر ان دو جھیلوں کو دیکھا اور وہ ان میں سے کسی ایک میں ڈوبنے کے لیے اپنی پرواز کا رخ بدل کر ان میں اتر گیا..یہ گویا اک اشارہ تھا کوچ کا نقارہ تھا' بقیہ پرندوں نے بھی اس کی پیروی کی اور آہستہ آہستہ سب کے سب حجرے کے گنبد سے ٹکراتے ایک زندہ

پھڑ پھڑاتے ہوئے بادل کی صورت نیچے آنے لگے..

غول کے غول رنگوں کے ڈھیر گرنے لگے..وہ سب نتالیہ کی کھلی آنکھوں میں اتر کر ان میں ڈوبتے گئے یہاں تک کہ حجرے میں کوئی ایک پرندہ بھی باقی نہ رہا..ان کی پرواز کی سرسراہٹ کا ایک واہمہ موجود رہا اور چند روئی کے ریشوں ایسے پَر جو دھیرے دھیرے نیچے آتے تھے اور نتالیہ کے گھنے بنگالی بالوں کی سیاہی پر اترتے تھے..

وہ اگر اس لمحے آئینہ دیکھ لیتی تو اپنے آپ کو آج سے تیس برس بعد دیکھ لیتی..

بال سفید ہو چکے تھے..روئی ایسے سفید ریشوں ایسے پَر انہیں ڈھانکتے تھے..

''تو نے دیکھا 'پتری..'' بابا نے اپنی ٹھوڑی نیچے کر لی اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو پروں کی سفیدی شاید ان کی ہتھیلی میں جذب ہو گئی ''تو نے دیکھا 'پتری..واہموں سے باہر آ کر دیکھا..''

نتالیہ نے شاید صدیوں بعد پہلی بار آنکھیں جھپکیں..''ہاں بابا..''

''اور ان میں وہ پرندہ نہیں تھا جس کی تو تلاش میں ہے..نہیں تھا؟''

بابا دلوں کے بھید جانتے ہیں..اس کے بدن میں خوف اور ندامت کی ایک لرزش لہر در لہر ٹھاٹھیں مارنے لگی..وہ ترگنیف کے ناول ''رودین'' میں سے زندہ ہوا تھا اور اس کے تخیل نے اس کی مانگ کی تھی..اور ایک سیدزادی کے لیے اس سے بڑا گناہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ ایک غیر کے خیال کو..اپنے لہو میں ایک پرندے کی مانند تیرنے دے..وہ جانتی تھی کہ ایسے بہت سارے فقیر اور بابے ہیں جو مر چکے لوگوں سے ان کے عزیزوں کو ملا دیتے ہیں اور وہ آپس میں باتیں کر سکتے ہیں..وہ سچ مچ نمودار نہیں ہوتے بلکہ ایک دھند کی صورت اس کمرے میں اترتے ہیں جہاں وہ فقیر کلام پڑھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں..اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ سائل کو اپنی روحانی قوت سے متاثر کرنے کی خاطر کوئی ایسا عمل کرتے ہیں کہ وہ اپنے آس پاس لاتعداد کبوتر اڑتے ہوئے دیکھتا ہے..ان کا حجرہ کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور غٹرغوں سے بھر جاتا ہے اور پھر پل دو پل میں وہ سب غائب ہو جاتے ہیں..کیا بابا بھی ایک ایسے ہی شعبدہ باز ہیں..

''پتری..تو شک کی دھند میں اتر گئی ہے..یہ تجھے متاثر کرنے کی خاطر نہیں تھا..اس میں میرا کوئی عمل نہیں..یہ تو خود تھی..سب کے سب تیرے سائے تیرے عکس تھے..تو بچپن سے انہیں میری داڑھی میں تلاش کرتی آئی ہے اور آج تو بے یقینی اور شک میں تھی اس لیے یہ نمودار

ہوئے تجھے یقین میں لے جانے کے لیے..اگرچہ ان میں وہ پرندہ نہیں تھا جو تو نے تخیل کی کنواری مٹی کو گوندھ کر بنایا تھا..نہیں تھا؟''

''نہیں بابا..''

''جان لے کہ یہ تجھے نہیں ملے گا..''

''میں..اپنے خاندان کی دوسری لڑکیوں کی مانند یونہی ایک بیکار اور بے مقصد زندگی بسر کر کے..خاوند کے آگے سر جھکا کر..یونہی خوابوں کے بغیر مر جاؤں گی؟''

''میں مستقبل میں نہیں جھانک سکتا 'پتری..غیب کا علم صرف خدا کو ہے..جان لے کہ یہ تیرے تصور کا پرندہ تجھے نہیں ملے گا..''

نتالیہ کا ڈر یکدم کافور ہو گیا..اس کے بدن کی لرزش تھم گئی..اس نے آنکھیں اٹھا کر بابا کے پر شفقت اور الوہی چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے آپ سے کہا..بابا آپ نہیں جانتے میں تصور کے اس پرندے کو پہلا خط لکھ چکی ہوں..مجھ پر وہ جن بلکہ شاہ جنات آ چکا ہے جو ہماری روایت میں ایک سیدزادی پر آ ہی نہیں سکتا..وہ آ چکا ہے..

تسلیمات!

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے خط نے آپ کو بور نہیں کیا۔ جب کافی دن آپ کے خط کے انتظار میں گزر گئے تو میں نے سوچا مارو گولی! یہ سب شہرت یافتہ لوگ ایسے ہی مغرور اور فضول ہوتے ہیں۔ میں نے کیا حماقت کی کہ اپنے چالیس پیسے اور کاغذ اور الفاظ و خیالات ضائع کیے۔

مگر پھر آپ کا خط آ گیا یقین کریں کہ حیرت اور مسرت نے مجھے بالکل مبہوت سا کر دیا۔ آپ دلچسپ اور خوش مزاج انسان لگتے ہیں مگر ساتھ ہی حقیقت پسند اور صاف گو بھی۔

آپ نے مجھے لکھنے کے متعلق جو مشورے دیئے ہیں قابل غور ہیں اور میں ان کے لیے آپ کی ممنون ہوں۔ آپ یقین کریں کہ میں لکھنے کے معاملے میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ناول ایک وسیع کینوس ہے لیکن جب آپ کے پاس حقیقت میں کچھ کہنے کو ہو مشاہدات اور احساسات کی گہرائی اور شدت ہو تو

یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے نا کہ آپ افسانوں کی چھوٹی چھوٹی ندیوں سے گزرے بغیر ایک دم سمندر کے کھلے پانیوں میں محوِ سفر ہو جائیں۔ مجھے علم ہے کہ اکثر کامیاب ناول نگار' افسانہ نگار پہلے بنے تھے اور بنے رہے لیکن ایسی مثالیں بھی تو ہیں خاص طور پر غیر ملکی ادب میں کہ لوگوں نے محض 15 سال کی عمر میں پہلی بار ہی ایک ناول لکھا اور مقام بنالیا۔ اگرچہ وسائل کے اعتبار سے ہمارے ملک میں کسی کے لیے ایسا کرنا بہت مشکل ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ ذہن کے لحاظ سے ایسا ممکن ہو۔ آپ نے فرمایا ہے کہ ناول کے لیے تجربہ' مطالعہ اور عمر چاہیے اور مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق بھی ہے۔ تجربے کے لیے میرے خیال میں عمر کی قید نہیں ہوتی۔ اگر آپ کا ذہن حساس اور بیدار ہے' اقبال کے بقول آپ کے پاس ایک دیدۂ بینا بھی ہے تو آپ بچپن سے ہی تجربہ کار بننا شروع ہو جاتے ہیں اور اگر آپ بے حس ہیں تو شاید عمرِ خضر بھی آپ کو ایک فنکار کا سا احساس و تجربہ نہ دے سکے۔

دوسری بات مطالعے کی ہے آپ کو کیا بتا سکتی ہوں یوں سمجھئے کہ میرے تمام پیسے عام طور پر فلموں یا میک اپ کی چیزوں یا کپڑوں کی بجائے عام طور پر کتابوں کی خرید یا کرائے پر خرچ ہوتے ہیں اور اچھی کتابوں پر۔ مثلاً میں نے آدم جی انعام یافتہ تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ قرۃ العین' عزیز احمد وغیرہ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ قاسمی صاحب کو پڑھا ہے۔ جوش تک کو پڑھا ہے۔ پہلے یہ سب کتابیں اکثر میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں مگر اب سمجھ آتی ہیں اور غیر ملکی ادب میں بھی بہت سے ادیبوں کو پڑھا ہے۔

خیر آپ کی تمام باتوں پر عمل کے طور پر میں نے سوچا ہے کہ اپنی ناول کو دو چار ماہ کے لیے بالکل بھول جاتی ہوں اور اس کے بعد دوبارہ پڑھوں گی (میں نے کہیں پڑھا بھی تھا کہ کسی تحریر کو مکمل کرنے کے بعد چند ماہ بعد پھر نظرِ ثانی کرنی چاہیے) اور پھر سکون سے خامیاں دور کر کے دوبارہ لکھوں گی اور آپ کو بھیجوں گی۔ لیکن اس سلسلے میں بہت سی قباحتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کیا ضمانت ہے کہ چند ماہ بعد بھی آپ مجھے یاد رکھیں گے اور یہ خاص طور پر یاد رکھیں گے کہ آپ نے میری کتاب پڑھنے اور مدد کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ آپ نے لکھا ہے کہ میں

کسی بھی اُمید کو دل میں جگہ نہ دوں تو اس کا تو مطلب ہے کہ میں لکھوں ہی نہیں۔ جب اُمید ہی نہ ہو تو لکھنے کا کیا فائدہ۔ تیسری بات پبلک ریلیشنگ کی ہے۔ آپ کو بتاؤں کہ گاؤں کا ماحول اور سادات سے تعلق (اور بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وہ جو اپنے ہونے والے ''مجازی خدا'' ہیں ان کا تعلق تو اسی علاقے کے ایک پیروں کے سلسلے سے ہے۔ دیکھئے میں کوئی بے شرم لڑکی نہیں ہوں لیکن چونکہ آپ سامنے نہیں ہیں اس لیے آپ کو اتنی ذاتی بات لکھ دی ہے لیکن اس اعتماد کے ساتھ کہ آپ اتنے وضعدار گھرانے کی ایک پردہ نشین لڑکی کے خط کو رسوا و عام نہیں کریں گے۔ آپ کے دل میں سادات کا کچھ نہ کچھ احترام تو ہوگا) یہ سب میرے لیے مشکلیں ہیں یا پابندیاں ہیں۔ میرا ماحول تو ایسا ہے کہ مجھے آپ کو خط ہی نہیں لکھنا چاہیے تھا' شاید غلطی کر رہی ہوں' شاید میرے اندر کوئی بڑی غلط لڑکی چھپی بیٹھی ہے' شاید لکھنا ہمارے خاندان میں غلط کام ہے۔ بہرحال میں کچھ کرنا ضرور چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے ادب میں۔

''نتالیہ''

رودین ایک آسیب کی مانند اس پر مسلط ہو چکا تھا.. ایک ان دیکھا شخص اس سے تقریباً دوگنی عمر کا ایک شادی شدہ شخص.. چار بیٹوں کا باپ جس کی اس نے آواز تک نہیں سنی تھی..

ٹیلی ویژن پر چند ادبی پروگراموں میں دیکھنا تو کوئی دیکھنا نہیں ہوتا.. کسی ادبی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اسے سننا تو کوئی سننا نہیں ہوتا.. ایک بالواسطہ دیکھنا اور سننا.. نہ دیکھنا ہوتا ہے اور نہ سننا..

واسطہ صرف خطوں پر لکھے ہوئے حرفوں سے.. اور ان حرفوں میں بھی اس کی جانب سے کوئی تسلی کوئی دلاسا نہ تھا.. بلکہ وہ کسی اور کا اسیر تھا.. کسی اور کی قید میں تھا اور وہ اس اسیری میں خوش تھا.. اس قید میں پُرمسرت زندگی بسر کرتا تھا.. اور وہ کڑھتی تھی.. ہر سویرا اپنے آپ کو آئینے میں تکتی تھی کہ میرے بنگالی بالوں گوری رنگت اور سیاہ آنکھوں کے تو ہر سو چرچے ہیں.. خاندان کے ہر لڑکے کی خواہش.. حصول کی خواہش وہ ہے تو وہ کون ہے جس کے لیے رودین ایسا وقف ہوا ہے کہ میرے لیے تسلی اور دلاسے کا ایک حرف بھی اس کے پاس نہیں.. وہ اس نامعلوم.. رودین کے عشق

خاص سے کوئی عداوت نہیں رکھتی تھی..اسے قبول کرتی تھی..اگرچہ بے حد حسد کرتی تھی..لیکن اس شراکت کو قبول کرتی تھی..

تسلیمات!

آپ کا عنایت نامہ مل گیا تھا۔ بے حد مشکور ہوں اور مسرور بھی تاہم ہنسی آتی ہے کہ میرا خط آپ جیسے انسان کے لیے ''بصیرت افروز'' (کہ آپ نے ایسا لکھا ہے) کیسے ہوگیا....بہرحال حُسنِ ظن یا ذرہ نوازی ہے آپ کی جو چاہیے کہیے ع جو چاہے آپ کا ذہنِ کرشمہ ساز کرے۔

اس خط میں آپ نے اتنی حیرت ناک' اتنی خوبصورت' اتنی یادگار سی باتیں لکھی ہیں کہ لگتا ہے جیسے آپ ''رُودین'' نامی روسی ناول کے رُودین ہیں بالکل (مرکزی کردار) جو کہ ایک بیوہ رئیس زادی کی دعوت پر اس کے گاؤں کے محل میں چند دن گزارنے آتا ہے اور اپنی باتوں' علم معلومات اور قابلیت والی دلنشیں گفتگو کے سحر سے اس کی بیٹی نتالیہ کے سادہ' نوخیز اور کم علم رکھنے والے معصوم دل و دماغ کو اس طرح مسحور کر ڈالتا ہے کہ آخر ایک دن اسے اس لڑکی کو اپنی شخصیت کے سحر سے آزاد کرانے اور حقیقتوں کی طرف لوٹانے کے لیے وہاں سے رات کو بغیر اطلاع کے روانہ ہونا پڑتا ہے۔ایسی منزل کی طرف جس کا پتہ ونشان وہ کسی کو نہیں دیتا پھر بالکل آخر میں وہ انقلاب کی جدوجہد میں مارا جاتا ہے۔

سوان میرا بھائی بھی کم عمری میں ماسکو گیا ہے یعنی اپنی اٹھارہویں سالگرہ اس نے وہاں جا کر منائی تھی اور سالگرہ کس طرح منائی تھی خوب تصویریں بھیجی تھیں ہمیں۔ یہاں تو ہم اس کی سالگرہ بس سادگی سے منا لیتے تھے اس کا جنم دن۔اور کیک کی بجائے امی کے پاس سُوت کی ایک سَت رنگی خوبصورت لڑی ہے اس میں ہر سال ایک چاندی کا Ring پرو دیتے ہیں۔ہائی سکول میں ہی اس کی دوستی اپنے ایک دوست کی وجہ سے بڑے بڑے عجیب وغریب لوگوں سے ہوگئی تھی جیسے دادا امیر حیدر...ان سب کی باتیں وہ صرف مجھے سناتا تھا اور میں یقین ہی نہ کرتی تھی مگر آخر ایک دن اس کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے یا

اپنے دوستوں کی مدد سے وہ پڑھنے کے لیے وہاں چلا گیا جہاں جانا ہمیں بالکل ناقابل یقین اور خواب لگتا تھا۔

اکثر میں چاہتی ہوں کہ میں اگر بزرگوں کی رضا وروایات کو نہیں توڑ سکی تو کاش میرا کوئی بھائی ہی ایسا کردے اور دعا مانگتی ہوں کہ میرا چھوٹا بھائی ضرور باہر سے شادی کرلائے تو میرے لیے بے حد مسرت بخش بات ہو۔آپ شاید ہنسیں میں سوچتی ہوں کہ اگر مجھ میں حوصلہ ہوتا اور حق حاصل ہوتا تو میں محض یہ روایت توڑنے کے لیے کہ ''غیر سیّد'' ہمارے خاندان میں شامل نہیں ہوسکتا کسی غیر سیّد سے ہی نہیں غیر قوم کے فرد سے شادی کر ڈالتی چاہے وہ کوئی نیگرو یا افریقی ہی کیوں نہ ہوتا۔

دیکھیں جناب آئندہ مجھے ''پیرنی'' جیسا فرسودہ اور دقیانوسی لفظ نہ لکھیں مجھے اپنے بابا (جو کہ اصل میں ہمارے تو دور کے رشتہ دار ہیں) اگر پسند ہیں تو اس لیے کہ وہ بہت مہربان' بہت میٹھے اور شفیق انسان ہیں۔ بے غرض ہیں کوئی نذرانہ وغیرہ لوگوں سے بالکل نہیں لیتے' بہت عابد وزاہد بھی ہیں' اتنے دھیمے اور میٹھے لہجے میں وقار سے گفتگو کرتے ہیں کہ آپ بالکل سحر زدہ پاتے ہیں خود کو۔ اور ان کی آنکھیں تو اتنی شفیق' اتنی مہربان' اتنی گہری لگتی ہیں کہ جب وہ آپ کی طرف دیکھتے ہیں تو آپ کا دل خود بخود ان کے قدموں میں جھکنے کو چاہنے لگتا ہے۔ دربار پر وہ رہتے ہیں ہمیشہ (جو ہمارے اور ان کے گاؤں کے درمیان میں واقع ہے تقریباً ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ''آستانہ رومی'' کہلاتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر شاید صدیوں پہلے ہمارے بزرگ مشہد سے ترک وطن کر کے یہاں آئے تھے) میں اکثر جب بہت بیزار ہوتی ہوں دنیا سے اور اپنے آپ سے تو وہاں جاتی ہوں اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت سیر گاہ ہے۔ باغات' روشیں' گہری چھاؤں' خاموشی' سکون' تنہائی اور خوشبوئیں اور تتلیاں اور ہمارے بزرگوں کی قبریں مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے اور وہاں ہم صرف ایک چادر لپیٹ کر جاسکتے ہیں۔ بابا بھی مجھے بہت پسند کرتے ہیں اور بابا کا ٹوائیلٹ آپ حیران رہ جائیں اگر دیکھیں ایسا ہے جیسے کسی نواب کا (ان کے تربیلا کے کسی مرید نے بنوا کر دیا ہے) سنگ مرمر اور بہترین ماربل کی دیواریں اور فرش' فرانسیسی واشنگ بیسن وٹب وغیرہ اور اتنے بے شمار

غیر ملکی ٹوتھ پیسٹ' لوشن' کریمیں اور عطریات کہ چرانے کو دل چاہے مگر بابا خود کچھ بھی استعمال نہیں کرتے جو مرید باہر سے آ کر ٹھہریں اور معزز ہوں وہ استعمال کرتے ہیں۔ میں جب بھی جاتی ہوں بہت سعادت مندی سے بابا کے لکھائی پڑھائی کے کچھ کام کر دیتی ہوں (جن سے سب بھاگتے ہیں) اس لیے وہ مجھ پر زیادہ مہربان ہو جاتے ہیں۔ ان کے تمام ذاتی کمروں اور مہمان خانے میں بھی کبھی کبھی گھومتی رہتی ہوں۔ ایک دفعہ بہت مزہ آیا کہ جو خاص مقبرہ ہے بابا کے والد کا ایک گنبد میں وہاں عام عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی مگر میں جا سکتی ہوں تو ایک شام میں وہاں گئی کہ اگر بتیاں اور موم بتیاں لگا دوں جا کر تو وہاں ایک شخص ہلکی گرم چادر کندھوں پر ڈالے قرآن پاک پڑھ رہا تھا۔ اتنا محو تھا کہ اسے میرے اندر جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ ایک نوجوان شخص تھا اور سفید ٹوپی کے نیچے اس کے کچھ لمبے لمبے براؤن سنہرے بال بہت خوبصورت تھے اور ایسی ہی مونچھیں تھیں تھوڑی تھوڑی (بعد میں اس کی آنکھیں بھی براؤن نکلیں) وہ سورۂ رحمان پڑھ رہا تھا بآواز بلند... پھر ختم کر کے جب اس نے دعا مانگی' سر اٹھایا تو مجھے وہاں کھڑے دیکھا اور میں نے اندازہ کیا کہ سخت حیران رہ گیا۔ میں دل میں بڑی خوش یونہی کھڑی رہی تو اس نے گھبرا کر ایک دم پوچھا اور حیرت ہے کہ صاف اردو میں مگر پٹھانی لہجے میں کہ تم کون ہو یہاں عورتوں کا اندر آنا منع ہے۔ پتہ نہیں کیسے میں بھول گئی کہ میں بابا کی عزیز ہوں اور میں نے بڑے سکون اور شرارت سے اسے کہا میں وہی ہوں جن کا ذکر ابھی تم نے سورۂ رحمان میں پڑھا ہے (آپ کو بھی پتہ ہوگا کہ سورۂ رحمان میں جنوں اور حوروں کا ذکر ہے) آپ یقین کریں کہ وہ اس قدر بوکھلایا' ایک دم کھڑا ہو گیا اور مجھے دیکھتا رہ گیا۔ تب میں نے سوچا کہ اس پر رعب جما دوں کہیں یہ کوئی نامناسب جواب نہ دے کہ آخر میں بابا کی عزیزہ ہوں۔ اس لیے میں نے سنجیدگی سے کہا کہ میں یہاں آ سکتی ہوں کیونکہ یہ مقبرہ میرے نانا کا ہے اور بڑھ کر مزے سے اگر بتیاں لگانے لگی اور اس کی طرف دیکھا تک نہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ وہ تھوڑی دیر یونہی کھڑا رہا جیسے سکتے میں ہو گیا ہو۔ یہ بات سن کر اور مجھے پشیمانی اور شرمندگی ہونے لگی کہ میں نے سورۂ رحمان والی بات کیوں کہہ دی تھی۔ میں پہلے ہی

اسے سچ بتا دیتی' اب وہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں.. پھر وہ چپ چاپ باہر نکل گیا البتہ جاتے جاتے دروازے میں سے اس نے ایک دفعہ مڑ کر دیکھا مجھے اور افسوس کی بات یہ تھی کہ تب میں خود بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ بس اس کے بعد میں نے اسے کبھی وہاں نہیں دیکھا' پتہ نہیں وہ کون تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں یہ واقعہ کبھی بھول نہیں سکتی بھلا آپ ہی بتائیں اتنا خوبصورت واقعہ کوئی بھلا بھول سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود وہ بھی نہیں بھول سکے گا۔

''نتالیہ''

ایک مڈل ایج شادی شدہ.. چار بیٹوں کا باپ شخص اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ اسے کسی اور کے حسن اور اسیری کی داستانیں سناتا تھا.. اور اس کے باوجود وہ اپنے تخیلاتی رودین کے عشق سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی.. اپنی کوکھ میں صرف اس کے بچے کی آرزو کرتی تھی.. یہ بے وجہ اور بے جواز لگن اسی لیے تھی کہ وہ ایک نادیدہ عشق کے ہاتھی تلے روندی جا چکی تھی.. اس نڈھی کے تھاؤں تھائیں بھی عشق یوں بولتا تھا کہ بابا کو بھی خبر ہو گئی تھی..

سٹرینج آر دے ویز آف لو..

محبت کے راستے بہت عجیب ہوتے ہیں..

لیکن یہ راستے کچھ زیادہ ہی عجیب تھے..

ان میں اگرچہ عمر کا کچا پن.. خانقاہی ماحول کی گھٹن.. کانونٹ کے برآمدوں میں چلتے ہوئے مریم کے مجسمے کو دیکھ کر.. یکدم رک کر اس کے سامنے سر جھکا دینے کی بے اختیار خواہش.. مارکس اور لینن کے اقوال اور روسی ناولوں کا ماحول اور کردار شامل تھے.. پھر بھی یہ راستے کچھ زیادہ ہی عجیب تھے..

یہ راستے اتنے عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والے تھے کہ وہ اپنے احساس گناہ سے کبھی نجات حاصل نہ کر سکتی.. نہ اسے دیکھنا نہ اسے سننا اور محض خطوں کے رابطے سے اس کے سامنے اپنے دل کو کھولنا.. ہر رگ اور شریان میں اس کی.. اس رودین پرندے کی موجودگی کا اقرار کرتے چلے جانا..

یہی احساس گناہ تھا جو اسے رلاتا تھا اور وہ اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی.. شاید

یہ لذت گناہ تھی جو اس خانقاہی ماحول اور خاندانی حسب نصب کی جکڑ بندیوں میں اسے زندہ رکھے ہوئے تھی..

سال بھر میں صرف ایک شب آتی ہے..شب عاشورہ..

وہ آپا ثریا کی سیاہ پوشی کے برابر میں.. بابا کے حجرے کے باہر بیٹھی ہوئی..خود بھی ایک ماتمی سیاہ شلوار اور قمیض میں جو اس کے گورے رنگ پر خوب پھبتی تھی وہ قرآن پاک سامنے رکھے اپنی سیال آنکھیں مقدس ترین حرفوں پر رکھے..انہیں پڑھتی جاتی ہے اور سیال آنکھوں کے اندر جتنی بھی جھیلیں ہیں' ان کے پانی آنسوؤں کی صورت میں مقدس اوراق پر ٹپ ٹپ گرتے چلے جاتے ہیں اور ان کی نمی سے وہ آیات گیلی ہو کر کچھ کا کچھ مطلب نکالتی چلی جاتی ہیں۔ جب بابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں ''پتری..غم حسین میں تو کوئی اتنا نہیں روتا..تجھے کیا غم ہے..''

بابا دلوں کا حال جانتے تھے اس لیے اس نے کچھ نہیں کہا..صرف قرآن پاک پر اپنی سیال آنکھوں کو بچھایا تو وہاں آیت تھی ''پس ہم حال جانتے ہیں تمہارے دلوں کا..مگر تمہارے لیے پہچان ہے ہر چیز میں..تم علم سے کیوں نہیں دیکھتے..''

'تو بے شک سب دلوں کا حال جانتا ہے لیکن تُو میرے ایک اس دل کا حال کیوں نہیں جانتا..

اس نے..نتالیہ نے صرف یہ سوچا اور پھر مزید روتے ہوئے گڑگڑا کر معافی مانگی کہ میں نے یہ کیسا سوال کر دیا ہے..

بابا چپ اسے دیکھتے رہے..قرآن پاک پر جھکے اس نے اپنے آنسو چھلکاتے ہوئے اور پھر انہوں نے اپنی سفید ریش پر ہاتھ پھیر کر دل ہی دل میں وہی کہا جو وہ کہہ چکے تھے..'پتری..غم حسین میں تو کوئی اتنا نہیں روتا..تجھے کیا غم ہے..''

محمد علی ڈاکیا..اتنی طویل مدت کے بعد اس بنگالی آنکھوں کی حامل ایرانی خدوخال والی..کہ اس کے بزرگ وہیں سے آئے تھے اور اپنی نسل میں ملاوٹ نہیں ہونے دیتے تھے..اس خاتون کا خط بھی تو لا سکتا تھا..

یہ خاتون ایک مفروضہ نہیں..ایک فرضی خیالی کردار نہیں..

فرضی اور تخیلاتی کردار کبھی اتنے جاندار..اتنے ناقابل یقین..اتنے عام زندگی کے بس

میں نہ آنے والے اور عجیب نہیں ہوتے..

ایک مصنف ایک خاص حد تک ہی فرض کر سکتا ہے..تخیل کی پرواز بھی ایک محدود دائرے کے باہر جانے سے قاصر ہوتی ہے..ایک کردار تخلیق کی ایک قید میں ہی سانس لے سکتا ہے۔اس کے باہر لے جانے سے وہ مردہ ہو جاتا ہے..جب تک کہ اس میں حقیقت کے نشے کی آمیزش نہ ہو..

تو یہ کردار اس خاص حد سے پرے..محدود دائرے میں سے نکل کر..اس تخیلاتی پرواز کی حدیں عبور کر کے تبھی زندہ رہتا ہے جب اس میں حقیقت کے کچھ عکس ہوں..

اس حقیقت کا ادراک تب ہوتا ہے جب اس کردار کا پیرایۂ اظہار اور لہجہ..لکھنے والے کے پیرایۂ اظہار اور لہجے سے بغاوت کر کے خود ایک الگ راستے پر چل نکلتا ہے..باغی ہو جاتا ہے..

نتالیہ کا جو لہجہ تھا..وہ سراسر بغاوت کے حروف سے آراستہ تھا..

یہ خط ایک تخیلاتی رودین کو لکھے گئے...

ایک حقیقی نتالیہ کی جانب سے...

تسلیمات!

ویسے آپ کو بتاؤں میں خطوط کے معاملے میں گھر بھر کی ہی نہیں نصف گاؤں کی سیکرٹری ہوں۔ ہر روز کئی خطوط لکھنے اور پڑھنے پڑتے ہیں جو عورتیں لاتی ہیں یعنی وہ جو ملکۂ ترنم کہتی ہے ع چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے۔تو شاید میرے جیسے لوگوں سے کہتی ہے۔اس سب کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ میں اکثر رات کو سوتے سوتے بھی جاگ اٹھتی ہوں اور سوچتی ہوں میں کیا کر رہی ہوں۔ مجھے آپ کو خط نہیں لکھنے چاہئیں پھر اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اے رب تو جانتا ہے کہ میں کوئی گناہ نہیں کر رہی ہوں تو مجھے گھر میں سرخرو اور باعزت رکھنا جس طرح اب تک رکھا ہے تو جانتا ہے کہ میرے دل میں کوئی بری بات نہیں۔اگر گھر والے جان جائیں کہ میں آپ کو اس قسم کے خط لکھتی ہوں تو یہ ان کے لیے اس قدر حیرت ناک اور غیر متوقع بات ہو جیسے کہ کوئی کہے کہ امام خمینی نے شاہ کو تخت واپس کر دیا ہے۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

آپ کا خط اس قدر جلد ملا کہ میں حیران رہ گئی پھر اتنا اچھا' اتنا مہرباں خط کہ یقین فرمائیں بار بار پڑھتی ہوں اور ہر بار ایک نئی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر میں آپ کو خط نہ لکھتی تو اس عجیب خوشی سے کبھی آشنا نہ ہو سکتی جو اتنا پیارا خط پا کر کسی کو ہو سکتی ہے۔

ویسے مجھے آپ کا یہ خط پڑھ کر زیادہ احساس ہوا کہ آپ بالکل روسی ناول کے ہیرو ''رُودین'' کی طرح ہیں۔ اُسی طرح حقیقت پسند' ترقی پسند' ظلم کے خلاف اور ادیب۔ انسانیت اور آزادی کے پرستار۔ اسی طرح سنجیدہ اور عالمانہ باتیں لیکن خوبصورت اور پُراثر انداز میں اور اسی طرح اپنی عمر اور وقار کا احساس کہ رُودین نتالیہ (جو کہ صرف 18 سال کی تھی) سے تقریباً دگنی عمر کا انسان تھا اور ایک بار کسی بات پر باغ میں بیٹھے ہوئے کوئی بحث کرتے ہوئے وہ نتالیہ کو بتاتا ہے کہ میرے یہ کنپٹیوں کے سفید بال دیکھتی ہو۔ انہوں نے مجھے بہت تجربات دیئے ہیں جبکہ تم یہ تجربے کبھی نہ کر سکو گی اور نہ ہی تمہیں کرنے چاہئیں۔

میں نے جو وقت کانونٹ میں گزارا' وہ آج بھی میرے لیے ایک خوبصورت ترین خواب کی طرح ہے کہ دوستوں سے زیادہ مجھے خود کانونٹ پسند تھا۔ شفاف طویل برآمدے چکوتروں اور لیموں کے درختوں سے بھرا گھنا باغ' سرخ بجری کی روشیں' گھنی پھولدار جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی پُراسراری اور ان کے سائے میں چیس کی بنچیں جہاں انسان گھنٹوں خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہے پھر ایک پہاڑی (مصنوعی) پر مقدسہ مریم کا رنگین قد آدم (پتھر کا) مجسمہ گود میں حضرت عیسیٰ اور قدموں میں ایک گڈریے کا مجسمہ جھکا ہوا۔ پھر سکول کے باغ کی ایک دیوار ٹاپ کر ہم ملحق چرچ میں جا سکتے تھے وہاں چھپ کر اندر چوروں کی طرح دبے پاؤں چپ چاپ حضرت عیسیٰ کے بڑے بڑے مجسّموں اور تصویروں کے درمیان گھومتے رہنا مجھے بہت پسند تھا۔ غرض کانونٹ میں میرے لیے اتنی خوشیاں ہوتی تھیں' چھوٹی چھوٹی کہ میں انہیں آج بھی بھول نہیں سکتی۔ نیلی اور گہری براؤن آنکھوں والی سفید لبادوں میں ملبوس مدرز اور سسٹرز اور فادرز سب لوگ اتنے شرمیلے' مقدس سے' میٹھے

سے' دھیمے سے اور شفیق... آپ کو بتاؤں کہ وہاں سے میٹرک کر کے نکل آنے کے بعد میں ہمیشہ سنجیدگی سے سوچتی تھی کہ کاش میں ایک Nun بن سکتی۔ اپنی مدر انتھنی یا سسٹر جینٹا کی طرح لیکن جب مجھے اچھی طرح علم ہو گیا کہ ہمارے مذہب میں ایسی کوئی گنجائش نہیں تو مجھے بڑا افسوس ہوا جو آج بھی ہوتا ہے۔ چلیں پھر Nun بننے سے تو مذہب نے روک دیا تو پھر میرا آئیڈیل تھا کہ بہت مشہور صحافی خاتون بنوں' بہت تیز اور سرگرم قسم کی۔ ہر وقت مصروف عمل رہنے والی' ہر فنکشن' ہر مقام پر موجود یا پھر کوئی بہت مشہور شاعرہ بن سکوں۔ تمام مشاعرے اٹینڈ کرنے والی مگر میری یہ دو خواہشات بھی بالکل ناقابل عمل ہیں تو پھر بتایئے کہ میں کیا کروں۔ مجھے یہی خیال اکثر ہر چیز سے بے زار کر دیتا ہے کہ میں اپنی مرضی کے خلاف ایک بالکل عام اور روایتی زندگی گزار کر مر جاؤں گی اور گویا بالکل رائیگاں جاؤں گی۔

ہماری فیملی بلکہ برادری کو اس بات پر بڑا فخر اور طمانیت ہے کہ انہوں نے اپنی نسلوں کو ملاوٹ سے محفوظ رکھا ہے مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ اس حفاظت کی قیمت کس طرح ادا کی گئی ہے۔ اس طرح کہ ہماری کئی عزیز ایسی بھی ہیں جو اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور ان کی شادی محض اس وجہ سے نہیں کی گئی تھی کہ برادری میں کوئی لڑکا نہ تھا اور غیر برادری کا سید بھی قابلِ قبول نہ تھا پھر یہ مثالیں بھی ہیں کہ بیویاں شوہروں سے دس بارہ سال تک بڑی ہیں اور بعض دفعہ شوہر بیویوں سے بیس سال تک بڑے ہیں اور سب مان لیتے ہیں۔ لڑکے تک کوئی بغاوت نہیں کرتے (البتہ میرا خیال ہے کہ ایسا بے جوڑ رشتہ سوان کبھی نہ مانتا مگر خوش قسمتی سے اس کے لیے ایسا ہے بھی نہیں)

بابا اور آستانۂ رومی کے بارے میں آپ نے جو اشتیاق ظاہر کیا ہے مجھے وہ بڑا حیران کن لگا۔ میں نے سوچا کہ ایسا کبھی نہ ہو سکے گا کہ آپ ہمارے مہمان ہوں اور میں ایک گائیڈ کی طرح آپ کو دربار کا گوشہ گوشہ دکھاؤں شاید اگر آپ کی سوان سے دوستی ہو سکی تو پھر مہمان تو آپ ہمارے بن جائیں اور دربار بھی گھوم لیں مگر میں خود آپ کی گائیڈ تب بھی نہ بن سکوں گی حالانکہ یہ ایک بالکل بے ضرر خواہش ہے۔ میری شہر کی جو ایک دو سہیلیاں ہیں وہ کبھی اپنے مہمانوں کو لے کر

ہمارے گاؤں آتی ہیں پھر دربار پر جانے کی ضد ضرور کرتی ہیں۔ بڑا اچھا لگتا ہے انہیں بھی وہاں کا ماحول۔ پھر ہم وہاں جاتے ہیں اور بابا میری سہیلیوں کے خیال سے فوراً کسی خادم سے نفیس بلوریں پیالیوں میں قہوہ بنواتے ہیں (وہ ہمیشہ قہوہ ہی پلاتے ہیں چائے وغیرہ نہیں) خوشبودار اور مزیدار اور ساتھ مٹھائی' بسکٹ جو کچھ اس وقت میسر ہو سب کو اپنے ہاتھ سے دیتے ہیں۔ اپنے خاص کمرے میں بٹھاتے ہیں سب عزیزوں کو باہر بھیج کر۔ پھر ہم سب باہر آ کر باغ میں ایک گھاس کے چوکور خوبصورت قطعے میں بنے سنگِ سرخ کے چبوترے پر مزے سے جوتے اتار کر پیر اُوپر کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور خوب ہنستے اور باتیں کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ بابا کے دونوں خاص بوڑھے مرید یا خادم جو ازل سے ہم نے وہیں دیکھے ہیں پریشان اور خوفزدہ پھرتے رہتے ہیں کیونکہ اس چبوترے پر بابا کے علاوہ اور کوئی نہیں چڑھ سکتا اور لوگ اسے بوسے دیتے ہیں مگر ہم پرواہ نہیں کرتے اور بابا بھی دھیمی مسکراہٹ سے نظر انداز کر جاتے ہیں مگر ہم ایسا صرف جبھی کرتے ہیں جب دربار پر باہر کے مرید ٹھہرے ہوئے نہ ہوں۔ ویسے آپ کو بتاؤں بابا کو لوگ مانتے بہت ہیں۔ دُور دُور سے بھی آتے ہیں اور اکثر اپنی مرادیں پاتے بھی ہیں۔ کئی مرید اُن کے بہت امیر بھی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نے بابا کو مقبرے کے لیے ایران سے بہت خوبصورت دروازہ منگوا کر دیا ہے۔ بہت قیمتی اور رنگین کام کا۔

خمینی کی طرح وہ بھی زمین پر سوتے ہیں اور ان کی خواب گاہ میں ہاتھ کی بنائی ہوئی حضرت علیؓ کی ایک قدیم تصویر بھی ہے جو کہ کہا جاتا ہے کہ مشہد سے بزرگوں کے ساتھ آئی تھی۔ جب ہم وہاں جاتے ہیں تو اُسے چومتے ہیں مگر آپ کو بتاؤں میں نے اور سوان نے دل سے اس کی اصلیت پر زیادہ یقین کبھی نہیں کیا ہے۔ بابا کی ایک خوبی یہ بھی مجھے پسند ہے کہ وہ شیعہ اور سنّی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ اہلِ شیعہ سے زیادہ ان کے سنّی مریدین ہیں اور وہ اپنی زبان سے کبھی کسی کو بُرا نہیں کہتے حالانکہ ہمارے بعض عزیز کہتے ہیں کہ یہ ان کی مصلحت ہے مگر جو کچھ بھی ہے یہ حقیقت ہے کہ وہ دربار پر عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم کا عرس بھی کرتے ہیں جو کسی بھی شیعہ درگاہ پر کبھی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارے لوگ مانتے ہیں انہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ بابا بھی آپ کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس خوبصورت بات پر کہ سچ جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے کسی ایک جگہ نہیں ہے۔ میں ان دنوں محسوس کرتی ہوں کہ اگرچہ خمینی بہت اچھے انسان ہیں مگر جب وہ ظلم کرواتے ہیں' روزانہ گولیاں لوگوں کو اڑاتی ہیں تو دکھ مجھے بھی محسوس ہوتا ہے حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ میں ایک گھریلو سی لڑکی ہوں۔ مجھے ان سب باتوں سے کیا غرض مگر میں جیسے مجبور ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ فوجی بوٹوں نے کوڑوں اور مارشل لاء کے سر پر لوگوں کے ہونٹ سی دیئے ہیں' پتھر بنا دیئے ہیں لیکن کب تک۔ مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن آستین کا لہو ضرور پکارے گا۔ البتہ اس بات کا مجھے کامل یقین ہے کہ الیکشن ہوئے تو ہمارے گاؤں سے سوائے ملاؤں کے دو چار ووٹوں کے اور کوئی ووٹ کم از کم اتحاد کو ہرگز نہ ملے گا۔ عورتیں ابھی تک اس شہید کے لیے روتی ہیں اور اسے بھولتی نہیں ہیں حالانکہ یہ سب غیر سیاسی محنت کش لوگ ہیں جنہیں اس نے شاید کچھ بھی نہیں دیا تھا ماسوائے اس شعور اور احساس کے کہ وہ بھی انسان ہیں' ایک طاقت ہیں' برابری کا حق رکھتے ہیں اور مانگ سکتے ہیں اور یہی اس کا کارنامہ ہے کہ اس نے جان دے دی مگر لوگوں کو یوں جگا دیا ہے کہ اب وہ کبھی نہ سو سکیں گے۔ ہر عورت تک سیاست کی بات کرتی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے یا گوبر تھاپنے والی جاہل بے خبر عورت بھی۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ نے میرے خط کا جواب جان بوجھ کر نہیں دیا ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ میرے خط نے آپ کو ناراض کیا ہو۔ کیونکہ وہ جو میرے اندر کوئی خود پسند روح چھپی بیٹھی ہے وہ کہتی ہے کہ تم اتنی غیر اہم تو ہو نہیں کہ تمہیں کوئی بھی اس قدر جلد بھلا دے۔

لیکن آپ کی بات اور ہے آپ کچھ اور شخصیت ہیں اور میرا آپ سے رابطہ بھی صرف قلمی رہا ہے اس لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ واقعی مجھے بھول بھی چکے ہوں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر آپ مجھے خط لکھنا نہیں چاہتے تو بھی کوئی بات نہیں کیونکہ آپ ایک بے حد بے حد بے حد اچھے انسان ہیں اس لیے اگر آپ میرے خط کا جواب نہیں دے رہے تو اس میں ضرور میری کوئی بہتری ہوگی کیونکہ کسی کے ساتھ کوئی بُرائی یا تکلیف دینے کا کام تو آپ کبھی کر ہی نہیں سکتے۔

میں چاہتی تھی کہ آپ کو سال نو کی مبارکباد دوں اور ایک خوبصورت کارڈ کے ساتھ دوں لیکن ایک تو موسم اس قدر بدترین ہے کہ شہر جانے کا سوال ہی نہیں اور پھر والد صاحب نے کہا کہ بھائیوں کو بھی نئے سال کے مبارکبادی کارڈ نہ بھیجو کہ یہ ہم مسلمانوں کا رواج نہیں ہمارا سال تو محرم سے شروع ہو جاتا ہے۔

آپ بے شک میرے خط کا جواب نہ دیں میں انتظار نہیں کروں گی ویسے مجھے اس بات پر افسوس ضرور ہے کہ آپ نے اب مجھے بھی ان بے شمار لوگوں میں شامل کر ڈالا جن کے خطوط کے جواب آپ نہیں دیا کرتے اور جواب نہ دے کر یقیناً آپ مجھ سے آپ کو خط لکھنے کا حق واپس لے رہے ہیں اس لیے خودداری کا تقاضا یہی ہے کہ میں بھی اب یہ حق استعمال نہ کروں۔ خدا حافظ۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

گزشتہ خط میں نے آپ کو کس طرح کسی آزاد پرندے جیسے ہلکے پھلکے پن، سرخوشی اور بے فکری کے ساتھ لکھا تھا مگر وہ خوشی کس قدر جلد ختم ہوگئی ہے۔ میں تھک کر دوسری منزل پر واقع سوان کے نئے بنے ہوئے کمرے میں آرام کر رہی ہوں اور میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جب کہ میں شیشوں کے پار کھڑکیوں سے باہر دیکھتی رہی ہوں۔ اتنی اُداسی اور بیزاری کے ساتھ کہ بس مر جانے کو دل چاہے اور ہر چیز، ہر انسان بُرا لگے اپنے گردوپیش کا زندگی کا۔ ایسا لگتا ہے کہ بہت دنوں بعد اس دفعہ مجھ پر اُس بے حد اُداسی اور کوفت اور تنہائی کا کوئی دورہ پڑا ہے کہ جس میں بس یا تو دل چاہے کہ مر جاؤ یا بلاوجہ ہی خوب رونے کو دل چاہے۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی بہت شفیق اور مہرباں ہستی ہو جو مجھے سمجھتی ہو، میری بیزاریوں اور اُداسیوں کو سمجھتی ہو

اور میں اس سے لپٹ کر خوب روؤں۔ باہر تیز بارش برس رہی ہے (کہ ابر بارانِ رحمت آپ کے خط کے ساتھ ساتھ آیا تھا) سامنے کھیت بڑی خاموشی اور سکون سے جس آسودگی سے بارش میں دُھواں دُھواں بھیگ رہے ہیں اور ہمارے گاؤں کو آنے والی سڑک بڑی بے فکری سے کھیتوں اور چھوٹے چھوٹے مکانوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے درمیان چمک رہی ہے اور کوئی وقت ہوتا تو میں بھی امی کے منع کرنے کے باوجود پائینچے اٹھا کر صحن میں اس بارش میں ضرور گھومتی بچوں کی طرح اور خوب بھیگتی لیکن اب تو میں سارے جہاں سے بیزار بیٹھی ہوں۔

آپ کو خط لکھتے تین چار ماہ سے زائد نہیں ہوئے شاید مگر ایسا لگتا ہے جیسے ہمیشہ سے ایسا تھا۔ آپ میرے لیے اتنے نزدیک اور اتنے اپنے تھے شاید آپ اتنے اچھے خط نہ لکھتے تو ایسا نہ ہوتا۔ آپ بھی میرے لیے ایک عام انسان رہ جاتے اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں آپ کو ایک دو خط لکھ کر چھوڑ دیتی جیسا کہ سوچا تھا لیکن جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے آپ میرے لیے کیا ہیں محض ایک واہمہ، سراب اور جنگل کا درخت ایسے جنگل کا درخت جس میں داخل ہونا تو کجا جس کے نزدیک سے گزرنا بھی میرے لیے ممنوع ہو تو میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں آپ کو خط نہ لکھوں اس کے بعد اور اگر کبھی کبھار لکھوں بھی تو بس مختصر اور عام سا خط۔

میں نے اپنے لیے سنجیدگی سے شاید آج تک کچھ اللہ تعالیٰ سے مانگا ہی نہیں کہ کوئی بھی چیز یا انسان اتنا اچھا لگا ہی نہیں... اور جب لگا بھی تو بالکل پاگل پن کے ساتھ، بے ہودگی کے ساتھ اور میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ لیں کہ اے خدا تو چاند کو آسمان سے توڑ کر میرے ہاتھوں میں پھینک دے۔ ظاہر ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے وہی دعا مانگ سکتے ہیں جو ان کے بھی اختیارات سے باہر نہ ہو، بے شک وہ قادر مطلق ہیں مگر کچھ ان کی بھی تو مجبوریاں ہیں جو صاف ظاہر بھی ہیں (نعوذ باللہ)۔ اور چلتے چلتے میرا ایک اور فضول شعر سن لیں ع

اُٹھا کبھی دھواں نہ کبھی روشنی ہوئی
جلتی رہی حیات یونہی خامشی کے ساتھ

''نتالیہ''

تسلیمات!

آپ واقعی ایک واہمہ ہیں' خواب ہیں' حقیقتوں سے ماورا کوئی شے ہیں' کوئی افسانوی اور کتابی کردار ہی ہیں جو صرف ناولوں اور افسانوں میں ہی ہوتا ہے۔ اصل میں کہیں نہیں ہوتا۔ نہ کہیں کوئی رُودین ہوتا ہے اور نہ کوئی نتالیہ۔ صرف کتابوں میں ہوتے ہیں یہ لوگ۔ اور اگر حقیقت میں ہوں بھی کہیں تو ہم انہیں افورڈ نہیں کر سکتے' انہیں زندہ نہیں رکھ سکتے۔ بعض اوقات ہم انہیں مارنے پر مجبور ہوتے ہیں' مار دیتے ہیں اور بعض دفعہ یہ خود اپنے آپ کو مار دیتے ہیں۔ اپنے حالات کے تحت ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور وہ زندگی وہ روشنی کبھی نہیں ملتی کہیں نہیں ملتی جو ان کا خواب ہوتی ہے جو یہ گزارنا چاہتے تھے۔ اپنی تمام تر انفرادیت' شعور' خود پسندی' تعلیمی ڈگریوں' خیالات' جذبات اور اپنے تمام تر حسن یا حسن نظر کے باوجود انجام وہی ہوتا ہے مقدر وہی ہوتا ہے جو کسی بھی معمولی اور عام اور جاہل کردار کا مقدر ہوتا ہے۔ وہی مخصوص اور محدود راہِ زندگی۔

اس دفعہ عید کے دن بہت زیادہ خوش رہی تھی میں۔ اتنا اہتمام تھا' خوشی تھی' رنگینی تھی اور ہنگامہ پرور دن ہنستے ہنستے گزر گیا تھا۔ بے شمار تصاویر رنگین اور سلائیڈز بنائی تھیں۔ سوان ماسکو چلا گیا تھا تو اتنی اداسی کے ساتھ میں سوچتی تھی کہ قرۃ العین نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ''ہر دلچسپ اور خوبصورت دن ختم ہو جاتا ہے' تمام موسم اور زمانے تیزی سے گزر جاتے ہیں اور پیچھے صرف خوف اور تکلیف کا احساس رہ جاتا ہے۔ کہر آلود شاموں میں اس خوف کو میں نے تنہا محسوس کیا۔'' میں نے سوچا بار بار پڑھ کر سوچا کہ ہر خوبصورت اور پُر سحر جذبہ سستا ہو جاتا ہے' بدصورت ہو جاتا ہے اور اپنے پیچھے شکستگی اور تکلیف کا بہت پُر حقارت احساس چھوڑ جاتا ہے جس کا دکھ اور تلخی میں نے تنہا محسوس کی۔

ایک تو سوان کے جانے کی اُداسی پھر آپ کے خط نے ناخوش کیا اور ایک حادثہ اور ہوا کہ میری تین سال عمر کی براؤن دھاریوں اور براؤن آنکھوں والی بہت خوبصورت بلی تھی جس کا نام روشی تھا براؤنی بھی کہلاتی تھی وہ سبزیوں کے کھیت کے کنوئیں میں گر گئی اور زندہ نہیں نکل سکی۔ بہت سے بچے طوفانی انداز میں پہلے اس

کے گرنے کی خبر لائے پھر اُسے مرا ہوا نکال کر لائے پھر ہم سب نے یعنی میں نے اور پھوپھو کے بچوں نے اور پڑوس کے بچوں نے بہت خاموشی سے اور دُکھ سے اسے پچھلے صحن میں دھریکوں کی چھاؤں میں ایک گوشے میں دفن کیا اور بہت دیر تک وہاں اُداس اور سنجیدہ بیٹھے رہے پھر شام تک بلکہ رات تک جس جس بچے کو خبر ملتی گئی وہ میرے پاس اُس کے افسوس کے لیے آتا رہا۔ شکر ہے کہ اس کا ایک اسی جیسا خوبصورت بلونگ (جس کا نام سوان نے فلفّی رکھا ہے) ہمارے پاس موجود ہے جو ماں کے ساتھ باہر نہیں گیا تھا سب بچے اُس کی یتیمی پر افسوس کرتے رہے اور مجھ سے تصدیق کرتے رہے اُس کی اِس محرومی کی اور اُسے کھانے کی چیزیں دیتے رہے۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

جیسا کہ آپ نے بھی فرمایا اور میں نے خود بھی غور کیا تو احساس ہوا کہ آپ ٹھیک سمجھاتے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے درمیان جو رابطہ ہے وہ انتہائی خوبصورت' خوابناک' ناقابل یقین اور ایک افسانوی سا طلسم ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد معصوم' بے گناہ اور بے غرض بھی ہے۔ ایک شدید گہری روحانی مسرت اور سرخوشی کا احساس ہے (ہے ناں؟) اور اس میں کوئی بھی بدصورت اور قابل نفرت بات نہیں' کوئی بے ہودہ بات نہیں' کوئی غلط خواہشات یا ارادے نہیں۔ صرف ہمارے بے ضرر' خوبصورت خیالات اور تصورات ہیں' سوچیں اور احساسات ہیں جن کے تبادلے سے ہم ایک دوسرے کے حوالے سے اپنی باطنی خوبصورتی کو پہچان رہے ہیں۔ اپنا اندر دیکھ رہے ہیں جو کس قدر خوشی کی بات ہے کہ تاریک نہیں۔ اسی طرح اُجلا اور روشن اور خوبصورت ہے جیسا کہ ہمارا ظاہر (مجھے یقین کریں کہ بے پناہ حیرت ہو رہی ہے یہ سب لکھتے ہوئے کہ کیسے خود بخود ذہن میں آ رہی ہیں یہ باتیں یعنی کیا آپ نے مجھے ایک فلسفی بھی بنا دیا ہے) اور آپ کے سمجھانے پر میں نے بھی سمجھا کہ ہمارے درمیان کوئی ایسی حرکتیں نہیں کہ جن کے خیال سے آدمی خود کو

نادم و مجرم و گرا گرا محسوس کرے۔

لیکن اگر میں کبھی کبھی ایسا محسوس کرتی ہوں تو میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میرا ایک بے حد مخصوص خاندانی پسِ منظر' معیار اور روایات و حالات ہیں جن کی میں گرفتار ہوں (اور آپ کو جاننے سے پہلے یہ سب مجھے اتنا بُرا بھی نہ لگتا تھا) اور اِسی کے تحت یہ احساس مجھے مجرم بناتا ہے کہ میں جو کچھ سوچتی ہوں آپ کے بارے میں' جو کچھ لکھتی اور اظہار کرتی ہوں (بلا ارادہ بے ساختہ کر جاتی ہوں) وہ میرے لیے ممنوع ہے' ناجائز ہے بلکہ حرام ہے۔ (یوں جیسے کوئی قبلے کو چھوڑ کر کسی اور سمت منہ کر کے نماز پڑھے) اور مجھے ایسا سوچنے یا لکھنے کی کوئی اجازت نہیں ہے جیسا کہ میں لکھتی ہوں۔ اسی احساس کے تحت میرے اپنے خوبصورت اور معصوم ترین خیالات بھی اور الفاظ بھی مجھے پشیمان و نادم بنا دیتے ہیں۔ جن کا اظہار بھی میں صرف آپ سے ہی کر سکتی ہوں اور آپ کو بھی ڈسٹرب کر دیتی ہوں۔

اور یہاں اپنی فیملی کے معیار یا پس منظر کا ذکر کرنے سے میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی طرح بھی آپ سے کوئی برتر و بہتر شے سمجھتی ہوں بلکہ جیسا کہ ایک مرتبہ آپ نے بھی تحریر کیا تھا کہ یہ میری موروثی مجبوریاں اور پابندیاں ہیں اور ان سے وابستہ وہ تمام عقیدت و تقدس احترام و پاکیزگی کے تصورات جو بچپن ہی سے مجھے اپنے اِرد گرد نظر آئے ہیں اور میری منفرد پسندی کے لیے بڑے مسرت و تفاخر بخش تھے اس درجے کہ یقین کریں میں شاید اپنے آپ کو کوئی شہزادی نہیں بلکہ دیوی سمجھتی تھی جس کے صرف قدموں کو چھونے کے لیے سب بنے ہوں اس سے آگے رسائی کے کوئی قابل نہ ہو اور شاید.... کوئی تھا بھی نہیں اگر تھا تو صرف کتابوں میں خیالوں میں اور ان سب جگہوں میں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' کوئی وجود نہیں ہوتا لیکن پھر ایک دم میں بالکل حیرت زدہ اور سحر زدہ سی رہ گئی کہ کیا کتابوں میں سچ بھی لکھا ہوتا ہے اور رُودین حقیقی بھی ہوتے ہیں اور آدمی کے خیالات و تصورات کو کوئی حقیقی جیتا جاگتا وجود بھی مل سکتا ہے۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر بلکہ غیر حقیقی طور پر مجھے ان سوالوں کا جواب ملا لیکن اس

کچھ جو آپ تصور کر سکتے ہیں' وہ بیان کر سکتا ہے۔ وہ سب کچھ جو آپ سوچ سکتے ہیں وہ سمجھ سکتا ہے اور ایک بے نیازی سے آپ کو یقین دلاتا ہے کہ یقیناً وہ حاکم ہے اور آپ محکوم۔'' میرا خیال ہے کہ میری ڈائری کو آپ کبھی نہ پڑھ سکیں گے۔ اس کی بہت سی باتیں کبھی نہ جان سکیں گے جو مجھے خود بھی کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ میں نے ہی لکھی ہیں۔

خدا تعالیٰ پر مجھے یاد آیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ جسے اللہ سے محبت ہو اُسے ہر گل' ہر رنگ' ہر شے میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ تو میں اس وقت بہت محظوظ ہو کر سوچتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں تو میرے ساتھ کوشش کے باوجود ایسا ہوا نہیں مگر اس کے ایک ''غازی اور پُراسرار بندے'' کے معاملے میں ایسا ہو گیا ہے۔ مجھے ہر پھول' ہر شے میں اُس بندے کا بھی جلوہ تو نظر نہیں آتا مگر خیال اُس کا ضرور آتا ہے۔ ہر خوبصورت وقت میں اور ہر خوبصوت چیز اور خوبصورت جذبے کے ساتھ اور کیا مصیبت ہے کہ بالکل روایتی لوگوں کی طرح کبھی کبھی دورانِ نماز بھی۔

مجھے نرگس کے پھول بہت پسند ہیں (اور پنڈی میں صرف صدر میں ایک جگہ ملتے ہیں) نرگسیت کے مفہوم سے بھی آگاہ تھی لیکن اس کے بیک گراؤنڈ کا علم نہ تھا۔ آپ نے بتایا تو بڑا اچھا اور رومنٹیک لگا۔ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں بھی نرگسیت کا شاید شکار ہوں یا رہی ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ ایسے ایک انسان کے لیے کیا یہ قدرتی نہیں جسے اپنے منفرد ہونے کا بخوبی احساس بھی ہو لیکن اسے ماحول ایسا ملے جہاں اُس کی انفرادیت کی کوئی پہچان اُس کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔

اور ایک مزے کی بات سنیں کہ گزشتہ ہفتے ضیاء الحق دربار پر آیا۔ بابا نے ایک مسجد بنوائی ہے اس کا افتتاح کرنے (آپ کو میں لکھ چکی ہوں نا کہ ضیاء الحق اور اس کی موٹی بیوی سے لے کر اُس کا بچہ بچہ اور عملہ پتہ نہیں کیسے اور کیوں بابا کا مرید ہے عرصے سے) تو سارے آس پاس کے گاؤں' دیہاتوں کے لوگ دربار پر جمع تھے اور ہمارے سارے رشتہ دار بھی یعنی مرد تمام۔ اور بابا سے ضیاء الحق اندر حجرے میں جا کر ملا۔ ان کے پاس چٹائی پر بیٹھا رہا پھر ان کے پیچھے نماز پڑھی وغیرہ۔ مجھے اتنی کوفت ہوئی میں نے کہا بابا آپ امام خمینی کے نقش قدم پر نہیں چل رہے۔

طرح کہ اب مجھے اپنا یہی انفرادیت عطا کرنے والا ماحول اور اس سے وابستہ ہر چیز بوجھل' مصیبت اور مجبور کر دینے والی لگتی ہے کیونکہ شاید یہی سب کچھ ہے جو مجھے ڈراتا اور پشیمان و نادم بناتا ہے اور احساس جرم پیدا کرتا ہے اور حقیقت اور افسانے کے درمیان حائل ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں ایک عام گھرانے کی نیم آزاد' نیم خودمختار لڑکی ہوتی تو شاید یوں خود کو مبتلائے خوف و ندامت نہ پایا کرتی اور حقیقت اور فسانے کے درمیان حائل اس دیوار کو پار کر کے قرۃ العین کے الفاظ میں کہہ سکتی کہ ''ہاں میں ضرور آگے جاؤں گی اور دیکھوں گی وہاں کیا ہے' وہاں جہاں تاریکی روشنی ہے' غلطیاں صحیح ثابت ہوتی ہیں اور زندگی خواب اندر خواب ہے ایسے خواب جنہیں میں چھونا چاہتی ہوں۔''

اور کیا آپ یقین کریں گے کہ اس دفعہ چاندرات کو موم بتی کی روشنی میں (کیونکہ گاؤں کی بجلی خبرنامے کے بعد چلی گئی تھی) کیجو (میری نیم دوست اور نیم خادمہ) کے ساتھ اپنے کمرے میں خاموشی سے اپنے ہاتھ پر مہندی کے پھول بناتے ہوئے میں نے آپ کے بارے میں بے شمار باتیں سوچیں جو آپ کبھی بھی نہ جان سکیں گے (مہندی مجھے پسند نہیں ہے خاص طور پر اس کی خوشبو مگر کچھ نقش و نگار بنانے کے شوق اور کچھ امی کی خواہش کی خاطر لگالی تھی۔ اب پچھتا رہی ہوں اتر تی ہی نہیں) پھر صبح سویرے سے کچھ پہلے ایک دم آنکھ کھلی تو پتہ چلا اُس خواب سے جاگی ہوں جس میں آپ بھی تھے اور سردیوں کا موسم تھا' آپ گرم کپڑوں میں تھے۔ بڑا افسوس ہوا جاگنے کا اور خواب ٹوٹنے کا۔ فوراً ہی دوبارہ سونے کی کوشش کی اور جب صبح کو جاگی تو خشک مہندی ہاتھوں سے جھڑاتے ہوئے یقین کیا کہ صبح صادق کے وقت آنے والے خواب کبھی سچ نہیں ہوتے' لوگ غلط کہتے ہیں کہ اس وقت سچے خواب آتے ہیں۔ میں نے اپنی ڈائری کا مرکزی حصہ دل ہی دل میں آپ کے نام کیا ہوا ہے اور خالی چھوڑا ہوا ہے جب کبھی بھی میرے ذہن میں آپ سے متعلق کوئی خوبصورت بات جنم لیتی ہے میں اس میں لکھ دیتی ہوں بغیر کسی نام یا حوالے کے۔ تو میں نے آپ کا یہ خط پڑھنے کے بعد اس میں لکھا ''اُس کا احساس' اس کا خیال یقین دلاتا ہے کہ آپ کچھ بھی نہیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے۔ وہ سب

ضیاء الحق کو دربار پر بلانا حسینیت نہیں یزیدیت کا ساتھ دینا ہے۔

اور مجھے یقین ہے کہ بابا مجھ سے ناراض ہی ہوں گے کیونکہ ایک تو میں ان سے کوئی سفارش کرانے کا ارادہ نہیں رکھتی اور پھر وہ مجھ سے اپنی سوانح حیات لکھوانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ صدیوں پرانے ہمارے اجداد کے شجرے اور حالات و واقعات کی بوسیدہ تحریریں مجھے بھجوائی ہیں۔

اور پرسوں میں نے موت سے بہت خوف محسوس کیا۔ تمام رات میں سو نہیں سکی۔ ہوا یہ کہ گاؤں کی ایک لڑکی جو تقریباً میری سہیلی تھی اور بہت زندہ دل' ہر وقت ہنسنے ہنسانے والی خوش باش شوخ لڑکی تھی اچانک مرگئی کوئی رگ پھٹنے سے۔ تو میں اپنے خاندان کے علاوہ گاؤں میں بہت کم باہر نہیں جاتی ہوں مگر اس کی موت پر گئی۔ اس کا چہرہ مر کر بھی اتنا شگفتہ تھا جیسے ہنستے ہنستے سو گئی ہو اور انہوں نے اسے دلہن بنا کر لٹایا ہوا تھا تمام زیورات اور سرخ زرتار دوپٹہ اوڑا کر۔ میں نے اتنا عجیب خوف' اتنا عجیب احساس محسوس کیا' اتنی عجیب بے بسی محسوس کی کہ میں کتنی ہی دیر اس کے سرہانے بالکل قریب کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ میں نے چاہا کہ میرا کوئی آنسو بہے کیونکہ سب کے بہہ رہے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ کون کون عورتیں میرے پاس آ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ میرا ہاتھ اٹھا کر چومتی رہیں اور کیا کیا کہتی رہیں۔ جب میں وہاں سے آ گئی تو مجھے میرے ساتھ جانے والی لڑکی ستارہ نے بتایا کہ بی بی جان آپ کبھی کہیں نہیں جاتیں' نہ میت پر تو سب عورتیں اتنی حیران ہوگئی تھیں آپ کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی تھیں آپ کو دیکھنے کے لیے اور آپ کے پاس آ کر آپ کی خیریت پوچھتی رہیں' پیار دیتی رہیں مگر آپ کسی کی بات کا جواب ہی نہیں دے رہی تھیں۔ کسی کو دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔ ساری رات بھی مجھے اسی کا خیال رہا اور میں سوچتی رہی کہ وہ کیسے اُسی انداز میں قبر میں لیٹی ہوگی' وہی اُس کی بھوؤں کا زاویہ ہوگا۔ وہی اُس کی خوبصورت ناک ہوگی۔ اتنی پریشان رہی میں رات بھر۔

اور کل میں نے ملکہ فرح کی خودنوشت ایک اخبار میں پڑھی اور ملکہ کا ایک جملہ بالکل اپنا لگا کہ ''مجھے اپنی زندگی کے لیے ایسا شخص پسند نہیں تھا جو میرا غلام

بن کر رہ جائے بلکہ میں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے کنیز بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔"

اور دیکھیں میں کل شام کو روزہ کھولنے کے بعد بابا کے پاس گئی تھی دربار پر۔ بہت مزہ آیا۔ بابا نے مجھے کئی چھوٹے موٹے تحفے دیئے' میرا پسندیدہ ایرانی قہوہ بھی پلوایا (ان کے خصوصی خادم کا بنایا ہوا۔ باقی سب تو ملنگ نما خادم ہیں جو دربار پر پھرتے رہتے ہیں)۔

میں نے موم بتیوں کی روشنی میں بابا کے بہت سے کام کیے (کیونکہ بجلی گئی ہوئی تھی ورنہ دربار تو اب بقعۂ نور بنا رہتا ہے)۔ پھر میں نے بابا کے خصوصی باتھ روم میں جا کر حسب عادت ان کے تمام قیمتی صابنوں سے باری باری منہ ہاتھ اور پیر دھوئے۔ ہر کولون ٹیسٹ کر کے دیکھا پھر خادم کو ساتھ لے کر (کیونکہ ملنگوں سے مجھے اتنا ڈر لگتا ہے) گھر چلی گئی۔

"نتالیہ"

تسلیمات!

جب میں کراچی گئی تھی تو ساتھ پڑھنے کے لیے "رُودین" لے گئی تھی۔ دوبارہ پڑھنے کے لیے۔ اسے دوبارہ پڑھتی رہی تو آپ زیادہ زیادہ رُودین محسوس ہوتے رہے۔ بالکل آپ جیسا مزاج اور باتیں تھیں رُودین کی۔ رُودین نے نتالیہ کو صرف ایک خط لکھا تھا ایک دفعہ اور وہ حیرت انگیز طور پر آپ کے خطوط کی طرح تھا مثلاً اُس خط کے آخر میں رُودین لکھتا ہے کہ "میں تمہارے لیے مکمل مسرت کا خواہشمند ہوں۔ خدا حافظ.. کبھی کبھی مجھے یاد کر لیا کرنا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم پھر میرا ذکر سنو گی۔" اس خط کے بعد رُودین چلا گیا تھا۔ بالکل آپ کی طرح وہ نتالیہ سے باتیں کرتا تھا۔ کبھی وہ نتالیہ سے کہتا تھا کہ "بعض تار ایسے ہوتے ہیں جنہیں میں بالکل نہیں چھوتا۔ میرا دل.... کسے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس پر کیا کچھ گزر چکا ہے۔ سب لوگوں کے سامنے معائنے کے لیے اس کی نمائش کرنا مجھے ہمیشہ کسی مقدس چیز کی توہین کی طرح لگتا ہے.... لیکن تم میرے اعتماد کو دعوت دیتی ہو۔ تمہارے ساتھ میں صاف گوئی سے کام لے سکتا ہوں۔ میں تم سے نہیں چھپا سکتا

کہ..... اور میرا دل رنج و مسرت دونوں کی فراوانی سے آشنا ہو چکا ہے۔" ایک دفعہ وہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "میری اُمیدوں' میرے خوابوں اور میری ذاتی مسرت میں کوئی بات مشترک نہیں ہے۔ محبت.... میرے لیے نہیں ہے.... میں اس کے قابل نہیں ہوں.... میں بوڑھا ہو چکا ہوں (جس طرح آپ نے لکھا تھا اپنے لیے) میں کسی کو اپنے عشق میں دیوانہ کیسے بنا سکتا ہوں۔ خدا کرے کہ میں خود ہی دیوانہ ہونے سے بچا رہوں۔"

میں آپ کو مکمل طور پر بھول جانے کی فکر میں تھی۔ اگرچہ ایسا ہو نہیں سکا۔

"نتالیہ"

تسلیمات!

آپ نے لکھا ہے کہ "تم نہیں جانتیں کہ میں کتنا الجھا ہوا سا شخص ہوں" واقعی میں نہیں جانتی مگر یہ بات ضرور جانتی ہوں.... کہ ہمیشہ سے سوچتی تھی کہ میری تمام تر چاہت اور ہر چیز کا حق دار جو کوئی بھی ہوگا.... وہ بہت الگ سا الجھا سا شخص ہوگا۔ عام انسانوں کے ہجوم میں منفرد اور مختلف اور مجھ سے کئی سال بڑا.... اور ہر لحاظ سے اتنا بڑا مکمل اور ہمہ گیر کہ اس کے آگے اپنا آپ بالکل بچہ لگے....

دھوپ بڑی چمکیلی اور خوشگوار ہے اور کھیتوں پر اتنی آسودگی اور سکون و محبت سے بچھی ہوئی ہے۔ مویشی بے فکری سے چر رہے ہیں۔ عورتیں اتنی خواہش اور مزے سے سبز کھیتوں میں سرسوں کا ساگ توڑ رہی ہیں۔ جنگلی جھاڑیوں کے بیر اتنے ہی سرخ' شیریں اور لذیذ ہیں اور میری ننھی سہیلیاں اور ننھے دوست اپنے ہاتھوں کو کانٹوں سے زخمی کر کے اتنے پیار اور شوق سے یہ بیر میرے لیے چن کر لا رہے ہیں۔ ہمیشہ کے سرما کی طرح اس دفعہ بھی غریب اور پُرخلوص سادہ محنت کش بوڑھیاں میرے لیے نشاستہ' تل' مونگ پھلیاں دعاؤں کے ساتھ لے کر آ رہی ہیں۔ میری سہیلیاں اتنی خوش مزاج اور مہربان ہیں۔ اور بقول قراۃ العین "زندگی کا طلسم اتنا مکمل ہے" پھر بھلا میں کیوں اداس ہوں۔ ان پیاری حقیقتوں کو فراموش کر کے محض ایک خواب' ایک خیال کے لیے دکھی ہوں۔

آپ کا خیال تو اتنے خواب دکھاتا ہے کہ بتانے لگوں تو خط کبھی ختم نہ ہو.... اس شب کی صبح بھی میں نے ایک خواب دیکھا تھا اس صبح کچھ تو رات بھر کی اذیت' بے چینی اور ایک مختصر اور بے چین نیند کی وجہ سے اور کچھ دربار پر سونے کی وجہ سے میں صبح کو جلدی جاگ گئی تھی بلکہ شاید سوئی ہی نہ تھی۔ فجر کی نماز کے بعد (اور اس دوران بھی بے اختیار روتی رہی تھی) میں بابا کی ایک گرم چادر لپیٹ کر باہر نکل آئی تھی اور صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں باہر ساری چار دیواری کے اندر پھرتی رہی تھی۔ اکیلی اور خاموش۔ فاتحہ پڑھتی رہی تھی اور یقین کریں اس کچھ اجالے' کچھ اندھیرے کے پُراسرار سے وقت میں سب کچھ اتنا عجیب' پُرسحر اور پُراسرار لگ رہا تھا۔ درخت بام و در راستے امام بارگاہ کے ''علم'' اور نشانیاں اور اپنے بزرگوں کی بلند و بالا سفید قبریں' یقین کریں ایسا لگ رہا تھا خود کو جیسے کہ میں بھی کوئی روح یا کوئی آسمانی یا غیر انسانی شے ہوں' انسانوں میں سے نہیں ہوں.... مگر آپ کا خیال تب بھی ہمراہ تھا۔ میں نے سوچا تھا ایک انوکھا خواب دیکھا تھا کہ جیسے میں ہمیشہ دربار پر رہتی ہوں' ہر روز صبح اسی وقت اسی طرح گھومتی ہوں.... یہاں تک کہ ایک دن اس دھندلے پُراسرار اجالے میں اچانک کسی درخت کے پیچھے سے نکل کر آپ میرے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور میں بڑے اطمینان سے کہتی ہوں تو تم آخر آ ہی گئے۔ میں تمہاری منتظر تھی اور مجھے معلوم تھا کہ تم ایک دن یہاں ضرور آؤ گے۔ کسی نہ کسی دن یہ راستے تمہیں یہاں لے آئیں گے' میرے پاس لے آئیں گے کیونکہ یہاں اتنی اچھائی ہے' اتنی سچائی ہے' اتنا حسن اور اتنی پاکیزگی ہے' اتنا سکون اور محبت ہے' اتنے خواب ہیں.... اور صرف تم ان سب چیزوں کے اہل ہو.... ان کے امین ہو۔ یہ سب صرف تمہارے لیے تخلیق ہوئی ہیں یہ الوہی اچھائیاں اور حسن اور مسرتیں اور اسی لیے مجھے یقین تھا کہ تم کبھی نہ کبھی اس جگہ ضرور آؤ گے اور پتہ نہیں کتنی دیر میں اس خواب میں کھوئی رہتی کہ بابا کے خاص خادم (جنت میں شیطان) نے مجھے پھرتے دیکھ لیا تھا۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

اُمید ہے کہ اب تک آپ کا زکام دور ہو چکا ہوگا۔ یہ ہوتا ہی بہت بدمزہ شے ہے۔ اس سے تو بہتر لگتا ہے کہ آدمی کو سیدھا سیدھا بخار ہی ہو جائے اور وہ کم از کم لیٹ کر ہی سکون محسوس کر سکے۔ معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک مجھے خط لکھنا ایک غیر سنجیدہ کام ہے کیونکہ کوئی سنجیدہ کام زکام میں نہیں کیا جا سکتا (یہی تحریر کیا ہے نا آپ نے) ظاہر ہے آپ کے لیے یہ کام سنجیدہ ہو بھی نہیں سکتا کہ رُودین کے لیے بس اپنی دانشوری اور علم و ادب کی محفلوں' انقلابی مباحثوں و مراسلوں میں لگا رہنا ہی سنجیدہ کام تھے اور نتالیہ بیچاری جو اکثر گرم خوبصورت شبنمی صبحیں' شبنم آلود گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اور اکثر دلنشیں شامیں کسی درخت کے نیچے خاموش بیٹھے غروب آفتاب دیکھتے ہوئے اس خیال اور امید میں گزار دیتی تھی کہ ابھی رُودین برآمد ہوگا اور اس سے وہی اپنی پُرسحر و پُروقار گفتگو کرے گا ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے (جیسے کہ وہ کبھی کبھی کرتا تھا) تو رُودین صاحب کے لیے نتالیہ کا یہ انتظار اور امید بالکل غیر سنجیدہ اور بچگانہ تھا۔ میں نے اتنی بے شمار ناولیں پڑھی ہیں مگر یہ رُودین پتہ نہیں پڑھی کیوں تھی اور اگر پڑھی تھی تو پھر ایوان ترگنیف نے یہ کردار جیسے صرف آپ کے لیے ہی کیوں تحریر کیا تھا۔

اس خط میں بھی آپ نے میری ناول کے متعلق پوچھا ہے تو میں اسے دوبارہ لکھ تو رہی ہوں' کبھی زندہ دلی سے کبھی مردہ دلی سے۔ اب آپ کا خط پڑھا تو پھر شوق ہوا کہ اس پر تیزی اور باقاعدگی سے کام کروں اور ختم کر دوں انجام چاہے جو کچھ بھی ہو۔ اس کے ماحول کے لیے یہ ہے کہ جیسا کہ آپ نے بھی تحریر کیا تھا کہ ناول ایک وسیع کینوس ہے اس میں ہم کئی لوگوں' معاشرتوں اور ماحولوں (ماحول سے) کا ذکر کر سکتے ہیں تو میری ناول میں رومی ماحول کا تذکرہ ہے مگر مرکزی طور پر نہیں۔ یوں سمجھئے اس میں کانونٹ کے ماحول کا بھی تذکرہ ہے خاص طور پر وہ مقدس' شفیق' باوقار اور سنجیدہ سنجیدہ فادرز اور مدرز (Nuns) جو مجھے بہت گہرے طور پر اب بھی یاد ہیں اور حضرت عیسیٰ و حضرت مریم کے مجسّموں اور چرچ اور خوبصورت گہرے پُرسکون خوشبودار گوشوں کی خاموش ٹھنڈک اور چرچ

کے کمپاؤنڈ سے چکوترے اور لوکاٹ چرانے جیسی حرکتیں اور پھر کانونٹ کی وہ میری کچھ کلاس فیلوز جو کامن روم کو غیر ملکی سگریٹوں کے معطر دھوئیں سے بالکل بھر دیتی تھیں۔ گھنٹوں تاش کھیلتی رہتی تھیں۔ کتابوں میں مغربی فن کاروں کی بے ہودہ تصاویر رکھتی تھیں۔ میں ان کے گروپ میں نہیں تھی اور ہمیشہ ان سے بچتی اور گھبراتی بلکہ یوں کہیے ڈرتی تھی (تب میں ایف۔اے کر رہی تھی مگر سخت احمق ہوا کرتی تھی) مگر اس کے باوجود وہ مجھے پسند کرتی تھیں شاید اس لیے کہ میں ان کے نزدیک کوئی بہت افسانوی اور تاریخی سی شے ہوا کرتی تھی بقول ان کے اتنی ہارٹ ڈیشنگ حد تک Pretty مگر اس کے باوجود اتنی Simple اور کیوٹ اور Innocent اور پتہ نہیں کیا کیا۔ وہ مجھے کہتی رہتی تھیں مجھے تب بُرا لگتا تھا اور اب یاد آتا ہے تو اچھا لگتا ہے کہ انہوں نے میرے کیا کیا نام رکھے ہوئے تھے۔ کوئی سنڈریلا کہتی تھی' کوئی میڈونا (حالانکہ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ میڈونا کون تھی) کبھی Sleeping Beauty کہہ کر پریشان کر دیتی تھیں اور کبھی ڈمپل اور پتہ نہیں کیا کیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اتنی فضول فضول باتیں کیا کرتی تھیں کہ اکثر میں بالکل رونے والی ہو جاتی تھی۔ تب وہ سنجیدہ ہو جاتی تھیں اور مجھے بہت پیار اور خلوص سے سمجھانے لگتی تھیں کہ ہم تو تمہیں یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ تم بہت پیاری سی لڑکی ہو مگر بہت سادہ ہو تم اور تمہیں اپنا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔

آپ مڈل کلاس سے ہیں تو یہ اچھی بات ہے۔ میں نے عزیز احمد کی ایک کتاب میں ایک یادگار بات پڑھی تھی کہ یہ صرف مڈل کلاس کی خواتین ہوتی ہیں جو حیا اور معصومیت رکھتی ہیں اور ان کا تحفظ کرتی ہیں۔ نچلی کلاس تحفظ کی استطاعت نہیں رکھتی اور اپر کلاس بے تحفظی کی استطاعت رکھتی ہے تو اس بات کی وجہ سے مجھے مڈل کلاس پسند ہے حالانکہ کبھی کبھی یوں بھی لگتا ہے کہ جیسے میں اپنی کلاس اور اپنے ماحول میں سخت ان فٹ ہوں اور مڈل کلاس کے مرد بھی غالباً بہت باوفا شوہر ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی ایسے ہی ہیں۔

میں سوچتی ہوں کہ ہماری بہن بھائیوں کی فیملی میں اب جس پہلی بچی کا اضافہ جب بھی ہوگا میں خاندانی نام کے ساتھ ساتھ اس کا ایک اپنی پسند کا رُوسی نام

بھی رکھوں گی مثلاً تانیہ' نطاشہ وغیرہ لیکن نتالیہ ہرگز نہیں رکھوں گی کیونکہ میں نہیں چاہوں گی کہ وہ بھی زندگی میں ایک رُودین سے محروم رہے اور محض کسی لینڈ لارڈ کی بیوی بن کر رہ جائے۔

آپ نے تو مذاق بنا لیا۔ ویسے ایک دفعہ اس بندوق نے واقعی میرا بڑا مذاق بنوایا تھا جب میں نے نئی نئی سیکھی تھی چلانا تو ایک شام جبکہ گھر میں کچھ مہمان بھی تھے ناصر بھی (اگرچہ تب ہماری منگنی نہیں ہوئی تھی ابھی لیکن میرا خیال ہے کہ ناصر کے دل میں جب بھی کچھ غلط خیالات تھے) اور سوان بھی تب ابھی ماسکو نہ گیا تھا جانے کو تھا تو اس نے چاہا کہ میں ذرا سب کو اپنی نشانہ بازی کی ٹریننگ دکھاؤں اور کچے صحن میں شہتوت پر بیٹھی ہُد ہُد کو نشانہ بناؤں تو میں نے ایسا کیا (ناصر اور سوان اُسی وقت شکار سے واپس آئے تھے) اور درخت سے کوئی چیز گری بھی۔ میں بے حد فخر سے اور خوشی سے بھاگی اپنا شکار دیکھنے لیکن وہ تو محض ایک کپڑے کی گیند تھی کسی بچے کی اور ہُد ہُد صاف اُڑ گیا تھا۔ سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا اور والد صاحب جو اِتنا کم ہنستے ہیں وہ بھی بہت ہنسے۔

دیکھئے میں اس ماحول میں شاعرہ بننا بالکل نہیں چاہتی (اگرچہ خوابوں میں اپنے آپ کو کشمیر کی حبہ خاتون اور یونان کی سیفو سے کچھ کم نہیں سمجھتی) صرف ایک ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ ہر دفعہ اس قدر طویل خط لکھنے پر شرمندہ ہو جاتی ہوں اور باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں پتہ نہیں آپ کیا سوچتے ہوں گے۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

عین اس وقت کہ جب لاہور جانا تھا اتنا سخت فلو ہو گیا مجھے۔ سخت نزلہ زکام' گلا خراب اور بخار۔ غالباً ایسا باجی کی کزن کی شادی کے دوران مسلسل چاول کھانے' برفیلے پانی پینے اور پھر گلا پھاڑ پھاڑ کر Cheap ترین پنجابی فلمی گیت ڈھولک پر گانے سے ہوا (اور ہمارے خاندان کی فرسودہ روحوں یعنی بوڑھیوں کے خیال میں میرا اس طرح ع وے چھڈ میری بنی نہ مروڑ... گانا بھی اعلیٰ تعلیم کا ایک

نتیجہ ہے) گویا ان کے خیال میں یہ کوئی انگریزی گیت ہے اور حیرت سے منہ پھاڑے وہ میری صورت دیکھتی رہتی ہیں ان کے علاوہ گاؤں کی کچھ اور بوڑھیاں بھی جو بیچاری یہ سمجھتی ہیں کہ ایک سیدزادی اور پیرزادی کو بس میلاد شریف میں نعتیں اور سلام ہی پڑھنا زیبا ہے۔

ابھی ''اینا کرنینا'' دیکھنی ہے۔ ویسے یہ رات کے پروگرام دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے مکمل تنہائی اور خامشی اور کوئی بھی انہیں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہر چیز ایک خواب اور خیال ہے نہ آپ کی کوئی حقیقت اور حقیقی وجود ہے نہ میرا اور ہم کوئی کردار ہیں کسی کتاب کے۔ آپ کو لکھتے ہوئے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ جیسے میں نہیں بلکہ میرا تخلیق کردہ کوئی کردار سوچ رہا ہے لکھ رہا ہے اور سب کچھ خواب وخیال ہے آپ بھی صرف ایک کتابی تخلیق ہیں۔ حقیقتیں اتنی خوبصورت کب ہوتی ہیں بھلا بالکل خوابوں جیسی۔

پچھلے دنوں ایک مجلس پر میری ایک شہر کی دوست آئی تو کہنے لگی میں نے بہت مزیدار چینی کھانے پکانے کا کورس کیا ہے تم آؤ کسی دن تو کھلاؤں بھی اور سکھاؤں بھی۔ مجھے ایک دم یاد آیا کہ آپ نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ آپ کو چینی کھانے بہت پسند ہیں۔ بہت خوش ہو کر کہا کہ ضرور آؤں گی۔ پھر بعد میں سوچا کہ کیا فائدہ ہوگا اس سے کارآمد ہوگا کہ اپنی کئی کزنز کی طرح تندور میں روٹیاں لگانا سیکھ لوں بغیر ہاتھ جلائے۔

آپ کو تو رُوسی زبان یقیناً کچھ نہ کچھ آتی ہی ہوگی میں نے بھی سوان سے کچھ کچھ سیکھی ہے۔ اُسے تو اتنی عادت ہے رشین بولنے کی کہ جب آیا تھا تو پہلے دو چار روز اکثر اُس کی زبان سے کوئی نہ کوئی جملہ اور الفاظ رُوسی میں نکل جاتے باتوں کے دوران۔ میں نے بھی سیکھا ہے کہ دودھ کو ملا کو کہتے ہیں۔ آموں کو وبشے' ریچھ کو مشکا اور ہاں اور نہیں کے لیے دا اور نیت وغیرہ۔

سوان گزشتہ ماہ کی 17 کو آیا تھا اور اس ماہ کی 28 کو چلا جائے گا۔ یہ تین سال باہر رہ کر وہ اب پہلے جیسا لاأبالی اور ضدی سا لڑکا نہیں رہا ہے بلکہ ایک سنجیدہ سا' ذمہ دار سا باشعور مرد لگتا ہے۔ صحت اور وزن بھی ماشاءاللہ پہلے سے زیادہ

ہے اور اس قدر بڑے بڑے بال (جو والد صاحب نے تیسرے دن ہی مختصر کرا دیئے) اور مونچھیں۔ فیض صاحب کے لیے کہہ رہا تھا کہ ان دنوں ہوٹل رُوسیا میں ہوتے ہیں اور پنجابی شاعری کرتے ہیں۔ ہم لوگ اکثر ملنے جاتے ہیں اور فیض صاحب گھونٹ گھونٹ واڈکا کے ساتھ اپنے اشعار سناتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور غالباً ایک مشہور صحافی عبداللہ ملک کی باتیں کر رہا تھا کہ بیوی کی موت کی خبر پر وہ بچوں کی طرح روتے تھے اور ہم لوگ 8 تاریخ کو انہیں ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئے تھے پاکستان کے لیے۔

ویسے مرد خواہ کتنے ہی آزاد اور ترقی پسند کیوں نہ ہو جائیں اپنے گھر کی خواتین کے لیے وہ رجعت پسند یا قدامت پسند (شاید یہی رجعت پسند کا مطلب ہے) ہی رہتے ہیں ہمیشہ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ایسے ہی ہوں گے اور شاید ایسا ہونا بھی چاہیے۔ ایک دن میں نے کسی بات پر سوان سے کہا کہ کاش میں بھی کبھی ماسکو میں یونیورسٹی میں پڑھنے جا سکتی جرنلزم یا کچھ اور۔ تو وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا اور کہنے لگا توبہ توبہ کرو وہاں کا ماحول اور پاکستانی لڑکیوں کے حالات ایسے ہیں کہ میں یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا کہ تم تو کیا میرے خاندان کی کوئی بھی لڑکی وہاں پڑھنے جائے۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

آپ نے اسے حماقت کہا اور شاید درست کہا لیکن اس کا کوئی علاج نہیں کہ میں آپ کو آئیڈیل بنانا نہیں چاہتی بلکہ بنا چکی ہوں شاید۔ وہ سب کچھ جو مجھے پسند ہے جس کے بہت خوبصورت خواب میں نے ہمیشہ سے دیکھے ہیں۔ وہ سب کچھ مجھے آپ کے خطوط سے آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ آپ میں ہے۔ آپ کی طرح میرے لیے بھی یہ بہت خوبصورت اور حیرتناک مسرت کی بات ہے کہ سچ مچ کوئی ایسا ہو سکتا ہے جیسا کہ ہم نے سوچا تھا لیکن مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ حقیقت اور آئیڈیلز بالکل الگ چیزیں ہیں۔ آپ آئیڈیلز کو دل میں چھپا کر رکھ

سکتے ہیں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے یا انہیں ساتھ نہیں رکھ سکتے اس لیے میں صرف یہ سوچتی ہوں کہ میں آپ کو کبھی بھی بھول نہیں سکوں گی۔ ملک سے باہر چلی جاؤں تب بھی نہیں۔ آپ کو کوئی خط نہ لکھوں تب بھی نہیں۔ آپ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے یہ مجھے بالکل یقین واعتماد ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ تاریک قید خانوں میں بھی رہیں لیکن روشنی' دھوپ اور مدھم چاندنی کا تصور بھول نہیں سکتے۔

میری امی اور پھوپھیاں اکثر ناراض ہوتی رہتی ہیں کہ تم نہا کر اور بال کھول کر درختوں کے نیچے اور چھت پر ننگے سر نہ پھرا کرو (ہماری چھتوں کی دیواریں کافی اونچی ہیں یعنی منڈیریں) جن غالباً عاشق ہو جائیں گے تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے اور زیادہ زیادہ پھرتی ہوں۔ ایک مرتبہ تو میں نے چھوٹی پھوپھو سے کہا (وہ دوستوں کی طرح ہیں میرے ساتھ) کہ کاش مجھے پتہ ہو جن کس وقت اور کس درخت پر ملتے ہیں تاکہ میں پھر خوب بالوں میں پھول وغیرہ سجا کر وہاں پھروں تو وہ بالکل کانپ گئیں اور کہنے لگیں توبہ توبہ کرو ویسے یونہی احتیاطاً تمہیں روکا جاتا ہے ورنہ سیّدزادیوں پر تو جن آ ہی نہیں سکتے' دور بھاگتے ہیں تو میں نے اس قدر افسردگی سے کہا (کہ انہیں بھی ہنسی آ گئی) کہ ہائے کیا بُری خبر سنا دی آپ نے میں نے تو یہ بال روز انڈوں اور شہد سے دھو دھو کر اس لیے اتنے لمبے اور خوبصورت کیے تھے کہ کسی دن ضرور کوئی معمولی جن نہیں کوئی شاہِ جنات قسم کی شے انہیں دیکھے گی اور مر مٹے گی اور آپ نے سنا دیا کہ سیدزادیوں پر جن مرتے ہی نہیں۔

جناب اگر میں اپنے والد صاحب کو بتا دوں کہ میں کسی کو خط لکھتی ہوں اور کوئی مجھے لکھتا ہے (چاہے ان خطوں میں ہم احادیث اور عبادات پر ہی بات کیوں نہ کرتے ہوں) تو وہ مجھے قتل کر دیں۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

آپ کو خط لکھنا بھی میرے لیے کوئی کافرانہ بات بن گئی ہے کہ گزشتہ خط کے بعد یہ کوئی چھٹا یا ساتواں خط ہے جو آپ کو لکھ رہی ہوں لیکن میں دل سے سخت

ناراض و نالاں تھی اس لیے ہر بار خط لکھتی اور پھر پھاڑ دیتی حتیٰ کہ آپ کا خط آ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب جو خط لکھوں گی پھاڑنے کے لیے نہیں ہوگا..

بے حد شکریہ آپ نے مجھے ''میڈونا'' کے بارے میں بتایا اور آپ ہی تھے صرف جو بتا بھی سکتے تھے (مولانا رُودین جو ہوئے) ورنہ میں ساری زندگی یہ سمجھتی رہتی کہ میڈونا وینس کی طرح کوئی یونانی یا رومن دیوی ہوگی ذرا خوبصورت سی۔ ویسے وہی قرۃ العین حیدر والی بات کہ میری زندگی میں کبھی کوئی ایسی محفل یا ماحول نہیں آئے گا جہاں مجھے میڈونا کا مطلب نہ جاننے پر اپنی جاہلیت پر شرمندہ ہونا پڑتا یا اپنی علمیت کا اظہار کرنا پڑتا۔ جس طرح آپ نے رافیل کی میڈونا اور مائیکل اینجلو کی میڈونا بتایا تو مجھے یاد آیا کہ میری وہ ساتھی مجھے ہمیشہ ''ہماری میڈونا'' کہا کرتی تھیں۔

یہ تو ایک طے شدہ بات ہے کہ آپ ایک محترم اور آئیڈیل انسان ہیں جب کہ میں خود پتہ نہیں کیسی ہوں' کیا ہوں (اب اپنے آپ کو بُرا تو آپ کے خوف سے نہیں لکھتی) آپ نے مجھے اس قدر خوبصورت اور باوقار خطوط لکھے ہیں ہمیشہ۔ اتنے پیارے بالکل اچھی کتابوں کے اچھے لوگوں جیسے خطوط۔ ایک آئیڈیل انسان کے آئیڈیل خطوط کہ جن کے بارے میں میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی حقیقت میں مجھے ایسے الفاظ' جملے' خیالات اور دوسری تمام باتیں پڑھنے کو ملیں گی جو کسی کتابی یا فرضی کردار کی نہیں بلکہ کسی حقیقی انسان کی باتیں اور خطوط ہوں گے اور ہوں گے بھی میرے نام (بالکل کسی خواب کی بات ہو جیسے) شاید میں بہت آئیڈیلسٹ یا تخیلاتی ہوں کہ مجھے یہ خوبصورت خیال اسی وقت آ رہا ہے کہ شاید اقبالؔ نے عطیہ فیضی کو بھی ایسے ہی خطوط لکھے ہوں گے ایسے ہی پیارے' باوقار اور منفرد۔ آپ اقبال ضرور ہیں لیکن مجھے کہنے دیں کہ میں عطیہ ہرگز نہیں ہوں کیونکہ عطیہ بیگم نے مجھے یقین ہے کہ اقبال کو اس طرح فضول باتوں اور خودنمائی سے بھرے خط ہرگز نہ لکھے ہوں گے۔

بے حد مسرت وفخر کا مقام ہے کہ رُودین صاحب نتالیہ کی بے حد

تعظیم کرتے ہیں اور اُس کی تحریر و دانش اور خیالات کی قدر کرتے ہیں لیکن اگر وہ ایک پھٹیچر سے عرب شیخ بھی نہیں ہیں اور حرم وغیرہ نہیں رکھتے تو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نتالیہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اُسے ختم تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا کہ اُس پر کسی غیر سید تو کیا غیر رومی کا سایہ تک بھی پڑے اس لیے نتالیہ اپنے آپ کو ختم کرنے کی بات تو سوچ سکتی ہے لیکن یہ تو خواب بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اُسے رُودین کے پاس بھیجا جا سکتا ہے اس لیے اُس نے اس بارے میں کبھی سوچا تک نہیں کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ کیا ہو سکتا ہے؟

سوان کے کمرے میں لینن کی فریم شدہ تصویر ہے۔ دیوار پر، مینٹل پیس پر رُوسی ڈیکوریشن پیسز ہیں۔ میز پر رُوسی ٹیبل لیمپ ہے اور الماری میں مارکس اینگلز، لینن اور ماؤ کی کتابیں ہیں اور بے شمار دوسری۔ اسی موضوع پر اردو، انگلش کتابیں جیسے ''موسیٰ سے مارکس تک'' اور رُوسی اور بلغاری ادب و رسالے وغیرہ اور ان ہی کتابوں کی وجہ سے میں چی گویرا اور حسن ناصر اور حبیب جالب جیسے لوگوں کو جانتی ہوں (جالب کی کتاب ''سرِ مقتل'' بھی ان کتابوں میں ہے) لینن کا ایک بہت خوبصورت سفید چینی کا مجسمہ بھی ہے کتاب پڑھتا ہوا۔

دربار پر کل مجلس تھی اور اب بابا جلد ہی سامانِ سفر باندھ رہے ہیں سندھ اور بلوچستان کے ایک طویل دورے کے لیے۔ سیہون شریف، حیدر آباد، ٹھٹھہ، اوستہ محمد، کوئٹہ، ملتان پتہ نہیں کہاں کہاں عبادتیں، ریاضتیں کریں گے یا چلّے اور وظیفے پڑھیں گے۔ اس دوران بابا کے بھائی دربار پر رہیں گے۔ اپنے عزیز ہیں مگر سچ بہت غلط آدمی ہیں بالکل بابا کے برعکس۔ اکثر کسی سے سیمنٹ، کسی سے گھی لے کر بابا کو بدنام کرا دیتے ہیں اور کریکٹر کے لحاظ سے بھی یہ ہے کہ اگر سادات رومی نہ ہوتے تو لوگ کھلم کھلا ان کو بدکردار کہتے۔ ان کے بیٹے بھی ایسے ہی ہیں۔ پورے لوفر، میٹرک تک بھی نہیں کر سکے ہیں۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

پچھلے دنوں میں نے آپ کو رُودین کے بعد ایک اور نام دے ڈالا۔ ورڈز ورتھ مجھے بے تحاشہ طور پر پسند ہے اور اب ایک دم احساس ہوا کہ ''تم تو ورڈز ورتھ بھی ہو'' اسی طرح سوچنے، لکھنے اور متاثر کرنے والے پسند آنے والے۔ کبھی مجھے آپ اقبال کی طرح لگتے ہیں۔ عطیہ فیضی والے اور مجھے سمجھ نہیں آتا آپ کو کیا کیا نام دوں۔ کیا آپ کے ذہن میں بھی کبھی کوئی نام آیا میرے لیے! وہ نتالیہ کا نام تو میں نے خود ہی اپنے آپ کو دے ڈالا ہے غالباً رُودین کے حوالے سے۔

یہ تو ایک بے تعبیر خواب ہے کہ میں آپ کے ساتھ کسی خاموش، پُر سکون، ٹھنڈے نیم روشن ماحول میں بیٹھ کر چینی کھانا کھا سکوں (میرا خیال ہے کہ کھائیں صرف آپ میں تو کسی سحر زدہ ماحول کی طرح آپ کو دیکھتی رہوں سنتی رہوں....اور کیا پتہ آپ بھی نہ کھا سکیں) یا لاہور میوزیم کے پُراسرار، نیم تاریک وسیع و عریض اور اونچی چھتوں والے کمروں میں تاریخ کے درمیان آہستگی سے گھوم سکوں آپ کے ہمراہ۔

میں نے آپ کا خط پڑھ کر اپنے آپ سے سوال کیا کہ تم کیا اہتمام کرو اگر کبھی ملاقات کرنی ہو تو....تو مجھے جواب ملا کہ میں ڈارک براؤن یا اپنے پسندیدہ نیوی بلیو رنگ کا کوئی بہاروں کا آئینہ دار لباس پہنوں گی، اپنے بال بہت خوبصورتی سے شانہ کروں گی اور بس اپنی پسندیدہ خوشبو لگاؤں گی کیونکہ اور سب چیزیں میک اپ کی میرا خیال ہے کہ انسان کی، اس کے چہرے کی اصل خوبصورتی اور حسن کو چھپا دیتی ہیں۔ آپ کا اپنا رنگ و روپ بھی مصنوعی رنگوں میں چھپ جاتا ہے۔

آپ کا بیٹا مجھے بے حد بے حد پیارا لگا....اور میں نے سوچا کہ....کبھی میرے پاس بھی آپ کے بیٹے جیسا ایک بیٹا ہوگا....لیکن شاید وہ اتنا پیارا نہ ہو کیونکہ اس میں صرف میری شخصیت شامل ہوگی آپ کی نہیں۔

میں نے گزشتہ دنوں اپنی ایک کزن سے کہا تھا کسی بات پر کہ مجھے اس دنیا میں بالکل نہیں پیدا ہونا تھا۔ اتنی بے کار، فضول اور عام دنیا۔ تو وہ بولی جی ہاں تمہیں تو کوہ قاف پر پیدا ہونا تھا۔ یہی کہنا چاہتی ہو ناں! میں نے بے حد خوش ہو کر

کہا کہ ہاں تم نے ٹھیک سمجھا ہے کیونکہ کوہ قاف میں نے سوان سے سنا ہے کہ جارجیا میں ہے رُوسی ریاست میں۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکی اور میں اسے یہ سمجھا بھی نہیں سکی کہ میں نے زندگی سے ہمیشہ سے کیا چاہا ہے' کیا سوچا ہے اور کتنی مختلف زندگی گزارنے کی تمنا کی ہے۔ مجھے تو اور کچھ نہیں تو کانونٹ کی پاکیزہ مقدس اور الوہی بلندی پر فائز راہبہ بننا ہی اس قدر اچھا لگتا تھا اور ہے۔

عام زندگی گزارنے کے تصور سے ہی جیسے مجھے لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ مرجاؤں گی' مرتی رہوں گی ہر دن۔ حالات سے ہار مان لینا انسان کی موت ہی تو ہوتی ہے ناں۔ اور آہستہ آہستہ مرنے سے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ آدمی ایک دم ہی مرجائے۔

آج کل مکئی کی فصل تیار ہے۔ ہر گھر میں چھلّیاں (بھٹے) بھنتی ہیں اور کتنی اچھی میٹھی مہک آ رہی ہوتی ہے ہر طرف۔ کیا آپ نے بھی یہ محسوس کی ہے کبھی۔

بارشوں کا کیا حال ہے۔ یہاں تو بڑے بانکے دیہاڑے ہیں۔ ہر چیز مسکرا کر دیکھنے اور پیار کرنے کے قابل' سبزہ' آسمان' پھول پتے' درخت پرندے سب کچھ لیکن جب غور کرو سوچو تو ہر چیز کے پیچھے کچھ نہ ہونے کا احساس پتہ نہیں کیوں۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

ایک تو دن ہی غم وسوگ تھے اور پھر آپ کا خط بھی نہیں آیا تھا۔ اس قدر شدید اُداس اور بیزاری تھی کہ بس مرجانے کو دل چاہتا تھا۔ بکھر جانے کو اور خوب رونے کو۔ غم حسین تو جیسے رونے کا بس ایک بہانہ تھا۔

اپنے بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچتی بھی رہی کہ میں کیا ہوں اور اپنے آپ سے کیا چاہتی ہوں اور زندگی سے بھی۔ جب کہ مجھے کیا چاہنا چاہیے' کیا سوچنا چاہیے اور نتیجے میں سخت بیزار رہی۔ اپنے آپ سے بھی' زندگی سے بھی اور ہر

انسان سے بھی اور اپنے آپ پر بہت افسوس' ندامت اور دکھ کا احساس بھی رہا۔ کیونکہ آپ کا خط نہیں آیا تھا۔ میں اس قدر خوف' پریشانی اور دکھ سے سوچتی ہوں کہ آئندہ کیا ہوگا۔ جب کہ آپ کو نہ خط لکھ سکوں گی نہ آپ کی تحریر پڑھ سکوں گی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میں خود کو باز رکھ سکوں گی ایسا کرنے سے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا ہوگا اور مجھے کس طرح خود پر اختیار حاصل ہوگا۔ حیران ہوں کہ آخر کیا ہوا ہے مجھے جو کسی بھی چیز کا ذرا بھی احساس نہیں ماسوائے آپ کی تحریر اور خیال کے۔ مجھے کبھی یقین نہ تھا کہ کتابوں اور شعروں کی باتیں اتنی گہری سچائی بھی رکھ سکتی ہیں جنہیں بخوبی خود بخود ہی محسوس کیا جا سکے۔

شادی سے خوف آتا ہے۔ اس قدر عجیب' گہری' شدید اور وسیع تنہائی' بے گھری' جلاوطنی اور خالی پن کا احساس ہونے لگتا ہے کہ جیسے میں بالکل شکستہ ہوجاؤں گی اور میری شخصیت جو کچھ بھی ہے ظاہری اور باطنی روح اور جسم سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ مسخ ہوجائے گا۔ میں بالکل خالی ہوجاؤں گی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا' کچھ بھی باقی نہیں بچے گا' خالی برتن کی طرح۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی شدید طوفان میں اور جنگل میں اور اندھیرے میں بالکل بے پناہ اور اکیلی ہوجاؤں گی اور جائے پناہ کہیں نہ ہوگی۔ گھر کا راستہ کوئی نہ ہوگا کیونکہ میں سوچتی ہوں تب میرا کوئی گھر ہوگا ہی نہیں۔ وہ کسی اور انسان کا گھر ہوگا' میرا نہیں کیونکہ وہاں نہ میرے تمام خواب ہوں گے اور نہ آرزوئیں اور وہ تمام مختلف اور منفرد باتیں' خوبصورت سوچیں ہوں گی جو میں نے سوچیں نہ میرا وہ وجود ہوگا جس پر مجھے غرور تھا۔ مجھے تو کبھی کبھی خوف آنے لگا ہے کہ کہیں شادی کے بعد مجھ پر ''جنات'' کا غلبہ نہ ہوجائے۔ میں اتنی بے اختیار ہوجاؤں' برداشت نہ رہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک دم چیخ اٹھوں گی کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میرے قریب نہ آؤ تم وہ نہیں ہو جس کے بارے میں میں نے ہمیشہ سوچا تھا اور چاہا تھا۔ میرا کوئی جذبہ تمہاری امانت نہ تھا۔

اسی دوران ایک عزیزہ کی بیٹی نے میٹرک پاس کرلیا اور پچھلے ہفتے کہنے لگیں کہ اب امام کے سوئم کے بعد تم اس کو لے کر چلی جاؤ اور اپنے کالج میں اس کا

داخلہ کرا آؤ اور میں نے ان کو بڑا مایوس کیا۔ انہیں سمجھایا کہ داخلہ دلوانا ہی بے کار ہے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانا بالکل غلطی ہے۔ کیا فائدہ ان کی پڑھائی کا جب زندگی انہیں جاہلوں والی گزارنی ہے۔ بس میٹرک بالکل ٹھیک ہے۔ کوئی ضرورت نہیں آگے داخلے کی' بس ایک میں نے کالج میں پڑھ لیا یہ ہی بہت کافی ہے اور بہت ''خوش'' ہوں میں اِسی سے۔ جی ہاں میں نہیں چاہتی کہ کوئی اور لڑکی ہماری پڑھے اور میری طرح شعور اور احساس کی اس مصیبت کا شکار ہو کہ تعلیم ہی عذاب لگے۔

نو محرم کی رات دربار پر رات گئے مجلس تھی۔ صرف ہم رشتہ دار لوگ ہی تھے باہر کا کوئی نہ تھا۔ بارہ بجے کے بعد سب لوگ گھر چلے گئے مگر میں اتنی شدید اداس اور بیزار ہو رہی تھی کہ میں نے کہا بابا سے کہ میں اب گھر نہیں جا رہی۔ بس دربار پر ہی رہوں گی رات کو آپ کے حجرے میں پڑھوں گی۔ کچھ اور عبادت کروں گی۔ سب مان گئے مگر ساتھ میری ایک کزن بھی رک گئی۔ بابا نے حجرے کے دروازے پر خادم بٹھا دیا اپنا خاص کہ رات بھر پہرہ دے اور ہم اندر سے کنڈی لگا کر چٹائی پر بابا کے بستر میں بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ میرا اتنا دل چاہ رہا تھا کہ میں تنہا ہوتی' وہ کزن میرے ساتھ نہ ہوتی۔ دل اتنا شدید دکھی اور تنہا تھا اور یہ غم حسین نہ تھا۔ عجیب ویرانی اور بے کلی تھی۔ کزن نے کہا پہلے کس کے لیے پڑھو گی۔ میں نے کہا اپنے بابا عباس علم دار کے لیے۔ کزن کو ہنسی آ گئی جو مجھے سخت زہر لگی۔ کہنے لگی کیا کوئی خاص منت مانگنی ہے ان سے جو رات بھر یہاں رُکی ہو۔ میرا دل جل گیا اور میں نے ایسی بات کہہ دی کہ جس پر آج بھی حیران ہوں۔ میں نے کہا منت کیا مانگنی ہے میرے مظلوم چچا تو... کزن توبہ توبہ کرنے لگی۔ فوراً تو مجھے احساس ہوا کہ کیا گستاخی کر گئی ہوں پھر بڑی معافیاں مانگیں' سامنے حجرے میں لگی عباس علم دار کی شبیہہ مبارک کے سامنے جا کر بھی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ تو سو گئی مگر میں پڑھتی رہی۔ کبھی نفل اور کبھی قرآن پاک اور یقین کریں اس شب عاشور کربلا اور شہدائے کربلا کی قسم اتنی مصیبت تھی' اتنی قیامت تھی کہ اس وقت بھی اس اتنے مقدس حجرے میں جہاں سامنے حضرت علی اور عباس علم دار کی شبیہات مبارک تھیں غم حسین کی رات تھی

مگر آپ کا خیال سینکڑوں بار آتا تھا۔ ہر منٹ بعد ہر دو سطر بعد ہر نماز کی نیت کے بعد دھیان بھٹک جاتا تھا اور میں اتنا مطعون کرتی تھی خود کو' اتنا بے بس پاتی تھی خود کو کہ آخر میں نے ایک دفعہ تو اپنے سامنے کھلے ہوئے قرآن پاک پر ہی سر رکھ دیا اور اتنا روتی رہی اپنے بزرگوں سے اور خدا سے اپنے لیے سکون' عزت اور بہتری کا راستہ اچھائی کی راہ مانگتی رہی' مدد مانگتی رہی' پوچھتی رہی کہ میں کیا کروں' مجھے کس طرح سکون مل سکتا ہے۔ مجھ پر رحم کیا جائے پھر جب پتہ نہیں کتنی دیر رو چکی تو سر اٹھا کر دیکھا کہ جہاں سے کلام پاک گیلا تھا وہاں لکھا تھا ''پس ہم حال جانتے ہیں تمہارے دلوں کا مگر تمہارے لیے پہچان ہے ہر چیز میں تم علم سے کیوں نہیں دیکھتے۔'' میں سوچنے لگی کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ اسی وقت جیسے معجزہ ہوا (ہنسیں نہیں بھئی اُس ماحول اور اپنے اُس حال میں مجھے وہ معجزہ لگا اگرچہ تھا نہیں) اور دروازے پر دستک کے ساتھ بابا کی شفیق آواز آئی۔ میری کزن سوئی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً دروازہ کھولا۔ بابا دیکھنے آئے تھے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کہنے کہ ہم سو جائیں اب۔ انہوں نے میرا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اور کھلا قرآن پاک دیکھا تو اسے غم حسین ہی سمجھا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے پتری پتری خدا تجھے حسین کے غم کے سوا کسی غم میں کبھی نہ رلائے۔ پتہ نہیں بابا کے ان الفاظ میں کیا تھا یا اُن کی شفیق مہربان نرم شخصیت میں کہ میں نے پھر رونا شروع کر دیا (میرا خیال ہے کہ بابا بھی حیران ہو گئے تھے غم حسین اتنا زیادہ تو نہیں ہوتا) جس پر بابا نے مجھے گلے لگایا' اتنا پیار کیا اور سمجھایا۔ پوچھتے رہے کیا بات ہے' کیوں تیرا دل اتنا چھوٹا ہے۔ مجھے اب ہنسی آ رہی ہے کہ میں نے بچوں کی طرح بابا کے سینے سے لگے لگے آنکھیں ملتے ہوئے کہا تھا۔ بابا زندگی اتنی بُری کیوں ہے مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ پھر میری کزن بھی حیران و پریشان جاگ اُٹھی تھی اور بابا بڑی دیر تک مجھے پاس بٹھائے سمجھاتے رہے' بہلاتے رہے اور باتیں کرتے رہے جس سے واقعی مجھے سکون ملا اور میں سو گئی لیکن دل اس قدر ضدی اور بے عقل اور سرکش و بے علم بچہ ہے کہ امام عالی کی قسم سونے سے پہلے نیند آنے سے پہلے دل میں آخری خیال اک خوابِ بے تعبیر ہی کا تھا اور بہت اُکتا کر خود کو ملامت کر کے سوچتی ہوں کہ مجھے بس

کسی کا خیال آتا ہی کیوں ہے' آنا ہی نہ چاہیے۔ آخر کیا ہو گیا ہے میرے ذہن کو۔

میں نے ایک ڈرامے میں اداکاری بھی کی تھی۔ یہ بات 1967ء کی ہے جب میں نے سوان کی حمایت پر اور اپنے شوق وضد پر بی۔اے کے فوراً بعد ایم۔اے انگلش میں داخلہ لے لیا تھا۔ تمام کتابیں بھی خرید لی تھیں۔ شیکسپیئر اور بائرن اور کیٹس اور اپنا پسندیدہ ورڈز ورتھ۔ تو اسی دوران کی یہ تصویر ہے۔ ایک انگریزی ڈرامے کی بہت یادگار چیز ہے۔ زندگی کا پہلا ڈرامہ اور آخری بھی۔ اور گھر والوں کو ابھی تک پتہ نہیں یہ تصویر بھی کبھی کسی کو آج تک نہیں دکھائی ماسوائے سوان کے یا اب آپ کو اور پھر کہانی کا انجام یعنی ایم۔اے کا انجام یہ ہوا کہ منگنی ہوئی اور ایم۔اے اور شیکسپیئر اور بائرن اور ''لیڈی میکبتھ'' سب کچھ ختم ہو گیا اور روک دیا گیا اور شاید ٹھیک ہی روکا گیا ایک ایسے شخص کو جس نے صرف میٹرک کیا ہو۔ اسے ایم۔اے انگلش بیوی مصیبت تو لگتی ہی ہے اور ہماری یہ خواہش بھی ختم ہوئی کہ ٹین ایجرز کی حد ایم۔اے کی ڈگری کے ساتھ پار کریں گے بیس سال کی عمر میں ماسٹرز ڈگری ہولڈر ہوں گے۔ سوان جو میرا حمایتی تھا وہ بھی اُسی سال چلا گیا تھا۔ تحریروں پر یاد آیا کہ آپ نے ٹالسٹائی کی کوئی کتاب نہیں لکھی پھر مجھے خود ہی War and Peace یاد آ گئی جو میں نے کالج کے زمانے میں پڑھی تھی۔

''اینا کرینا'' کا مجھے بھی بالکل جنون ہو رہا ہے۔ رولنسکی واقعی ڈیشنگ ہی ہے۔ صرف جسمانی اعتبار سے نہیں انداز واطوار اور احساسات وجذبات کے لحاظ سے بھی۔

مصطفیٰ زیدی کے اشعار بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ کیا وہ بے دین یا سوشلسٹ تھے جو ان کے ہاں ایسے کوئی بہت خوبصورت اور دلچسپ شعر ملتے ہیں کہ ؎

تیرے کہنے سے تھا جس نے خدا کو مانا
کبھی اُس شخص کے ایماں کی خبر بھی لیتی

اور ؎

ہاں دعاؤں کا اثر دیکھ لیا پچھلی رات
میں ادھر گھر سے گیا تھا کہ ادھر تو آئی

یہ تمام غزل ہی بہت خوصورت ہے ؏

یوں ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی

اور ایک شعر تو مجھے بالکل ایسا لگا کہ جیسے زیدی نے نہیں آپ نے کہا ہو ؎

میرے مکتوب کی تقدیر کہ اشکوں سے دھلا
میری آواز کی قسمت کہ تجھے چھو آئی

اور جس طرح آپ مجھے اکثر سمجھاتے ہیں اسی طرح زیدی نے بھی کسی کو سمجھایا ہے کہ ؏ تو میری شمع دل ودیدہ میری معصومہ..... پیار کی دھوپ میں نکلی تو پگھل جائے گی.....تو میرے ہونٹوں کو چھو لے گی تو جل جائے گی.....تتلیاں چن ابھی خاروں کی طلب گار نہ بن۔ اپنے بالوں کو سجا ماتم افکار نہ بن.....لوریاں سیکھ میرے درد میں غم خوار نہ بن.....میرا دل وقت کے طوفان میں ہے ایسی چٹان اس سے شیشہ جو لگے گا تو بکھر جائے گا.....ابدی نیند کا پیغام ہے میرا آغوش جو میری گود میں آئے گا وہ مر جائے گا۔

دیکھئے اتنے اچھے موڈ میں آپ کو خط لکھتی تھی کہ ایک عورت خط لکھوانے آ گئی۔ بور طویل دکھوں کا' مسئلوں کا خط۔ اپنے بھائی کو لکھوا رہی تھی جسے بیٹی کا رشتہ اُس کے بیٹے کے لیے دینا چاہتی ہے اور وہ شاید راضی نہیں' اس کی غریبی کی وجہ سے۔ پانچ بیٹیاں ہیں بے چاری کی۔ کہنے لگی بی بی تم لوگ بہت اچھے ہو۔ اپنوں سے باہر نہیں نکلتے۔ غریبی امیری چھوٹا بڑا تعلیم بے تعلیم کچھ نہیں دیکھتے۔ میں نے کہا ہاں خالہ ہم بہت ''اچھے'' ہیں مگر میں اچھی نہیں ہوں کیا میں بھی اچھی ہوں۔ توبہ توبہ کرنے لگی بے چاری' میری بات کو مذاق سمجھ کر اور اس کی گود کے بچے نے میرے کمرے کا فرش خراب کر دیا تھا اب تو وہ دھو رہی ہے اور یوں ماں اور بچہ دونوں ابھی تک سر پر سوار ہیں۔

اور مجھے تو یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ اگر کبھی فون پر بھی آپ سے بات کر سکوں تو کیا کہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مصر کی زلیخا کی طرح آپ کی آواز سنتے ہی بے ہوش نہ ہو جاؤں یا وہ.....کوہ طور پر موسیٰ کی طرح۔ ویسے دل نہ سہی دماغ تو ضرور فیل ہو ہی جائے گا اور میری بس ایک دوست کے پاس فون ہے مگر وہ بڑی

فضول ہے کبھی تنہا فون نہ کرنے دے گی اپنی ناک ضرور ڈبوئے گی۔

میں نے سوچا کہ مجھے آپ کو اب کوئی خط نہ لکھنا چاہیے۔ مگر کیوں لکھ دیا پھر بھی۔ واقعی جب عشق.... وارد ہوتا ہے تو خودداری اور عقل بوریہ بستر اسمیٹ لیتی ہے۔ یہ آپ کے خلیل جبران نے صحیح لکھا ہے کہیں۔

اور بھلا کن چیزوں میں الجھے رہے آپ۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے!

ویسے آپ جب میرے بارے میں سوچتے ہیں تو کیا خیال کرتے ہیں۔ خدا حافظ۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

پتہ نہیں کیوں اس قدر جلدی جلدی آپ کو خط لکھے جا رہی ہوں۔ شاید احساس یہ لاشعور پر حاوی ہے کہ کہیں جلد ہی اس مسرت سے بھی محروم کر دی جاؤں گی۔

پھر پتہ نہیں کیوں ان دنوں آپ کا خیال بھی اتنا آتا ہے اتنا آتا ہے کہ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں نے گزشتہ دنوں دو راتوں آپ کو خواب میں بھی دیکھا۔

اب تو محرم کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو مظلوم امام کا سوگ مناتے ہیں یعنی محسوس کرتے ہیں اور جو کرتے بھی ہیں تو کیا کیونکہ حسین کی روایت پر عمل تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ آپ کو بتاؤں کہ مجھے امام حسین سے بھی بڑی جذباتی' بڑی رومانی سی عقیدت ہے۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے ان کے سوگ میں مکمل سیاہ لباس پہننا اور مجالس میں شرکت کرنا۔ مرثیے پڑھنا اور سننا اور نیل پالش تک بالکل صاف کر دینا ناخنوں سے۔ جب ہمارے کالج میں یوم حسین منایا گیا تھا تو میں نے بھی اپنا پسندیدہ مرثیہ ع گھبرائیں گی زنیب.... ناصر جہاں والا پڑھا تھا۔

میں ابھی ''دس بونے'' دیکھنے کے بعد آپ کو خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ اور آپ نے بھی کل ''اینا کرنینا'' کی قسط دیکھی ہوگی۔ کیا اچھا نہ ہوتا اگر اینا مر جاتی۔ اینا کی اداکاری بہت اچھی تھی اور اس کے علاوہ رولنسکی اور الیکسی کے سارے تاثرات اور

مکالمے شدید تھے۔ جب الیکسی اور رولنسکی اندر اینا کے پاس آتے ہیں تو رولنسکی جس طرح روتا ہے اینا کی حالت پر دکھ سے روتا ہے.... اور مجھے کہیں پڑھا ہوا ایک عرب ادیب کا قول یاد آیا کہ ''کسی خاتون کے لیے جس سے وہ محبت کرتی ہے اُس کی بجائے اُس سے شادی کرنا بہتر ہے جو اُس خاتون سے محبت کرتا ہے۔''

اور اے پیارے انسان! کیا بتاؤ گے نہیں کہ تم نے پندرہویں صدی ہجری کا آغاز کس طرح کیا؟ کیونکہ آخرش تم بھی ایک ''مور'' تو ہو ہی! ویسے میرے خیال میں اب مسلمانوں کے سر سے قیامت کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا (اجتماعی قیامت کا) کیونکہ وہ تو صرف چودہویں صدی میں آنی تھی اور چودہویں صدی یاد ماضی بن چکی۔

''اداس نسلوں'' میں مجھے نجمی کا کردار سب سے زیادہ خوبصورت اس لیے لگا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے بہت قریب لگا تھا۔ وہ بالکل میری طرح سوچتی تھی' محسوس کرتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے عبداللہ حسین نے میرے ذہن میں اتر کر دیکھا ہو میرا احساس پڑھا ہو تب نجمی کو تخلیق کیا ہو۔ بالکل جو کچھ میں سوچتی تھی' سوچتی ہوں وہی نجمی محسوس کرتی ہے اور عبداللہ حسین اس سے کہلواتا ہے۔ کس قدر سچی بات ہے کہ ''محبت وہ جذبہ ہے جو اچانک آتا ہے مخلص ترین جذبہ میں اس کا انتظار کرتی ہوں'' لیکن میں کہوں گی کہ میں اس کا انتظار کرتی تھی اور جگہ جگہ نجمی بالکل سچی بالکل میری سوچ کا اظہار کرتی ہے کہ ''ہم اہل نہیں ہیں محبت کے۔ اس قدر سچائی اور خلوص کے جذبے کے.... اور پھر کہیں اس نے کہا ہے کہ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس شخص سے جس سے ہم محبت کر سکیں کبھی ملیں ہی نہیں مگر ایک نہ ایک انسان کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ضرور آتا ہے اور ہم دل میں کہتے ہیں کہ ''تم وہی ہو میں جانتی تھی تم ضرور ملو گے مجھے تمہارا انتظار تھا تمہارے وجود کا یقین تھا۔''

''نتالیہ''

تسلیمات!

ان دنوں تو ہر روز بارش ہوتی ہے۔ نیلا آسمان' سفید بادل' گہرے سبز

درخت' تروتازہ گھاس' بھیگی بھیگی خوشبو اور نشہ بھری ہوا اور اتنے بہت سے رنگ برنگے پھول (یہ زندگی ہے ناں!) اس دفعہ ہمارے پچھلے لان میں (اگر اسے لان کہا جا سکے میرے خیال میں تو وہ ایک بڑا سا کچا دیہاتی ویڑہ ہے) سوان کے سالِ گزشتہ کے لگائے ہوئے پودوں میں بے تحاشہ پھول لگے ہیں۔ زرد' سفید' پنک' کاسنی' سرخ اور میرا پیارا البیلا موتیا تو ہر وقت پھولوں سے بھرا رہتا ہے (باجی بتاتی ہیں کہ لاہور میں موتیے کی بڑی بے قدری ہوتی ہے جمعدارنیوں تک نے اس کے پھول پہنے ہوتے ہیں) اور عجیب بات ہے کہ جب بھی میں اپنے پسندیدہ پھول توڑتی ہوں (بلکہ چنتی ہوں توڑنا بے رحم لفظ ہے) تو یقین کریں کہ ہمیشہ بلا ناغہ' بلا ارادہ آپ کا خیال ضرور آتا ہے بس اچانک آتا ہے اور عجب عجب خوابوں کے ساتھ۔ بھلا کیا تعلق ہے آپ کا ان پاکیزہ اور پُر تقدس پھولوں سے؟ رنگوں اور خوشبوؤں سے؟ کیا بتائیں گے؟ میرا مطلب ہے تفسیر فرمائیں گے؟

ہر منظر اتنا خوبصورت ہے' ہر شے اتنی حسین اور رنگ بھری ہے (حتیٰ کہ ہمارا کتا چیکو تک اتنا اُجلا اُجلا' سفید نکلا ہوا ہے اور کسی میمنے کی طرح شوخ ہو رہا ہے) کہ بے اختیار دل چاہتا ہے شاعری کرنے کو' پینٹنگ کرنے کو' گنگنانے کو اور.... آپ کو خط لکھنے کو۔ بابا تک دربار پر موجود نہیں (گلگت جا چکے ہیں کیا مزے سے گھومتے ہیں ہر جگہ) اور جب تک دربار پر ان کا وقار' ان کی بزرگی' ان کی عبادت' ان کی شفقت' ان کا مکمل حسن نہ ہو وہاں جانے میں مزہ نہیں آتا۔ کہا جاتا ہے کہ بابا جوانی میں بڑی ماڈرن شے تھے بالکل ''ولایتی صاحب'' مگر پھر ان کے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوگئی۔ جس کی تفصیلات کی روشنی میں میری ذاتی رائے یہی ہے کہ بس پھر بابا نے اپنے عشق کا رخ اللہ تعالیٰ کی جانب موڑ دیا اور گدی سنبھال لی۔

اور کانونٹ میں میری ایک دوست تھی نسیم ایزد اور لندن سے کیمبرج کر کے آ کے ہمارے ساتھ داخل ہوئی تھی اس کی ماں بھی فارنر تھی۔ وہ انگریزی کی ادیبہ اور شاعرہ تھی اور فرنچ کی بھی۔ کسی بہت بڑے اعلیٰ افسر کی بیٹی تھی اور بہت آزاد۔ خوب سگرٹیں پیتی تھی جن کی مہک اور دھواں مجھے اتنا پسند تھا کہ میں نے بھی دو دفعہ اس کی سگرٹیں پی تھیں۔ وہ اکثر پینٹ سلیکس یا سکرٹ بھی پہنتی تھی۔ ٹیبل

ٹینس کی بہت اچھی کھلاڑی تھی۔ وہ کبھی موڈ میں ہوتی تو کالج کے کامن روم کے صوفے پر تاش کھیلتے ہوئے یا نیم دراز سگریٹ پیتے ہوئے چیونگم چباتے ہوئے گوگو عینک ناک کے سرے پر جمائے مجھ سے انگریزی میں بے حد فلسفیانہ انداز میں کہا کرتی تھی ''آنسہ تم خاموش رہتی ہو مگر تمہاری یہ بچوں جیسی معصوم صاف شفاف آنکھیں چپ نہیں رہتیں۔ یہ مجھے حیرت سے دیکھتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر جگمگا اٹھتی ہیں۔ ستاروں کی طرح جلتی بجھتی رہتی ہیں۔'' میں اس سے بہت متاثر تھی اس کی شخصیت اور اس کی باتوں اور اس کے انداز کی وجہ سے۔ وہ کلمہ بھی انگریزی میں پڑھتی تھی۔

آپ نے مجھ سے روزانہ کی روٹین پوچھی ہے اور وہ بھی تفصیل سے۔ کیوں پوچھی ہے؟ خیر باشد؟ ارادے کیا ہیں آپ کے؟ اتنی اہمیت کے تو قابل نہیں ہیں ہم۔

آپ کو صرف اپنے صبح کے معمولات لکھوں ابھی کہ یہی مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ تو سنیں کہ جب سڑک سے اونٹوں کے قافلوں (جو اٹک سے گندم لاتے لے جاتے ہیں) کی گھنٹیوں کی جلترنگ جیسی آوازیں (یعنی اقبال کی صدائے جرس) آوازیں آنے لگتی ہیں پھر ننھی چڑیوں کا شور کالی شاما چڑیوں کی رسیلی سیٹیاں' مرغوں کی بانگیں اور فاختاؤں کی اداس سوز بھری کوکیں لوگوں کے جاگنے اور مویشیوں کے کھولنے باندھنے کا شور نمایاں ہو جاتا ہے تو تب میں جاگ جاتی ہوں بلکہ یوں کہیے کہ بستر سے اٹھ جاتی ہوں۔ صبح کا تارہ ابھی موجود ہوتا ہے بہت پُر نور روشنی اور پُر کیف ہوا ہوتی ہے ہر طرف۔ پھر سردی سخت نہ ہو تو میں عام طور پر چھت پر جا کر نماز پڑھتی ہوں بہت مزہ آتا ہے (اور ایسے خوبصورت پُر نور وقت اللہ میاں سے عشق کرنے کو بہت دل چاہتا ہے) اور بس فجر کی نماز ہی کی میں مکمل پابند ہوں ابھی ایک تو اس لیے کہ ایسے سہانے وقت پڑھی جاتی ہے دوسرے اس لیے کہ اتنی مختصر ہوتی ہے کہ دھیان بھٹکنے کی نوبت نہیں آتی بلکہ منظر خود بخود دھیان لگانے پر مجبور کر دیتا ہے اللہ کی طرف۔ پھر نماز کے بعد میں کچھ تھوڑا سا قرآن پاک سے یا پنج سورۃ سے پڑھتی ہوں۔ (آپ کو قرآن پاک کی کون سی سورۃ

سب سے زیادہ پسند ہے؟) اور اس کے بعد پچھلے صحن میں شبنم آلود گھاس پر ننگے پاؤں پھرنے نکل جاتی ہوں اور پھرتی رہتی ہوں شلوار کے پائینچے اٹھائے تاکہ وہ شبنم کے قطروں سے بھیگیں نہیں۔ دل چاہتا ہے کہ میرے پیر ساری شبنم گھاس پر سے چاٹ لیں اور کبھی کبھی پتہ ہے کیا ہوتا ہے۔ میں رک جاتی ہوں جنگل میں تنہا محو رقص طاؤس کی طرح جھک کر گہری سبز گھاس سے جھانکتے اپنے پیر دیکھتی ہوں۔ نیم تر بالکل سفید' ملائم اور صاف (اور روز رات کو کولڈ کریم لگانے کی وجہ سے چکنے بھی۔ مجھے اتنا جنون رہتا ہے اپنے آپ کو بالکل مکمل رکھنے کا۔ مثلاً یہ کہ میرے بال بس عام بال تھے لمبائی میں اور میں نے خیال کیا کہ یہ نامکمل ہیں۔ پھر میں نے ان پر محنت کی یہاں تک کہ ابھی تک بھی ہر ہفتے انڈے' لیموں اور شہد سے ضرور دھوتی ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے بال اب تقریباً ساڑھے تین فٹ لمبے ہیں (جب کہ قد پانچ فٹ دو انچ ہے شاید کچھ چھوٹا قد) اور سوان میری ایک کھلے ہوئے اور آگے آئے ہوئے بالوں کی ایک تصویر ساتھ لے گیا تھا تو وہاں سے اس نے لکھا کہ یہاں میری ساتھی کہتی ہیں کہ تمہاری بہن نے یوں لگتا ہے کہ سیاہ چادر اوڑھ رکھی ہے اتنے بے پناہ ہیں اس کے بال اور امی مجھے کبھی کھولنے نہیں دیتیں بالوں کو کسی کے آگے کہ نظر لگ جائے گی۔)

اور ان پر شبنم کے شفاف قطرے نگینوں کی طرح جڑے دیکھتی ہوں اور یقین کریں کہ اس حسن سے خود ہی مسحور ہو جاتی ہوں۔ مجھے کنول پر شبنم کا خیال آتا ہے اور سوچتی ہوں بے اختیار سوچتی ہوں کہ.... کیا اس حسن کو خود میرے سوا کوئی اور کبھی نہ محسوس کرے گا.... کوئی رُودین (حالانکہ ترگنیف کی نتالیہ نے کبھی ایسا نہ سوچا تھا نہ یوں اپنے پیر دیکھے تھے) کبھی انہیں دیکھ کر کوئی خوبصورت جملہ' کوئی خوبصورت شعر نہ کہے گا اور یہ حسن رائیگاں جائے گا۔ (اس طرح کبھی کبھی میری صبح ہی افسردگی کا شکار ہو جاتی ہے میں سوچتی ہوں کہ میں نے جو یوں خود کو سنبھال سنبھال کر سنوار سنوار کر رکھا ہے تو بس محض اسی ایک عام زندگی عام سے انسان کے لیے شاید باجی ٹھیک کہتی ہیں کہ تجھے یہ بہت احساس اور نخرہ ہے کہ میں بہت سوہنی ہوں) خیر جیسا بھی موڈ ہو گھاس پر پھرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر میں

پھر سو جاتی ہوں۔ سورج تقریباً اب نکل رہا ہوتا ہے۔ پھر میں ایک ڈیڑھ یا دو گھنٹے بعد اپنی مرضی سے اٹھتی ہوں ناشتہ کرنے کے لیے کوئی جگاتا نہیں۔ البتہ اگر مہمان ہوں گھر میں پھر بات دوسری ہوتی ہے پھر مجھے بھی ناشتے کی تیاری میں مدد دینے کے لیے دوبارہ سونا نہیں ہوتا۔ اور پھر ناشتے کے بعد میں ہر کمرے کی صفائی کرتی ہوں۔ برآمدوں کی کیونکہ مجھے کسی کی کی ہوئی صفائی پسند نہیں آتی۔ چیزوں کی ترتیب پسند نہیں آتی۔ پھر پھول توڑ کر لاتی ہوں۔ ہر کمرے میں رکھتی ہوں اپنے کمرے میں صرف موتیا رکھتی ہوں اور بس یہ میرا صبح کا کام ہوتا ہے۔ صفائی کے بعد کپڑے استری کرنا' خطوط لکھنا اپنے بھی کوئی لکھوانے آئے اس کے بھی پھر کسی کسی دن کچھ کڑھائی سلائی وغیرہ دوپہر کے کھانے کی تیاری سے پہلے اور سب سے اہم بات تو بھولے جاتی ہوں کہ پابندی سے ہر صبح آپ کا خیال ضرور آتا ہے کہ جیسے یہ بھی کوئی عبادت ہو۔ کبھی بستر سے اٹھنے سے پہلے جاگتے ہی اور میں پھر آنکھیں بند کر کے تکیے پر چہرہ رکھ کے سوچنے لگتی ہوں کہ آپ اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ سوتے ہوں گے ابھی تک۔ کبھی شبنم اور گھاس کے درمیان آپ کا خیال آتا ہے' کبھی نماز کے دوران بھی اور کبھی دوبارہ سونے سے پہلے نیم غنودگی کے عالم میں۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

گزشتہ دنوں جب کہ آپ بخار میں مبتلا رہے میں پورے ماہ بیکار قسم کی شادیوں میں پھنسی رہی کچھ رشتہ داروں کی' کچھ ملنے والوں کی اور ایک سہیلی کی۔ اپنے ایک عزیز کی بارات لے کر ہم لوگ علیوٹ سیداں گئے (یعنی ہماری رشتہ داریاں بھی کیسی کیسی عجیب جگہوں پر ہیں۔) مری اور آزاد کشمیر کے نواح میں ہے اتنا خوبصورت علاقہ' اونچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے' درختوں کے جھنڈ اور دریائے کرنگ کا شفاف گہرا نیلا پانی اور اس میں پڑے ہوئے گول خوبصورت پتھر جن پر چل کر ہم نے اسے پار کیا۔ دریا کا کنارہ اتنا خوبصورت جیسے کوئی پینٹنگ ہو اور دل چاہے کہ یہاں بیٹھ کر مصوری کرو شاعری کرو.... یا کسی آوارہ گرد مور کو یاد

کرو۔ اس کی باتیں کروں' اس سے باتیں کروں۔ تقریباً دو میل پیدل چلنا پڑا اس دشوار گزار مگر خوبصورت علاقے میں تب وہ پہاڑی نظر آئی جس پر ہماری برادری کے گنتی کے چند گھر آباد ہیں۔ ہمیں تو خیر کچھ نہ ہوا۔ مزے سے جنگلی بیروں اور گرنڈوں کی پکی ہوئی جھاڑیوں سے بیر اور گرنڈے کھاتے اور کسانوں سے پانی مانگ کر پیتے ہوئے چلتے رہے البتہ بچوں' بچوں والی عورتوں اور بوڑھی عورتوں یعنی ہماری نانیوں' دادیوں کا برا حال ہوا۔ انہیں آنا ہی نہیں چاہیے تھا بارات میں۔ مگر حد تو یہ تھی کہ بابا کی بیوی یعنی ماں جی چل پڑیں تھیں بہت ضعیف ہیں اور انہیں الگ دو بندے گھسیٹ رہے تھے اور ہمہ وقت اپنی بلا دوسروں کے سر ٹالنے کی فکر میں تھے۔ ہم ان کی زد سے دور دور رہے۔ کوئی پرواہ نہیں تھی کہ پیچھے سے باآواز بلند صلواتیں پڑ رہی تھیں کہ ان لڑکیوں کو ذرا خیال نہیں کہ کسی بچے یا بوڑھے کو ہی تھام لیں۔ ہم لوگ یعنی لڑکیاں اتنے برے تو نہ تھے مگر جلے ہوئے تھے۔ ہمیں بس میں ہی جلا دیا گیا تھا کہ جب ہم نے سیٹوں کے نیچے چھپائی ہوئی ڈھولک نکالی اور گانا شروع کیا تو فوراً زباں بندی ہوگئی بزرگوں کی طرف سے۔ مرد ویگنوں میں تھے اور فوراً ہی بس رکوا کر اگلی ویگن سے ہمارے بھائی لوگ بھی رعب جمانے آ گئے کہ شرم کرو لوگ کیا کہیں گے یہ سیّدوں کی بارات جا رہی ہے۔ اب انہیں کون بتاتا کہ جناب سڑک کے دونوں طرف کے عوام کو کیا الہام ہو رہا ہوگا کہ یہ سیّدوں کی برات ہے اور آپ اس قدر یاد آتے رہے اس دشوار گزار پہاڑی راستے میں بھی۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کی کوئی جگہ اب ایسی نہیں ہے کوئی مصروفیت ایسی نہیں ہے کہ جس میں اور جہاں آپ کا خیال ایک خاموش سی دھیمی مسرت اور ایک تنہا سی انجانی کمی اور محرومی بن کر دل میں نہ اترے۔

پہلے لگتا تھا کہ صرف پر کٹے ہوئے ہیں.... اب دل بھی کٹتا جاتا ہے اور آپ کہتے ہیں یہ وقتی بات ہے دل کا کٹنا اور بے چینی۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

خط ملا۔ شکریہ سائیں!

یہاں دو دن سے بارش ہے اس لیے میں پچھلے کچے صحن میں گلاب کی

شاخیں تراش کر قلمیں لگا رہی تھی کہ آپ کا مکتوب آیا۔ حیران ہوں کہ میں نے بچوں جیسی سادگی اور خوشی سے ہاتھ میں پکڑی کھُرپی اور شاخ پھینک دی اور گندے ہاتھوں سے ہی آپ کا خط تھام لیا (پھر بعد میں تو دھوئے تھے) اور اب فوراً لکھ رہی ہوں (کیونکہ بالکل تنہائی ہے اس وقت امی باجی کے والد کی پھوہڑی پر گئی ہوئی ہیں روز جانا پڑتا ہے۔ شاید شہروں میں یہ رواج نہیں ہوتا۔)

جیسا کہ آپ کو لکھا تھا پچھلے دنوں بہت بہت اداس رہی اب کچھ خوش ہوں (اس وقت تو بہت ہی خوش) مگر خوش ہونا عارضی ہوتا ہے۔ مختصر وقت کے لیے ہوتا ہے اور پھر وہی بے زاری کہ مر جانے کو دل چاہے۔ جب ''اینا کارنینا'' کی گزشتہ قسط اس کے بچے پر ختم ہوئی تو میں نے سوچا کہ کاش اینا مر جاتی تو اچھا ہوتا اور میں بھی۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ کو خط لکھنے سے بھی مجبور کر دی جاؤں گی۔ یہ معصوم اور انوکھا اور ساحرانہ سا خواب جیسا رشتہ تحریر بھی نہ رہے گا۔ مارچ اپریل کے تصور سے ہی (حالانکہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہار کے دن ہوتے ہیں) اتنی زیادہ تنہائی اور ہر چیز کھو دینے اپنے پاس کچھ بھی نہ بچنے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تب تو میں آپ سے باتیں کیے بغیر رہ ہی نہیں سکوں گی۔ پتہ نہیں میرا ذہن میرا دل حقیقت کے اس موڑ کو کیوں نہیں تسلیم کرتا۔ ناصر کو کیوں نہیں قبول کرتا حالانکہ وہ اتنا اچھا بھی ہے اپنا بھی۔ مگر میں پتہ نہیں کیا ہوں نہ اسے اچھا سمجھنا چاہتی ہوں نہ اپنا۔ میں اگر کرسچین (ویسے خدا نہ کرے) ہوتی تو ضرور راہبہ بن جاتی اپنی پیاری سابق استادوں مدر اینتھنی اور سسٹر فلورینہ کی طرح۔ حقیقت ہے کہ مجھے بچپن سے ہی بہت متاثر کرتی تھی ان کی زندگی۔ ان کے لبادے' سفید یا سیاہ اور ان کا وقار و تقدس۔ نویں محرم کی شب میں نے پتہ نہیں کسی جنون میں بابا سے کہا تھا کہ میں چاہتی ہوں ہمیشہ دربار پر آپ کے پاس رہوں گھر نہ جاؤں تو انہوں نے مسکرا کر کہا ''جھلّی'' اور میں اب تک سوچ رہی ہوں کہ انہوں نے کتنا مکمل کہا تھا۔ آپ نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے۔

اب ظہر کی نماز کا وقت ہوتا ہے جس کے بعد امامِ عالی کے ختم کی فیرنی پکانی ہے..

''نتالیہ''

تسلیمات!

آپ کا خط 24 کو ملا تھا۔

اور میں نے خود کو اتنا زیادہ خوش محسوس کیا کہ خیال آیا کہ آپ کے اگر صرف خطوط مجھے اس قدر شدید طور پر خوش اور مسحور کر سکتے ہیں تو اگر کبھی آپ سے ملوں تو کیا ہو۔

ان سب باتوں کے باوجود میں نے یقین کریں کہ پوری سنجیدگی' خوف اور عزم سے ارادہ کیا کئی بار کہ آپ کو اب خط نہیں لکھوں گی لیکن ہمیشہ کچھ دنوں بعد اس ارادے کو ناقابل عمل پایا اور خود کو بالکل مجبور و بے بس۔ جب میں آپ کو خط لکھتی ہوں تو پہلے خداتعالیٰ سے اتنی دعائیں کرتی ہوں' اتنی آیات پڑھتی ہوں اپنے نانا اور جنابہ فاطمہ سے اتنی دعائیں مانگتی ہیں کہ وہ میری مدد کریں اور پردہ داری کریں کیونکہ وہ بخوبی جانتی ہیں کہ میں کوئی غلط خیالات نہیں رکھتی اور نہ بُری بُری باتیں دل میں رکھتی ہوں تو تب اتنے کچھ کے بعد آپ کو خط لکھتی ہوں۔

اگر آپ کا خط مجھے نہ ملے یا میں آپ کو کچھ عرصے خط نہ لکھوں تو یوں لگتا ہے (جیسا کہ آپ نے بھی لکھا) کہ واقعی کہیں روشنی نہ ہو دلکشی اور زندگی نہ ہو اور زندگی زندہ رہنے کے قابل نہ ہو۔ اس قدر عجیب تبدیلی پیدا کی ہے آپ کی تحریر نے میرے اندر کہ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو سخت ملامت کرتی ہوں۔ جس طرح میں نے ہمیشہ پسند کیا ہے ان جگہوں کو جو خوبصورت' خاموش اور پُراسرار و پُرسکون ہوں' انجان ہوں۔ اسی طرح میرے ذہن میں ہمیشہ تصور رہا ہے ایسے انسان کا جو بہت منفرد' باوقار' شائستہ اور گھمبیر ہو۔ اُس میں عجیب پُرشکوہ ٹھہراؤ اور متانت ہو اور اس کا علم' اس کے خیالات' اس کی معلومات مسحور کن ہوں (میری خود پسندی کی زبان میں میرے حسن کی طرح اس کا ذہن مسحور کن ہو) اور اس کا ہر انداز ہر اظہار بہت نفیس' نرم' بلند اور باوقار ہو وہ اپنے آپ کو میرے آگے زمین پر بچھا نہ دے بلکہ اپنے تمام تر وقار اور شائستگی کے ساتھ مجھے مجبور کر دے ایسا کرنے پر اور مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے جیسے اپنی توہین محسوس ہوتی ہے جب کوئی میرے لیے عام الفاظ انداز اختیار کرے کسی بھی اظہار کے لیے۔ بے شک وہ جذبات کتنے ہی شدید اور سچے کیوں

نہ ہوں مجھے متاثر نہیں کرتے۔ یوں سمجھیں کہ میں نے چاہا کہ کوئی مجھ سے عام محبت کی زبان میں نہیں بلکہ چاندنی' شاعری اور قوس وقزح کے رنگوں کی زبان میں بات کرے۔ مجھے تیز و تند موسلا دھار بارش کی طرح نہیں نرم آسمانی پھواروں کی طرح محسوس کرے۔ کوئی ہیجان خیز' چیختا چلاتا نغمہ نہیں بلکہ کوئی بہت نازک اور خواب آگیں مدھم سُروں والی پُرغنائت و پُرسکون غزل سمجھے۔ کوئی ایسا نغمہ جو آپ کو خوابوں کی آسودہ و پرسکون انجان وادیوں میں لے جاتا ہے۔ میں نے چاہا ہے کہ کوئی مجھے آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز روشنی نہ سمجھے بلکہ مجھے چاندنی یا نرم پھولوں کی طرح محسوس کرے۔

یقین کریں کہ یہ سب میرے لیے اب کتابی باتیں اور خیالی حسن نہیں رہا بلکہ میں نے ان سب حقیقتوں کو محسوس کیا ہے اور سمجھا ہے۔ شاید ترگنیف کی نتالیہ نے بھی یوں محسوس نہ کیا ہو۔ اور مجھے یہ سب کچھ بالکل ناقابل یقین' ناممکن خواب لگتا ہے جس سے میں جاگنا نہیں چاہتی کیونکہ جب میں جاگتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں تو بہت مجبور و بے بس اور تنہا خاتون ہوں اور میری کوئی بھی خوشی میری دسترس میں نہیں ہے۔ میں جو پہلے ہی مکمل خوشی کم ہی محسوس کرتی تھی آپ نے مجھے مکمل خوشی کے تصور سے بالکل ہی دور کر دیا ہے۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ میں ہمیشہ ہی اب اپنی ہر چھوٹی یا بڑی خوشی کو نامکمل محسوس کروں گی۔

مجھے اپنی طرح خود پسند اور تھوڑے سے مغرور لوگ اچھے لگتے ہیں۔ مزے کی بات اس وقت ہو سکتی ہے میرے لیے کہ جب صرف میں آپ کے ساتھ کہیں جا سکوں۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر کوئی مجھے صرف چوبیس گھنٹے کبھی دے دے آپ کے ساتھ گزارنے کے لیے تو میں اس کے بدلے اپنی زندگی کے چوبیس سال یا پوری زندگی بھی اسے دے سکتی ہوں کہ میں آپ کا ہر رُوپ دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیسے سوتے ہیں آپ' کیسے جاگتے ہیں' کیسے لکھتے اور پڑھتے ہیں' کیسے سوچتے ہیں اور کیسے وقت گزارتے ہیں۔ کیا آپ میرے بارے میں کبھی کچھ لکھیں گے؟

بابا ایران جا کر بیٹھ گئے ہیں اور ان دنوں مشہد شریف میں ہیں۔ اپنے

مقبرے کے لیے وہاں پر دروازہ تیار کرا رہے ہیں کوئی بہت خوبصورت اور قیمتی قسم کا۔ کیا یہ عجیب اور مضحکہ خیز سی بات نہیں کہ کوئی اپنی زندگی میں ہی اپنا مقبرہ بنائے۔

اتنی سخت ''پنڈ دی کڑی'' ہوں کہ کبھی بڑی سنجیدگی سے سوچتی ہوں کہ وہ جو ایک لڑکی کانونٹ میں پڑھتی تھی فادر بشپ میکائین کے ہمراہ کرسمس کے دنوں کے آنے سے پہلے کانونٹ سے ملحق قدیم اور عظیم چرچ کے ٹھنڈے نیم اندھیرے' خاموش اور اکیلے وسیع و عریض ہال کمروں میں مقدسہ مریم اور حضرت عیسیٰ کے مجسّموں اور قد آدم تصاویر کے درمیان عقیدت سے سر ڈھکے' دبے پاؤں چلتے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کرتی تھی وہ کوئی اور لڑکی تھی میں نہ تھی (شاید میں نے آپ کو کبھی لکھا ہے کہ فادر بچپن سے ہی کانونٹ میں جانے کے وقت سے ہی میرے شفیق بزرگ دوست اور میتھس کے استاد بھی تھے۔ میں نے بائبل بھی ان سے لے کر پڑھی تھی کسی ناول کی طرح اور پھر اسے سمجھا تھا ان سے۔ وہ بائبل اور ان کی دی ہوئی چاندی کی ننھی سی صلیب آج بھی میرے پاس ہے چھپی ہوئی صرف سوان کو ان کا پتہ ہے) اور وہ اچھے شعروں' اچھی کتابوں کی عاشق ایک لڑکی ہے جو رُوسی' انگریزی اور اردو ادب پڑھتی ہے۔ کبھی لیڈی میکبتھ بنی تھی کالج کے سٹیج پر.... اور جوڑودین کی تمنا میں بالکل فنا ہو جانا چاہتی ہے۔ ہمیشہ خوشبوؤں' خوابوں' رنگوں' جگنوؤں اور تتلیوں کے دیس میں رہنا چاہتی ہے۔ قوس وقزح پر جھولنا' چاند کو چومنا اور ستاروں کو اوڑھنا چاہتی ہے۔ وہ بھی کوئی اور ہستی ہے میں نہیں ہوں۔ میں نصرت بھٹو کے عورتوں کے سیمنار سینے پر لینن کا بیج لگا کر گئی تھی جس نے طاہرہ مظہر علی خان کے کمرے میں ان سے اور ایک اور مشہور سوشلسٹ خاتون عالیہ امام سے گھنٹوں کچھ اتنی بور' اتنی سنجیدہ اور کچھ اتنی اچھی اور سچی باتیں سنی تھیں (اور نصرت بھٹو نے مجھے ذرا بھی متاثر نہ کیا تھا) وہ بھی میں نہ تھی کوئی اور لڑکی تھی.... کہ میں تو بس ایک بالکل سیدھی سادی ان پڑھ پنڈوری لڑکی ہوں۔ کم سوچنے' کم جاننے' کم علم رکھنے والی تاکہ زندگی کا دائرہ مختصر اور آسان ہو۔ سیدھا سادا ہو..... صرف سرخ جوڑے سونے کے جھمکوں اور بچوں اور ان کے باپ تک (آپ بھی یہی چاہتے ہیں ناں؟ اور سب اور لوگ بھی یہی کہتے اور سمجھاتے ہیں ناں اور آپ بھی۔)

ایک حدیث کا ترجمہ یاد آ رہا ہے کہ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں...'' تو مجھے کبھی کبھی آپ یہ خزانہ لگتے ہیں جسے صرف میں نے پہچانا اور کبھی کبھی خود پر ایسے خزانے کا گمان ہوتا ہے جسے صرف آپ پہچان سکتے تھے۔ ویسے آپ کو کون سی بات صحیح لگتی ہے؟

اگر کبھی آپ سے ملاقات ہوتی تو میں سوچتی ہوں آپ سے کہتی کہ آنکھیں بند کریں ذرا اور جب آپ ایسا کر لیتے تو آپ کو بہت غور سے دیکھتی۔ آپ کے ہر نقش کو اپنے اندر اچھی طرح اتارنے کے لیے اندھوں کی طرح آپ کے چہرے پر آنکھوں پر ہر نقش پر انگلیاں پھیر کر انہیں محسوس کرتی۔ آپ کو محسوس کرتی کہ سچ مچ آپ حقیقت ہیں' وجود ہیں' خواب نہیں ہیں۔ خدایا اتنی شدید چاہت.... نہ میں کسی اور کو دے سکتی ہوں اور نہ کوئی اور آپ کو دے سکے گا۔

کل شام سے اتنی سردی میں باہر اکیلی پھر رہی ہیں۔ بابا نے فوراً مجھے اپنے پاس بڑے بابا کے مقبرے کے کمرے میں اُسی وقت طلب کیا تھا۔ ڈانٹا تھا قہوہ پلایا تھا... مگر یقین کریں کہ میری آنکھوں میں تو تب بھی وہی خواب تھا۔ ہلکا سا خیال اس اجنبی کا بھی آیا تھا جسے میں نے سالوں پہلے ایک صبح اسی مقبرے میں دیکھا تھا محو تلاوت اور حیران کر دیا تھا اپنی موجودگی سے۔ آپ کو بھی یہ بات کسی خط میں لکھی تھی ناں تو آپ نے لکھا تھا کہ ''مجھے تو یہ قرون وسطیٰ کی کسی ایرانی خانقاہ کا کوئی باب لگتا ہے'' کہیں میں بھی تو آپ کو اُسی دور کی کوئی روح کوئی ''عذرا'' نہیں لگتی جس کی عمر اور حسن صدیوں پر محیط تھا۔

''رسیدی ٹکٹ'' میں امرتا پریتم نے لکھا ہے کہ میرا بیٹا پوچھتا ہے امی میں کہیں ساحر انکل کا بیٹا تو نہیں ہوں؟ وہ لکھتی ہے کہ ''جب وہ پیدا ہونے والا تھا تو میں ہر وقت ساحر کی تصویر دیکھتی تھی اس کے بارے میں سوچتی تھی تاکہ بیٹا بالکل ساحر جیسا ہو۔'' میں اتنی حیران ہوں اس کی سوانح حیات خود اس ہی کی لکھی ہوئی پڑھ کر کہ وہ کتنی سچی عورت ہے اور کس طرح ساحر کے لیے بالکل ایسے ہی سوچتی ہے جیسے میں رُودین کے لیے سوچتی ہوں۔ امرتا مذہب کی دیوار کو نہیں

مانتی۔ ساحر کے سلسلے میں اور میں بھی اپنے بڑوں کا نظریۂ سادات اور نظریہ رومی نہیں مانتی آپ کے لیے۔ مجھے تو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ آپ مجھ سے یا سیدوں اور رومیوں سے الگ کوئی چیز ہیں اور امرتا کی بات پڑھ کر میں نے سوچا' عہد کیا کہ میں بھی بس اسی طرح کروں گی.... تاکہ میرا بیٹا بھی کچھ تو میرا ہو سکے۔ آپ کے بیٹے جیسا ہو سکے کچھ تو.... مگر نہیں اس کے باوجود بھی مجھے لگتا ہے.... کہ صرف آپ کے بارے میں بہت سوچنے' صرف آپ کی تصویر ذہن میں رکھنے کے باوجود بھی.... وہ صرف ناصر کا بیٹا ہوگا میرا نہیں۔ گھر اور ہر چیز بھی بس ناصر کی ہوگی۔

اپریل کی بڑھتے چاند کی تاریخوں میں کسی تاریخ کو وہ ''واردات'' عمل میں آئے گی جس پر تحفہ دینے کے آپ خواہشمند ہیں۔ میں مطلع کردوں گی.... آپ کو خوشی ہوگی اس ''واردات'' پر؟ میری شادی پر؟

''نتالیہ''

تسلیمات!

اُف خدایا! مجھے بالکل احساس نہ تھا کہ آپ کے بیٹے کے حوالے سے کیا لکھ گئی ہوں۔ سوچتی ہوں کس کس طرح سے سوچنا سکھا دیا ہے آپ نے مجھے۔ میں جو اپنے خیالوں میں ایک بے فکر' لاپرواہ اور معصوم سی لڑکی تھی اور میں نے کبھی اپنے سوا کسی اور کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہ تھا لیکن مجھے اب احساس ہوا ہے کہ جیسے آپ نے ذہنی طور پر مجھے ایک دم بہت بڑا بڑا بنا دیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا ذہن اب ایک معصوم لڑکی کا ذہن نہیں رہا بلکہ ایک دم ایک مکمل ''عورت'' کا ذہن بن گیا ہے۔ ورنہ میں ایسی بات اس طرح بلا سوچے سمجھے کیسے لکھ ڈالتی۔ پتہ نہیں کیوں میں اپنی کوئی بھی سوچ آپ سے چھپا نہیں سکتی ورنہ یہ بات کوئی لکھنے کی تھی اگر تھی بھی تو صرف سوچنے کی اور دل میں رکھنے کی تھی۔

زہے نصیب! کہ جناب اگر کہیں عرب وغیرہ میں شیخ ہوتے کچھ تو حرم

میں گنجائش پیدا کرتے لیکن یہ تو بتائیں جناب شیخ صاحب کہ آپ اپنے عوام کے لیے کیا کرتے؟ اور کیا داڑھی بھی رکھتے کیونکہ ایسا شیخ مجھے ذرا پسند نہ ہوتا جو داڑھی دار ہو اور خود شراب پیتا ہو جبکہ عوام پانی کو بھی ترستے ہوں۔

کتنی خوبصورت بات ہے کہ آپ مجھے کسی خاص نام میں قید نہیں دیکھتے۔ مجھے ایسا لگتا ہے خود بھی کہ جیسے کہیں بھی کسی بھی نام یا قومیت یا مذہب کی کوئی بھی لڑکی آپ کو ملی اور اچھی لگی تو جیسے وہ میں ہی تھی صرف میں تھی اور آئندہ بھی وہ میں ہی ہوں گی۔

''نتالیہ''

میری امیدوں، میرے خوابوں اور میری ذاتی مسرت میں کوئی بات مشترک نہیں..
محبت..میرے لیے نہیں میں اس کے قابل نہیں ہوں..میں بوڑھا ہو چکا ہوں..میں کسی کو اپنے عشق میں دیوانہ کیسے بنا سکتا ہوں..خدا کرے کہ میں خود ہی دیوانہ ہونے سے بچا رہوں..

''ترگنیف کے ''رودین'' میں سے''

جو بھی رودین ہوتے ہیں وہ دیوانے ہو کر رہتے ہیں، بچ نہیں سکتے..صرف ان کی دیوانگی کسی پر عیاں نہیں ہوتی جب تک کہ کہیں سے ایک نتالیہ نہ آ جائے..

بدخشانی گھوڑے پر سوار وہ شاید صرف ایک رودین کی تلاش میں ادھر آ نکلا تھا..اس کے چرمی تھیلے میں پچیس برس پیشتر لکھا گیا کوئی ایسا خط ہو سکتا تھا جو نتالیہ نے اپنے سرخ عروسی جوڑے کی کسی اندرونی کروٹ میں اس نیت سے سنبھالا ہو کہ وہ موقع ملنے پر اپنے خاوند سے پوشیدہ ہو کر اسے پوسٹ کر دے گی اور وہ نہ کر سکی..شاید بھول گئی..شاید مر گئی اور اس کے سیاہ رومی صندوق کی تہہ میں سے برآمد ہونے والے..اب تک اتنا بوسیدہ ہو چکے کہ اس کے تار ڈھیلے اور مردہ ہو چکے ہوں عروسی جوڑے کی اندرونی کروٹ میں سے کسی کے ہاتھ نے..شاید اس کی بیٹی کے جستجو کرتے ہاتھ نے اسے وہاں پایا ہو اور پوسٹ کر دیا ہو..شاید! شاید اس خط میں بالآخر اس نے ہار مان لی ہو اور اقرار کیا ہو کہ ایک سیدزادی پر آیا ہوا جن اتر گیا ہے..وہ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر ایک نئی اور سنہری کرنوں کے گوٹے سے آراستہ زندگی میں آزادی اور چھٹکارے کے ایک نئے احساس کے ساتھ داخل ہو رہی ہے..

وہ جولاہی نہیں رہی..

برنے کے پیڑ سے بندھے رسے کو اس نے اپنے پاؤں سے کھول کر خود آزاد کر لیا

ہے..عشق کی پینگ کے ہلارے سے نجات حاصل کر لی ہے اور وہ اب صرف غم حسین میں روتی ہے..

یا پھر یہ خط اُن زمانوں سے پچیس برس بعد اِن زمانوں میں وہ جہاں کہیں بھی ہے..اگر ہے تو..لکھا گیا ہے اور اس میں صرف ایک سطر ہے..

''رودین میں لوٹ آئی ہوں..تمہاری نتالیہ..''

جولاہے کی داڑھی کھڈی کے تانے پیٹے کے دھاگوں کو چھونے لگی تھی کیونکہ اسے سُوت کی وہ گانٹھ سلجھاتے جو ایک ہموار اور پھولدار کھیس بننے کی راہ میں رکاوٹ ہوگئی تھی پچیس برس ہو گئے تھے..

اگر وہ احتیاط نہ برتتے تو داڑھی کے سفید بال تانے پیٹے کے دھاگوں میں الجھ کر کھیس میں بُنے جا سکتے ہیں.. اس لیے وہ اپنی گردن سیدھی رکھے کھڈی چلاتا تھا تاکہ اس کے سفید بال تانے پیٹے کا حصہ نہ بن جائیں..

اب جا کر پچیس برس بعد کھیس کی سطح ہموار ہو رہی تھی.. اس میں کوئی اٹک ایسی نہ رہی تھی جو اس کی بناوٹ میں رکاوٹ ہو..

وہ تو نہ آئی جو گم ہو چکی تھی..

البتہ یہ ہے کہ وہ خط جو ایک نتالیہ نے ایک اَن دیکھے رودین کی چاہت کے ہاتھی تلے روندے جانے کے دوران لکھے تھے.. خستہ اور بھربھرے ہو رہے تھے' ان کی رنگت خزاں میں جا چکی تھی کہ حساب کتاب کے رجسٹر سے پھاڑے جانے والے فل سکیپ اوراق کا کاغذ بہت معمولی اور درمیانے درجے کا ہوتا ہے.. وہ خط آ گئے!

ایک نادیدہ' غیر قدرتی اور نہ سمجھ میں آنے والے عشق میں بندھی نتالیہ کی گانٹھ کھولنے میں پچیس برس صرف ہو گئے تھے اور تب کہیں جا کر.. جب جولاہے کی داڑھی کے سفید ریشمی بال تانے پیٹے کو چھونے لگے تھے.. کھیس کی بُنت میں روانی نے جنم لیا تھا..

یہ نہیں کہ صرف جولاہے پر.. بلکہ رودین اور نتالیہ پر بھی وہ پچیس برس گزر چکے تھے..

برس ہا برس بعد جب وہ دونوں اپنے چہرے پر بُنی جھریوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور

بالوں کو انتہائی احتیاط سے ایک ایک بال الگ کر کے رنگتے تھے اور ایک دوسرے کے وجود اور مقام سے آگاہ تک نہیں تھے کہ کون کہاں ہے تب ایک نتالیہ اپنے رودین کو ایک اور خط.. برس ہا برس کے تعطل کے بعد.. پھر سے لکھ سکتی تھی.. صرف ایک سطر میں ''رودین میں لوٹ آئی ہوں.. تمہاری نتالیہ..''

لیکن ایسا نہیں ہوا تھا..

جولاہی اتنے برسوں میں برنے کی پینگ سے اتر آئی ہوگی.. ہاتھی عشق کے تلے روندے جانے کے بعد اپنے زخم سہلاتی پھر سے بھلی چنگی ہوگئی ہوگی.. خاوند اور اولاد کے دھاگوں میں بندھ کر کسی روایتی کھیس میں بُنی گئی ہوگی..

لیکن ایسا بھی نہیں ہوا تھا..

ایسا ہونا چاہیے تھا، کیوں نہ ہوا..

وہ دراصل کینسر وارڈ میں نہیں تھی..

نتالیہ!

پچیس برس بعد آستانۂ رومی کی نتالیہ کینسر وارڈ میں نہیں تھی.. کسی بھی ہسپتال کے کسی عام سے وارڈ میں تھی جہاں درجنوں عورتیں نہایت معمولی عوارض میں مبتلا یا مکمل صحت مند حالت میں صرف اس لیے استراحت فرماتی تھیں کہ وہ فُلی انشورڈ تھیں۔ انہوں نے پچھلے کئی برس سے کئی ہزار ڈالر اپنی کئی جائز ضرورتیں پس پشت ڈال کر ہیلتھ انشورنس کے تسلسل کے لیے خرچ کیے تھے اور جب انہیں کوئی بھی عارضہ لاحق نہ ہوا.. کسی جان لیوا مرض نے آ نہ لیا تو کسی حد تک مایوس ہوئیں اور اب یونہی سینے میں معمولی درد.. گھٹنوں کے گاؤٹ یا سر چکرانے جیسے عوارض بیان کر کے یہاں اپنی انشورنس کے پیسے پورے کرنے کی خاطر استراحت فرماتی تھیں..

ان میں زیادہ تر سنگل ورکنگ وومن تھیں جو اکثر سرِشام غائب ہو جاتیں اور صبح سویرے ہنستی کھلکھلاتی.. اوہ وہاٹ اے نائٹ.. کی اطلاع فراہم کرتیں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ جاتیں..

صرف نتالیہ تھی جس نے اس عام سے وارڈ کو کینسر وارڈ بنا دیا تھا..

امریکہ میں صحت اور تندرستی کا ایک ایسا پاگل پن ہے جس میں کسی بھی صحت مند اور تندرست شخص کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور اسے کتابوں، میڈیا اور حکومت کی جانب سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر اسے کوئی بھی بیماری نہیں تو وہ یقیناً ایک صحت مند امریکی نہیں ہے۔ اس لیے باقاعدہ چیک اپس ایک روٹین ہیں..

کسی شخص کے چہرے پر اگر ایک پھنسی بھی نکل آئے تو خطرے کے الارم بجنے لگتے ہیں..

ایک ایسے ہی چیک اپ کے دوران نتالیہ کے رحم میں ایک نہایت معمولی بالیدگی.. ایک پوتھی کے اوراق میں پوشیدہ سونے کے کسی مہین ذرّے سے بھی زیادہ مہین ایک نشوونما کا شائبہ ہوا جو کینسر بھی ہو سکتی تھی اور اسے فوری طور پر الگ کرنے کے لیے کسی بڑے آپریشن کی ضرورت نہ تھی صرف اس کی ناف میں ایک نہایت حساس آلہ داخل کر کے اسے کاٹ دیا جانا تھا۔

نتالیہ نے اپنے ہم وطن ڈاکٹر کی یہ تشخیص سنی تو اسے اور کچھ سنائی نہ دیا کہ یہ ایک نہایت معمولی گروتھ ہے.. اور اس کے لیے کسی بڑے آپریشن کی ضرورت نہیں ہے.. اس نے اس ساری تشخیص میں سے صرف کینسر کا لفظ سنا اور ہراساں ہو گئی..

آستانۂ رومی کے اردگرد جتنے بھی وہم اور خوف تھے.. جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی، وہ سب کے سب اتنے برسوں بعد بہترین مواقع کی حامل سرزمین یعنی امریکہ میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچ گئے کہ ان کی زبان میں کینسر کا ترجمہ صرف موت تھا..

اور وہ ہراساں ہو گئی..

اتنی زیادہ کہ اس ہفتے اپنے بال بھی نہ رنگ سکی اور ان کی سفید جڑیں نمایاں ہونے لگیں..

چنانچہ جہاں وہ تھی، وہ کینسر وارڈ نہ تھا صرف نتالیہ کی موجودگی نے اور اس کے ہراس نے اسے ایسا بنا دیا تھا..

وہ کسی سے کلام نہ کرتی تھی..

بولتی نہ تھی..

ڈاکٹر چیک اپ کے لیے آتے تو اس کی شیٹ کا معائنہ کرتے ہوئے جو کچھ بھی پوچھتے وہ اس کے جواب میں ہاں یا نہ کے علاوہ کچھ نہ کہتی کہ وہ اتنی ڈر گئی تھی..

بستر کے سامنے کھڑکی کے آگے تنے باہر کے منظر کو روپوش کرتے جو پھولدار پردے تھے، وہ ان پر نظریں جمائے مسلسل ایک سحرزدہ شخص کی طرح انہیں تکتی رہتی..

ان پردوں میں خفیف سی حرکت ہوتی، وہ بے شک وارڈ کا دروازہ بند ہونے کے دباؤ سے ذرا سرسراتے تو وہ ان علامتوں میں سے اپنی حیات کی فال نکالنے لگتی..

میں زندہ رہوں گی.. یا نہیں؟

مجھے آپریشن تھیٹر میں لے جایا جائے گا تو کیا میں اسی بستر پر اسی پھولدار پردے کے سامنے واپس آؤں گی یا کہیں دفن کر دی جاؤں گی جہاں میرا خاوند یا بچے آئیں گے یا نہیں؟

اس کا انحصار صرف میرے سامنے کھڑکی کے آگے تنے پھولدار پردے پر ہے۔

اگر اس پر جو ایک شوخ رنگ گُلِ لالہ ہے وہ خفیف سی حرکت کرے گا تو میں واپس آ جاؤں گی.. نہیں کرے گا' ساکت رہے گا تو دفن ہو جاؤں گی..

مر جاؤں گی..

وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گئی تھی..

پردیس میں انسان ہمیشہ کچھ زیادہ ہی ڈرتا ہے.. اسے اپنے وطن سے بچھڑے ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں.. وہ صدیوں سے اس دیس میں تھی اور اس کے باوجود کہ اس نے اپنے سارے بچے یہاں جنے تھے' یہ پردیس تھا.. شاید پہلی بار اسے آبائی وطن کی صفت سے آگاہی ہوئی.. اُس وطن میں ڈر کم ہوتا ہے.. اگر وہ اِس لمحے آستانۂ رومی کی کسی کچی کوٹھڑی میں بے یار و مددگار بھی پڑی ہوتی تو اس میں ڈر نہ ہوتا.. یہ صفت تھی وطن کی.. اور یہاں.. جہاں دنیا کی بہترین طبی سہولتیں تھیں.. مرے بندے کو بھی بجلی کے دھچکے دے کر واپس لے آتے تھے.. یہاں ڈر تھا.. یہ صفت ہوتی ہے پردیس کی کہ اس میں ڈر بہت ہوتا ہے..

گُلِ لالہ سے مزین کھڑکی کے آگے تنا وہ پردہ اس کی آنکھوں کے لیے ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جہاں وہ منجمد ہو گئی تھی.. وہ ٹکٹکی باندھ کر اس کے پھولوں کو تکتی رہتی.. کبھی پھولوں کی پتیاں حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتیں صرف اس لیے کہ کوئی نرس اس کے قریب سے گزر گئی تھی.. نتالیہ کی آنکھیں گویا اس میں نصب ہو گئی تھیں اور وہ اس کی خفیف سی حرکت سے اندازے لگاتی رہتی تھی.. فال نکالتی رہتی تھی..

اسے ذاتی طور پر احساس نہ ہوتا کہ وہ گُلِ لالہ کے کسی ایک پھول پر پہروں سے نظریں جمائے ہوئے ہے.. جب تک کہ ایک فربہ افرو امریکی نرس' جس کے کھلے منہ سے شراب کی بو ایسے برآمد ہوتی تھی جیسے سینٹ جارج کے ہاتھوں مارے جانے والے اژدھے کے منہ سے آگ نکلتی ہے.. اس کے آگے کھانے کی سفید ٹرے کھسکا کر کہتا: ''بے بی.. کم بیک ٹو دہیر یو بیلانگ..'' اور وہ چونک کر گُلِ لالہ سے واپس آ جاتی.. ''بے بی'' کا ساکت وجود زندہ ہو جاتا' پتھرائی ہوئی آنکھوں

میں جان آ جاتی.. وہ اپنے سامنے رکھی سفید ٹرے میں قرینے سے سجی خوراک کو ایک نظر دیکھتی اور اسے ابکائی سی آ جاتی اور وہ بمشکل چند قتلے آلوؤں کے اور دودھ کا ایک گلاس حلق سے اتارتی..

اسے ابھی تک جب کہ وہ آستانۂ رومی میں بیتی ہوئی زندگی کے دنوں سے کہیں زیادہ دن زندگی کے اُردن اور امریکہ میں گزار چکی تھی.. اس خوراک کی چاہت نہیں ہوتی تھی.. اس کے نتھنے ابھی تک ہلدی اور ادرک کی بُو باس کے لیے پھڑکتے تھے.. دیسی گھی کے تڑکے کو ترستے تھے.. یہاں بھی' امریکہ میں' وہ ایک عرصہ اپنی خوراک کی بُو باس سے جُڑی رہی لیکن بچے ذرا بڑے ہوئے تو وہ اعتراض کرنے لگے کہ ممی ہمارے دوست ہمارے گھر آتے ہیں تو وہ بدبو کے باعث سانس نہیں لے سکتے.. آپ کیوں اس قسم کے کھانے بناتی ہیں جو صرف آپ یا کبھی کبھار ڈیڈی کھا لیتے ہیں.. کیا آپ دوسرے لوگوں کی مانند صاف ستھرے اور بدبو سے پاک کھانے نہیں بنا سکتیں؟

اس نے ہتھیار ڈال دیے لیکن کبھی کبھار صاف ستھرے کھانے حلق سے نگلتے نگلتے اس کی طبیعت اوبھ جاتی اور وہ چوری چھپے فرائنگ پین کو کھڑکی سے باہر نکال کر تڑکا لگا لیتی تاکہ گھر کے اندر اس کی مہک یا بچوں کی زبان میں اس کی بُو نہ پھیلے.. پھر بھی اس کی چوری پکڑی جاتی اور بڑا بیٹا گھر میں داخل ہوتے ہی کہتا.. ''ممی! آپ کیوں باز نہیں آتیں..'' اور وہ باز آ گئی..

ان دنوں جب وہ پلنگ پر ٹانگیں پسارے سردیوں کی دھند آلود دھوپ میں لیٹی رہتی تھی اور گاؤں کی عورتیں اس کی انگلیوں پر اپنے بوسے نچھاور کرتی تھیں اور وہ لہسن اور پیاز کی منتقل کردہ بُو سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنی انگلیاں بار بار دھوتی تھی' تب ایک مریدنی آشاں بی بی نام کی تھی جو سرسوں کے گندلوں کے ساگ کو اپنی ڈوری میں گھوٹ گھوٹ کر' اس میں جی بھر کر مرچیں' لہسن اور ادرک ڈال کر اسے ایک کچی ہانڈی میں کچے چولہے پر پکا کر.. اور اس کے ذائقے میں آشاں بی بی کی وہ پھونکیں بھی شامل ہوتی تھیں جو اُپلوں کو سلگانے کی کوشش میں وہ پھونکتی تھی اور اپنی آنکھیں بیر بہوٹی کی مانند سرخ کر لیتی تھی اور پھر اس ساگ کی ہانڈی سیدزادی کے قدموں میں رکھ کر التجا کرتی تھی کہ.. آلِ نبیؐ.. اولادِ نبیؐ.. اس ساگ کو ڈنگروں کے آگے ڈالنے سے پہلے صرف چکھ لو تو میری مراد پوری ہو جائے گی..

آشاں بی بی کے لیے وہ.. سیدزادی ایک کرشن تھی اور جیسے کرشن کی ایک مریدنی نے ان کے چرنوں میں بیروں کی بھینٹ چڑھانے سے پیشتر ہر بیر کو چکھ لیا تھا کہ کہیں یہ کھٹا تو نہیں اور

کرشن کے کان بھرے گئے تھے کہ دیکھو بھینٹ کیا ہوا ہر بیر دانتوں سے کترا جا چکا ہے..لیکن وہ بدگمان نہ ہوئے کہ وہ جانتے تھے کہ مریدنی نے ایسا عقیدت اور محبت میں ڈوب کر کیا ہے تو ایسے ہی آشاں بی بی اس بھینٹ کیے جانے والے ساگ کو پہلے چکھتی تھی کہ کہیں اس میں کڑواہٹ تو نہیں..

اور آشاں بی بی کی جہالت اور عقیدت یہ کیسے جان سکتی تھی کہ جس کرشن کی وہ گوپی ہے..دراصل وہ ایک اور کرشن کی پجارن ہے..

اور آشاں بی بی یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ سیدزادی کا کرشن قدرے بے پروا تھا اور وہ اس کے غم میں جولاہی ہوگئی تھی..برنے کی سب سے اونچی شاخ کو اس کی ستواں سیدناک جا چھوتی تھی..

ایک اندھیری کوٹھڑی میں ایک کھیس بُنتے بُنتے اسے مدتیں بیت چکی تھیں..اور یوں اس کے کولہے کی ہڈی پچیس برس تک ایک ہی مقام اور ایک ہی نشست پر بیٹھے بیٹھے پچک گئی تھی..چپٹی ہوگئی تھی..

لیکن اندھیاری کوٹھڑی کی کچی تنہائی میں مسلسل پچیس برس تک بیٹھا رہنے والا کھٹ کھٹ کھڈی چلانے والا تو ایک جولاہا تھا..

نہیں وہ جولاہی بھی تھی..

ان دونوں میں کچھ فرق نہ تھا..

وہ دونوں حق تھے..

یہ تو محض سراب ہیں کہ کھڈی پر کون بیٹھا ہے..اگر کھڈی کے تانے پیٹے کو ایک سفید ریش کے بال چھو رہے ہیں تو یہ محض سراب ہے...دکھاوا ہے...من تو شدم..تو من شدی...من دیگرم تُو دیگری....دونوں حق ہیں...

کولہے کی ہڈیاں مسلسل بیٹھے رہنے سے دونوں کی پچک چکی ہیں' چپٹی ہوگئی ہیں..

موت کے بعد ہڈیوں کی ساخت سے کھوج لگانے والے ماہر کسی بھی ڈھانچے کو پرکھتے ہوئے ان کی حیات کے بارے میں بہت کچھ جان جاتے ہیں..ریڑھ کی ہڈی کے جھکاؤ سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کسی زمین دوز قبر میں سے برآمد ہونے والی یہ حنوط شدہ ممی دراصل فرعون کے دربار میں پیپرس کے ریشوں سے بنے ہوئے ایک کاغذ پر ہمہ وقت جھکے ہوئے ایک درباری منشی کی ہے..اور اگر اس ڈھانچے کے کولہے کی ہڈی چپٹی ہوتی تھی تو انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شخص شاہی ملبوسات تیار کرنے والا ایک جولاہا تھا جو تمام عمر ایک ہی حالت میں بیٹھا ان کی

بُنت میں مصروف رہا..

ہزاروں برس بعد اس جولاہے یا جولاہی کا ڈھانچہ اگر کہیں سے برآمد ہوا تو وہ لوگ بھی جان جائیں گے..ان کی پچکی ہوئی کولہے کی ہڈیوں سے..کہ وہ ایک ہی مقام پر بیٹھے اپنے حیاتی کے' اپنے عشق کے کھیس بُنتے رہے تھے..

آشاں بی بی..کچے چولہے میں گیلے اپلوں میں پھونکیں مارنے والی..جب کہ وہ اپنے کرشن کے لیے ساگ کی سوغات پکاتی تھی یہ کیسے جان سکتی تھی کہ اس کے کرشن کے آگے اس کرشن کا بھی ایک اور کرشن ہے..!

یہ گمشدہ زمانوں کے قصے تھے..

لمحۂ موجود میں نہ کوئی کرشن تھا اور نہ کنہیا..

ایک وارڈ تھا جسے نتالیہ کی موجودگی نے کینسر وارڈ بنا دیا تھا..

صرف سرسوں کا آشاں بی بی کی پھونکوں کے ذائقے والا' سرسوں کا ساگ نہ تھا جو اس کے نتھنوں میں اداسی اور بے وطنی کے ذائقے بھرتا تھا....مکھڈی..میٹھا اور مٹی کی مہک سے ہمکتا حلوہ بھی تھا جو فتح جنگ سے آئی ہوئی ایک مریدنی اس کے چرنوں میں رکھتی تھی..

اس کے شکاری باپ کی ماری ہوئی..اگر وہ انہیں مارتا تھا تو..کچھ مرغابیاں..تیتر اور تلور بھی تھے..

اگرچہ مرغابیاں چار بھی ہوتیں تو ان کا خوشی سے کوئی تعلق نہ بنتا..

نتالیہ کو اس بدیسی خوراک کی جو کہ اب اس کے دیس کی خوراک تھی ابھی تک عادت نہیں ہو پائی تھی اور اس کے نتھنے لہسن اور ادرک کی بُو کے لیے ترستے تھے۔صرف ایک گلاس دودھ اور آلو کے چند قتلے حلق سے اتارتے ہوئے وہ آشاں بی بی کے ساگ کے ذائقے..پچیس برس پیشتر ایک کچی ہانڈی اور سلگتے اُپلوں والے کچے چولہے پر پکائے جانے والے ساگ کی مہکار میں چلی گئی تھی..

اس انمٹ سفید تنہائی میں..بستر کی چادریں' وارڈ کی دیواریں' نرسوں کے اوورآل..

اور موت کی قربت کی سفیدی میں..

موت کو سیاہ قرار دینا بھی کیسا مرگ مذاق ہے..

موت کبھی بھی تاریک نہیں ہوتی..

جنہوں نے اس کا تجربہ چکھا ہے اور پھر لوٹ آئے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ نور کی ایک دمکتی غار تھی جس میں ہم سفر کرتے تھے.. یہ ہمیشہ بے رنگ ہوتی ہے.. ہمیشہ سفید ہوتی ہے..

تو اس ان مٹ سفید تنہائی کے اکلاپے میں.. جب کہ نتالیہ کا مرض دراصل جان لیوا نہ تھا اور وہ کینسر کا ترجمہ صرف موت کرتی تھی اپنے بے وطن ڈر کے سائے میں آئے ہوئے یہ طے کر چکی تھی کہ وہ اب بہر طور مر جائے گی..

یہ تو ہونے کا نہیں اس کی ناف میں ایک گھومتا ہوا تکلا داخل کر کے اس کے رحم میں پوتھی کے اوراق میں رکھا جو ایک ذرّے برابر بڑھے ہوئے گوشت کا ایک ذرّہ ہے' اسے الگ کر دیا جائے اور وہ بھلی چنگی ہو جائے.. اگر یہ کینسر کی کوئی بھی علامت تھی تو اس کا ترجمہ موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا.. تو اس ہراس اور موت کے خوف نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ موت کی سفید تنہائی کے اندر مدغم اور کھو جانے سے پیشتر وہ کیا کرنا چاہے گی.. جیسے پھانسی کے پھندے کو گلے میں ڈالنے سے پیشتر یہ پوچھا جاتا ہے کہ تمہاری آخری خواہش کیا ہے تو نتالیہ نے بھی اپنے تئیں اس پھندے کو اپنے گلے کے گرد محسوس کرتے ہوئے اپنی آخری خواہشوں کا دل ہی دل میں ڈوبتے دل میں اظہار کیا..

میں اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں..

ہاں میری خواہش ہے کہ.. میں اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں.. سب کو بیک وقت.. بیڈ کے آس پاس.. مجھ پر جھکے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں..

بچے ویسے تو محو تھے.. اپنے کام کاج اور بدن کی آسودگی میں محو تھے.. مگن تھے.. لیکن انہوں نے اپنی ماما کو فراموش ہرگز نہیں کیا تھا.. وہ اس کا دھیان رکھتے تھے.. چھٹی کے روز نہایت مہنگے بُوکے سنبھالتے ہوئے آتے تھے جن کے پھولوں میں ''ماما ووئی مس یو'' یا ''گیٹ ویل سون'' کے کارڈ سجے ہوتے تھے.. وہ بار بار اس کے گالوں کو چومتے اور اس کا ہاتھ تھام کر نہایت الفت بھری نظروں سے اسے دیکھتے تھے اور تھوڑی دیر بعد چلے جاتے تھے.. انہوں نے ماما کے لیے جو دس منٹ مختص کر رکھے ہوتے تھے' انہیں پورا کر کے چلے جاتے تھے..

یہ وہ بچے نہیں تھے جو ایک ماما کی خواہش پر پانی کا ایک گلاس تھامے ساری رات اس کے سرہانے کھڑے رہتے ہیں.. جب کہ وہ سو چکی ہوتی ہے.. اور یہ ملک بھی وہ نہیں تھا..

میں اپنے بچوں کو بیک وقت.. سبھی کو.. اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی ہوں..

اور اس کے بعد..

اس خواہش کے بعد میں موت کی سفیدی میں اتر جانے سے پیشتر کیا چاہتی ہوں..

رودین کو دیکھنا چاہتی ہوں.. سننا چاہتی ہوں.. مرنے سے پیشتر..

نتالیہ کے سرہانے ایک فون تھا..

''ہیلو..''

گئی رات جب بوڑھی ہڈیاں بمشکل آرام پر آمادہ ہوتی ہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجے تو وہ ایک اذیت ہوتی ہے.. ''ہیلو..''

ادھر سے ایک تھکی ہوئی اور بیزار آواز آئی جو رودین کی ہی ہو سکتی تھی.. اتنی تحقیق اس نے کر لی تھی.. اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس کی آواز سن رہی تھی اور وہ قدرے مایوس ہوئی کہ ایک کرشن.. ایک دیوتا کی آواز ایسی معمولی.. انسانی اور جمائیاں لیتی ہوئی تو نہیں ہوتی..

''آپ رُودین بول رہے ہیں؟''

کرشن ان پچیس چھبیس برسوں میں یکسر بھول چکا تھا کہ کبھی وہ ترگنوف کا کردار رُودین بھی ہوا کرتا تھا..

''رُودین؟'' اس نے حیرت سے پوچھا..

''جی..''

اور وہ چپ ہو گئی..

''ہیلو...''

''ہیلو...'' وہ صرف اتنا کہہ سکی..

''بی بی شاید آپ نے غلط نمبر ملا دیا ہے.. یہاں تو کوئی... کیا نام بتایا تھا آپ نے..''

وہ کینسر کی خبر سن کر شاید اتنی ہراساں نہ ہوئی تھی جتنی اب ہو گئی.. ایک یکطرفہ عشق کی خط و کتابت اتنے برسوں بعد کون یاد رکھتا ہے.. دراصل موت تو یہ تھی کہ وہ اپنے کبھی رودین ہونے کو فراموش کر چکا تھا.. اس نے سوچا کہ لاحاصل کی تمنا کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے.. فون بند کر دوں.. پھر اسے غصہ آ گیا کہ میں اتنی معمولی بھی نہیں ہوں کہ عمر بھر غم حسینؑ کے برابر اس کا غم لگائے رکھا.. یومِ عاشور پر.. آستانۂ رومی سے نکلنے کے بعد اب تک جتنے بھی یوم آئے ان سب کی

شام میں آستانۂ رومی میں اس کے لیے قرآن کی اس آیت کو سامنے رکھ کر:

''پس ہم حال جانتے ہیں تمہارے دلوں کا مگر تمہارے لیے پہچان ہے ہر چیز میں تم علم کیوں نہیں دیکھتے۔''

اتنا روئی ہوں اور وہ مجھے بھول جائے.. بے شک بابا کی سفید داڑھی میں سے پھڑ پھڑاتے پرندے جو نکلتے تھے اور حجرے کے گنبد تک کو جا بھرتے تھے ان میں وہ نہ تھا جیسا کہ بابا نے کہا تھا اور ان میں وہ پرندہ نہیں تھا جس کی تُو تلاش میں ہے.... نہیں تھا.. جو تو نے تخیل کی کنواری مٹی کو گوندکر بنایا تھا.. نہیں تھا؟''

''نہیں بابا..''

''جان لے کہ یہ تجھے نہیں ملے گا.. جان لے کہ تیرے تصور کا پرندہ تجھے نہیں ملے گا..''

درست کہ وہ نہیں ملا.. وہ حاصل ہو نہیں سکتا تھا اس لیے نہ ہوا... لیکن میں اس لمحے اُس کی ملکیت کی خواہش تو نہیں کر رہی.. صرف اسے دیکھنے یا صرف سننے کی خواہش کر رہی ہوں.. موت سے پیشتر..

''میں نتالیہ ہوں..''

''نتالیہ؟'' وہ جو اتنے براعظموں کے پار.. دنیا کے بڑے بڑے سمندروں کے پار کہیں تھا اٹھ کر بیٹھ گیا..

''ہاں.. آستانۂ رومی کی نتالیہ جو تمہیں رجسٹر میں سے پھاڑے ہوئے لکیردار کاغذوں پر خط لکھا کرتی تھی... رُودین کو...''

وہ کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ میں ایک سیّدزادی تمہارے عشق کے ہاتھی تلے روندی گئی.. جولاہی ہوگئی.. برنے کے پیڑ سے بندھے رسے میں بندھی اپنے خاندان' حسب نسب کو فراموش کر کے جھولتی رہی اور اب مجھے اپنا تعارف کروانا پڑ رہا ہے.. وہ بہت غصے میں تھی اور کسی بھی لمحے فون کو پٹخ سکتی تھی..

''نتالیہ..'' اس نے ایک بار پھر بے یقینی میں دہرایا..

''ہاں...''

ایک بوسیدہ.. بھوری ہوتی ہوئی فائل میں اس کے چند خطوط کہیں.. کسی الماری کی کسی دراز میں شاید ابھی تک پڑے تھے.. اور اس نے کم از کم پچھلے پندرہ برس سے اس فائل کو نہیں کھولا تھا.. وہ خط سارے کے سارے' جو اسے یاد نہیں تھے اب بولنے لگے.. ان کا کاغذ نیا نکور ہو گیا..

حرفوں کی سیاہی جیسے ابھی گیلی ہو.. لفافے پر ثبت آستانۂ رومی کی مہر جیسے ابھی لگی ہو.. نتالیہ ابھی عدم میں تھی اور ابھی وجود میں آ گئی..

''آپ کہاں سے بول رہی ہو؟''

''تم رُودین ہی ہو ناں؟''

''ہاں..''

''بہت بہت فاصلوں پر ہوں.. بہت دوری ہے جہاں سے بول رہی ہوں..''

''آپ..''

''میں.. آپ نہیں.. تم ہوں...''

''تم... کہاں ہو..''

''تمہیں میں یاد بھی ہوں یا نہیں...؟''

وہ بھی پہلی بار اس کی آواز سن رہا تھا.. ایک گہری اور بیٹھی ہوئی آواز جیسی جنوب کے نیگرو سنگرز کی ہوتی ہے.. کسی قدر مردانہ لیکن اس میں ایک خاص جنسی کشش تھی.. اس کا لب ولہجہ امریکی تھا لیکن کہیں کہیں پوٹھوہار کی سادگی چھب دکھلاتی تھی..

''تم یاد ہو.. لیکن تم ہو کہاں؟''

وہ اب یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں ابھی تک برنے کی شاخوں سے بندھی پینگ سے جھولتی ہوں.. ابھی تک تمہارے لیے اتنی جولاہی ہوں کہ مرنے سے پیشتر اپنے بچوں کے بعد صرف تمہاری آواز سننے کی خواہش کی ہے..

''میں یہیں ہوں..''

''نہیں.. تمہاری آواز کٹ کٹ کر آ رہی ہے...''

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں بہت فاصلوں پر ہوں.. بہت دوری ہے جہاں سے بول رہی ہوں لیکن.. میں یہیں ہوں..''

''تم یاد ہو... لیکن.. کہاں ہو؟''

''میں نہیں جانتی... صرف یہ کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں... کیا تم مجھے مل سکتے ہو..؟''

''اگر تم کہیں آس پاس ہو تو...''

''میں تمہارے آس پاس آ جاؤں گی... جہاں میں ہوں وہاں محض انتظار ہے.. میں

اسے کسی بھی لمحے ترک کر کے آ سکتی ہوں..اگر تم مل سکتے ہو تو...''

یہ کیسا خط کہاں سے آ گیا ہے؟

اندھیری کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے جولاہے نے دیکھا کہ اتنے برسوں بعد جب کہ اس کی سفید ریش کے بال تانے پیٹے میں الجھتے جاتے ہیں...کھیس کے مکمل ہونے کے دن آ گئے ہیں...دھاگوں میں کوئی اٹک کوئی رکاوٹ نہ تھی صرف یہ کہ پچھلے پچیس برسوں نے ان کو قدرے بوسیدہ کر دیا تھا اور ان میں وقت کو مزید سہنے کی سکت نہ تھی...

صرف عشق..ہمہ وقت زندگی بھر کی موجودگی کا متبادل نہیں ہو سکتا..

بے شک انسان روندا گیا ہو..اس کے مُو مُو سے عشق بولتا ہو' فریاد کرتا ہو..حال کے رسے سے بندھا جھولتا رہے..جولاہا ہو جائے تب بھی..ایسا عشق بھی..ہمہ وقت زندگی بھر کی موجودگی' ہمسائیگی' چھونے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی آزادی کا متبادل نہیں ہو سکتا..

وہ رفاقت چاہتا ہے..ایک مسلسل نزدیکی چاہتا ہے..دیکھنا چاہتا ہے کہ جو اس کے لہو میں ایک پرندے کی طرح تیرتا ہے' اس کا چہرہ رات کو منہ کھولے سوتے ہوئے بے شک خراٹے لیتے ہوئے..ان دھلا..کبھی ستھرا' کبھی لیپا پوتا ہوا..غصے میں..بیگانگی اور عارضی نفرت میں..بیماری میں..اکتاہٹ اور بیزاری میں..اس کے سوا کسی اور سوچ میں..کیسا لگتا ہے..ایک ہجوم میں..کسی محفل کے دوران..شاپنگ کرتے ہوئے..بچوں کے نیپیز خریدتے ہوئے..اپنے سائز کے زیر جامہ تلاش کرتے ہوئے..اپنے عزیزوں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر..کسی دوست کے ساتھ اس کی موجودگی فراموش کرتے ہنستے ہوئے..ایک ڈاکخانے میں ٹکٹ خریدتے ہوئے..پھل والے سے جھگڑا کرتے ہوئے..اور جب خواہش کا پرندہ اس کے اندر تیرتا ہے تو اس کا چہرہ کیسا لگتا ہے..

کیا مسلسل ہمسائیگی..کسی بھی ڈر سے عاری..بے خوف..دن رات کی موجودگی اس عشق میں ہلکا سا خلل ڈال سکتی ہے..اس کی شدت کو کم کر سکتی ہے..کیا پتہ..اس خدشے کے باوجود صرف عشق..زندگی بھر کی موجودگی کا متبادل نہیں ہو سکتا..

ایسا عشق ایک ڈھکوسلا ہوتا ہے..

صرف مجبوری اور بے بسی ہوتی ہے جو بہانے تلاش کرتی ہے..ایسے افلاطونی عشق کا دفاع کرتی ہے..اس کی شان میں گیت گاتی ہے کہ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں

ہوتا..خطوں کے انبار.. کارڈز.. ہزاروں تصویریں..فون.. اور اس لاحاصل عشق کو زبان دیتی موسیقی..شاعری..چھوٹے چھوٹے تحفے..زرد پھول.. بال پوائنٹ..کتابیں..لپ سٹک کے نشان سب کے سب ایک لمحہ بھر کی نشاط اور اگلے لمحے میں وہ سب کے سب مردہ ہو جاتے ہیں...یہ سب صرف ایک لمس کا بھی متبادل نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ پوری زندگی کے ہوں..

یہ مردہ چیزیں اور ہوا میں تیرتے احساسات اتنے عارضی ہوتے ہیں کہ اگر ان کی آبیاری مسلسل نہ کی جائے تو یہ مزید مردہ ہو جاتے ہیں..کسی کام کے نہیں رہتے..

نتالیہ کے پاس محض چند خطوط تھے جو اس کے عشق کے جواب میں سوائے معذرت کے اور کچھ نہ بیان کرتے تھے..زندگی بھر کی ہمسائیگی کی خواہش تو احساسات کی برابری کی شدت سے جنم لیتی ہے..

اس کی شادی کو چوبیس برس بیت چکے تھے..

ان میں سے دو آستانۂ رومی کی قربت میں اس کے سسرال میں گزرے جب کہ اس کا خاوند تقریباً ہر چھ آٹھ ہفتوں کے بعد اپنی پوری تنخواہ پھونک کر صرف دو تین دنوں کی چھٹی پر وطن آ جاتا تھا..

اگلے دو برس اُردن میں بسر ہوئے..اور یہیں پر اس کا پہلا بچہ پیدا ہوا..زینب ہو بہو اس کی شکل تھی..

ناصر بخاری نے اس کے بہت لاڈ کیے' بہت پیار کیا۔ پہلی شب کی بدمزگی کے باوجود.. وہ شاید اسے فراموش کر چکا تھا اور قدرے شرمندہ بھی تھا..ایک آرائشی چاندی کی صلیب نے اسے سیخ پا کر دیا تھا..

وہ اسے پیٹرا کے کھنڈر ہو چکے شہر میں بھی لے گیا..

زینب اس کی گود میں تھی..

چٹانوں میں کھودے اور تراشے ہوئے ایک رومی ستونوں والی عمارت کی اوپر اس بلندی تک سیڑھیاں جاتی تھیں' جہاں سے پیٹرا کے چار چفیرے جو چٹانی منظر اور لق و دق صحرا تھے' وہ نظر کے سامنے بچھ جاتے تھے..دوسرے سیاحوں کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی اس پتھریلے زینے پر سانس درست کرتے پسینہ پونچھتے چڑھنے لگے کہ سورج ڈھل رہا تھا اور چند لمحوں میں غروب کے ساتھ پیٹرا کی سرخ چٹانوں اور آس پاس کے صحرا نے قدیم سونے کی رنگت میں ڈھل

جانا تھا..یکدم زینب بلکنے لگی..گرمی اور باپ کے پسینے کی بُو نے شاید اس کے کومل بدن کو ایسے دھچکے دیئے کہ وہ پریشان ہو کر بری طرح رونے لگی.. بار بار تھپکنے اور دلاسے دینے کے باوجود وہ اپنا بے دانت منہ کھول کر آنکھیں میچ کر اپنے رونے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالتی تھی..

''میں اسے نیچے لے جاتا ہوں..اسے ساتھ لے آنا مناسب نہ تھا..''

''میں بھی چلتی ہوں..''

''نہیں..نیچے شاید کچھ خنکی ہو گی تو یہ چپ ہو جائے گی..کار میں اس کا فیڈر چھوڑ آئے تھے..تم غروب کا منظر دیکھ کر اتر آنا۔''

''میں بھی چلتی ہوں..''

''نہیں...'' ناصر بخاری جب اسے..اور وہ بہت کم ایسا کرتا تھا..جب اسے ''نہیں'' کہتا تھا..بے شک کسی خوراک کے معاملے میں..کسی گھریلو تنازعے کے حوالے سے یا..اس کے لباس کو ناپسند کرتے ہوئے..تو یہ ''نہیں'' ایک حرفِ آخر ہوتا تھا..ایک حکم ہوتا تھا..

خاوند..اور آستانۂ رومی کی روایات سے جڑا ہوا..ایک خاندانی رشتے میں منسلک خاوند بے شک شادی کے ابتدائی دنوں میں بے حد فرماں بردار اور اپنی خوش بختی پر نازاں خاوند..دو چار برس گزرنے پر..پہلے بچے کی پیدائش کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے اور ایک حاکم بن جاتا ہے..

اس حاکم نے اگر ''نہیں'' کہا ہے تو اس کا مطلب ''نہیں'' ہے..

چنانچہ وہ رک گئی..

ناصر..

زینب کو سنبھالتا سیڑھیوں سے نہایت احتیاط سے اسے سنبھالتا نیچے اتر گیا اور وہ درجن بھر سیاحوں کے ساتھ..تنہا رہ گئی..

وہ..درجن بھر سیاح ڈوبتے سورج پر..پیٹرا کی چٹانوں اور آس پاس کے صحرا پر نہ صرف نظریں جمائے بلکہ کیمرے فوکس کیے ہوئے سورج کے غروب ہونے کے منتظر تھے..

اسے غروب ہونا تھا..سو ہو گیا..

نتالیہ کے چہار سو جو چٹانیں تھیں..صحرا کی وسعتیں تھیں' وہ پل بھر میں اِنکا زیورات کے سونے کی مانند قدیم سنہری ہو گئیں..

غروب کے منظر نے سیاحوں کو ششدر کر دیا..

وہ اپنے کیمروں کے بٹن بھی نہ دبا سکے..

اور تب..اسے..اُس کا خیال آیا..

اس کا..جو ایک پرندہ تھا..اس کے لہو میں تیرتا تھا..

اس کے پاس کوئی ایسا رجسٹر نہ تھا جس کے لکیر دار کھردرے اوراق پھاڑ کر وہ اسے ایک اور خط لکھتی..

اس شفق کی سرخی میں نہاتے ہوئے چٹانی اور صحرائی منظر کو بیان کرتی..اور اسے اُس میں شامل کرتی..

کوئی محمد علی ڈاکیا اگر ایک بدخشانی گھوڑے پر سوار ہونے کی بجائے ایک اونٹ پر بیٹھا..وہاں آ نکلتا تو وہ ضرور ایک خط..اس کے سپرد کر دیتی..کہ بے شک رودین اس لمحے وادیٔ شگر سے پرے..خوبانیوں کے سورجوں سے حاملہ ایک شجر سے کہیں آگے..ایک تیز و تند پہاڑی نالے کے برف پانیوں کے پار..ایک پتھر پر بیٹھے..تمہیں..محمد علی ڈاکیے کو تکتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے چرمی بیگ میں جو خط اس کے لیے ہے وہ میرا ہے..جو اس شفق کی سرخی میں نہائے ہوئے چٹانی اور صحرائی منظر کی کیفیت کو بیان کرتا ہے..پیٹرا کے سرخ شہر میں ابھی ابھی میرا خاوند زینب کو چپ کرانے کی خاطر پتھریلی سیڑھیوں پر اترتا نیچے گیا ہے اور میں یہاں اس بلندی پر ہوں..

اور تمہیں..اپنے رودین کو یاد کرتی ہوں..

دو برس کے اردنی قیام کے بعد وہ لینڈ آف اپرچیونٹی..امریکہ منتقل ہو گئے..

پچھلے بیس برس یہیں گزرے تھے..

ایک ہی شہر میں نہیں..بہتر ملازمت، بہتر سہولتوں اور بہتر موسموں کی تلاش میں وہ کبھی برابر کی ریاست میں منتقل ہو جاتے اور کبھی امریکہ کے دوسرے کونے میں..یونہی بھٹکتے رہے اور یہ دربدری اور مسلسل بھٹکتے رہنا امریکی حیات کا ایک لازمی جز ہے..شاید اسی عارضی خانہ بدوشی پر ان کی ثروت کی بنیاد ہے کہ وہ بستی اہم نہیں، بہتر مواقع اور سہولتیں اہم ہیں..وہ ہماری طرح ایک مقام پر مستقل قیام کر کے اس کے عادی نہیں ہو جاتے..جڑیں نہیں پکڑتے..سست نہیں ہو جاتے..

البتہ پچھلے پانچ برس سے انہیں..یا ناصر بخاری کو قرار آ گیا تھا..اس کی ہمت بھی کم ہو رہی تھی اور بچے بھی بڑے ہو گئے تھے..بچے تو شاید انہیں چھوڑنا چاہتے تھے لیکن وہ ان سے جدا نہیں ہو سکتے تھے..

اس کی بڑی بیٹی زینب..جو ایک زمانہ پہلے پیٹرا کے کھنڈروں میں روئی تھی، اس سے بھی قد میں نکلتی ہوئی تھی..اس کی بناوٹ میں ایرانی صراحیوں کے پیچ و خم تھے، البتہ ان کی نزاکت نہ تھی..رنگت میں دودھ اور شہد کی گھلاوٹ تھی اور وہ قطعی طور پر ماں باپ بلکہ ماں کا پیش کردہ ایک مسلسل استدلال کہ وہ ایک نجیب الطرفین سیدزادی ہے سمجھ نہیں پاتی تھی..ماما اگر میں دوسروں سے مختلف ہوں تو یہ تو بہت بیزار کرنے والی بات ہے..میں دوسروں کی طرح ہی ہونا چاہتی ہوں اور ہوں..تم مجھے یہ نسل کی برتری کی مزاحیہ کہانیاں نہ سنایا کرو..

زینب پر انہیں کوئی اختیار نہ تھا..

اگر وہ ذرّہ بھر اختیار برتتے تو وہ گھر چھوڑ دیتی..

کسی حد تک اس کی خودمختاری میں ناصر بخاری کا بھی ہاتھ تھا..اگر نہ بھی ہوتا تو شاید وہ یونہی خودمختار ہوتی لیکن یوں کھلے عام چرچا نہ کرتی..

بخاری اردن میں تو اپنے خاندان، مذہب اور ثقافت کی پیروی کرتا رہا..نہایت پرہیزگار اور مشرقی اقدار کا پابند رہا لیکن امریکہ شفٹ ہونے کے بعد اس میں ایک عجیب و غریب تبدیلی آئی..پہلے دو برس گزارنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں..اگر ہے تو وہ اس پر چلنا نہیں چاہتا..اس معاشرے میں اگر مستقل قیام ہے تو پھر اسی رنگ میں رنگا جانا کامیابی اور آسائش کے لیے پہلی شرط ہے..یہاں آستانۂ رومی کی اخلاقیات اور تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہ تھی..چنانچہ وہ بہت آگے چلا گیا..یہاں تک کہ اس کے گھر میں منعقد کردہ پارٹیوں میں پاکستانیوں کی تعداد کم سے کم ہوتی کہ وہ ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتا تھا..وہ ان کے مذہب اور لباس کے بارے میں قدامت پسندی کو نظرِ حقارت سے دیکھتا اور امریکی دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی..اپنے وطن، مذہب، ثقافت، لباس اور کھانوں سے جڑے رہنے کی کوشش کا مذاق اڑاتا..

نتالیہ بہت کم اس کے معاملات میں دخل دیتی..کیونکہ اب بھی..امریکیوں سے زیادہ امریکی ہو جانے کے باوجود جب وہ ''نہیں'' کہتا تھا تو یہ حرفِ آخر ہوتا تھا..

زینب..اگرچہ ایک مقدس نام کی حامل تھی..اور وہ اس نام کے پس منظر سے زیادہ آگاہ نہیں تھی اپنی بناوٹ اور بدنی رنگت کے باعث..اور اس کے بال بھی بنگالنوں کی مانند کالے بھور تھے جو اس کے شہد اور دودھ پر مست بادلوں کی طرح امڈتے انہیں بلاخیز کرتے تھے..آرلینڈو

شہر.. میں جتنے بھی گورے اور کالے نوخیز یا عمر ڈھلتے تھے' اس کی قربت کے لیے وحشی ہوتے جاتے تھے اور وہ انہیں مایوس کرنا کفر سمجھتی تھی..

ہائی سکول کے بعد اس نے مزید پڑھائی سے انکار کر دیا تھا اور اب آئے دن ملازمتیں بدلتی رہتی تھی..

وہ اس کی اولاد ہونے کے باوجود کسی اور سیارے کی مخلوق تھی' جس کی زبان' لباس اور رہن سہن سراسر اجنبی تھے..

زینب نے اپنے ماں باپ کا دل نہ دکھانے کی خاطر البتہ یہ قربانی ضرور دی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو اپنے گھر میں مدعو تو کرتی تھی لیکن ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ وہاں رات گزارنے کی اجازت نہ دیتی تھی..

زینب کے بعد دارا آیا تھا.. اور امریکہ آنے کے بعد آیا تھا..

دارا شکوہ اپنی بگ سسٹر کی مقبولیت پر تیخ پا ہو کر اس کے آشناؤں کو قتل کرنے کے درپے نہیں ہوتا تھا بلکہ الکوہل اور منشیات کے مرکب کی دھند میں گُم دارا نہایت فخر سے ڈینگیں مارتا تھا کہ مائی سسٹر زیب... وہاٹ اے گرل.. ہول ٹاؤن از کریزی اباؤٹ ہر..

دارا.. جو اب ڈیرن تھا' اپنی ماں کے فرسودہ اور الجھے ہوئے دماغ میں ابھی تک قیام پذیر قصے کہانیوں سے عاجز آ چکا تھا' اسے ایک کریزی اولڈ وومین سمجھنے پر مجبور تھا..

یہ کریزی اولڈ وومین جس نے ابھی تک اپنے بال نہیں کٹوائے تھے اور وہ اب بھی اس کی کمر تک جاتے تھے اور ان میں سفیدی بھی کم کم تھی' اسے عجیب کہانیاں سناتی تھی.. ڈیرن اس لیے سنتا تھا کہ امریکی معاشرہ خاندانی وحدت پر زور دیتا تھا..

''تم بھولو نہیں کہ ہم لوگ پاکستان سے یہاں آئے ہیں دارا.. اور ہم بیشتر پاکستانیوں کی طرح ایرے غیرے نہیں ہیں.. ٹیکسی چلانے والوں.. گیس سٹیشن پر یا ٹائلٹ صاف کرنے والوں میں سے نہیں ہیں.. ہماری کاسٹ بہت سپریئر ہے.. ہم آل اولاد ہیں حضور پاکؐ کی.. وہ ہمارے نانا ہیں..''

''رئیلی..'' دارا شاید تأسف میں.. شاید مزاح میں.. شاید حیرت سے منہ کھول کر اپنی ماما کا دل نہ دکھانے کی خاطر صرف اتنا کہتا..

''تمہارے ایک پرنانا تھے جنہیں ہم لوگ ''بابا'' کہتے تھے اور میں ان کی گود میں بیٹھ کر

ان کی سفید داڑھی میں سے پرندے تلاش کیا کرتی تھی..''

''رئیلی..'' دارا دھیان دینے لگتا کہ وہ جنگلی حیات کی بقاء کی ایک تنظیم سے بھی منسلک تھا'' کس قسم کے پرندے ماما.. کیا ان کی نسل کو کوئی خطرہ ہے؟''

''نہیں بیٹے.. وہ سچ مچ کے پرندے تو نہیں تھے جن کو میں تمہارے پرنانا کی داڑھی کے سفید بالوں میں تلاش کرتی تھی..''

ماما کو تو کسی ''ہوم'' میں داخل کروا دینا چاہیے.. دارا سوچتا..

''ایک داڑھی میں پرندے کیسے ہو سکتے ہیں ڈیئر ماما..''

''نہیں ہو سکتے.. پر ہوئے.. ایک بار..'' نتالیہ لوٹ جاتی.. ان دنوں میں جب وہ رودین کو ایک رجسٹر کے لکیردار کھردرے کاغذوں پر خط لکھا کرتی تھی اور بابا کی گود میں بیٹھا کرتی تھی'' اتنے پرندے کہ انہوں نے اس حجرے کے گنبد کو بھی بھر دیا جہاں سے بابا پچھلے پچیس برس سے باہر نہیں آئے تھے..''

''کیوں باہر نہیں آئے تھے؟''

''وہ.. وہ ایک سینٹ تھے اور میں ان کی پسندیدہ پُتری تھی۔ لیکن اُن میں وہ پرندہ نہیں تھا جس کو میں دیکھنا چاہتی تھی اور بابا نے کہا کہ پُتری وہ پرندہ تو کبھی نہیں دیکھے گی وہ تیرے نصیب میں نہیں ہے۔''

ماما کو تو پہلی فرصت میں کسی ''ہوم'' میں داخل کروا دینا چاہیے.. یہ تو فریب نظر کا شکار ہیں.. بیمار ہیں..'' ماما آپ اب ریسٹ کریں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں پلیز..''

ماما نہ مانتیں اور اپنی کہاوتیں اور قصے بیان کرتی رہتیں'' تمہارے ماموں جو مجھ سے چھوٹے ہیں اوائل عمری میں ماسکو چلے گئے اور کمیونسٹ ہو گئے.. انہوں نے مجھے روسی ادب سے آشنا کیا..''

''رئیلی..'' دارا پھر حیرت زدہ ہوتا اور اس کے پاس اظہار کے لیے صرف یہی لفظ تھا ''رئیلی..''

''ہاں.. تمہارے چے گویرا کی مانند..''

''وہاؤ..''

''اور تم جانتے ہو کہ راولپنڈی میں ایک کانونٹ تھا جس کے برآمدوں میں چلتے ہوئے.. باغ میں فوّارے کے قریب نصب عیسیٰ کے مصلوب مجسمے کی قربت میں.. میں نے خواہش

کی تھی کہ کاش میں بھی ایک نن بن سکوں..''

''تو کیوں نہ بنیں ماما..'' دارا اب باہر جانا چاہتا تھا' اپنے دوستوں کے پاس' ان کی بدنی خواہش کے پاس..

''ہمارے مذہب میں اس کی گنجائش نہ تھی اس لیے..''

''ماما آپ ریسٹ کریں..''

دارا بیزار ہو کر پھر کہتا اور نتالیہ کا ہاتھ اپنے سینے تک آتا.. چاندی کی صلیب کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا.. اور وہ شادی کی پہلی شب کے اس سانحے کو یاد کرتی جس کے نتیجے میں اسے طلاق ہو سکتی تھی.

اس شب.. جب کہ وہ اپنے رودین کی نادیدہ چاہت کی حماقت میں مبتلا اور گرفتار تھی.. وہ جن جو ایک سیدزادی پر آیا ہوا تھا' اس کی مدد کو نہ پہنچا.. وہ جو اس کے تن بدن کا مختار تھا' اپنا حق وصول کرنے کے لیے نہ آیا تو ناصر بخاری نے اسے بے لباس کیا.. حسب روایت اندھیرے میں.. اور اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل میں حاصل کردہ نئی نویلی دولہن کو روندتے ہوئے اس نے اپنے سینے پر.. ایک اور سینے کو ہموار کرتے ہوئے ایک آہنی ٹھنڈک محسوس کی.. جو اس صلیب کی تھی جسے اس نے کوئی لاکٹ یا زیور سمجھا اور جذبے کی نابینائی اور وحشت میں اسے گلے سے اتار نہ سکا..

تاریکی میں اس نے اس کی بناوٹ کو پرکھا پھر ٹیبل لیمپ آن کر کے اس شے کو دیکھا..

''تم کیسی عورت ہو..'' وہ ہذیان میں مبتلا چیخنے لگا.. ''ایک سیدزادی اور یہ کفر..''

اس نے عقیدے کی پائمالی کی بے اختیار لرزش سے زنجیر کو نوچ کر پرے پھینک دیا اور ناآسودگی میں ہانپنے لگا ''تم کیسی عورت ہو؟''

دارا بوریت اور بیزاری سے اپنی ماما کو دیکھتا رہتا جو اپنی فیملی ہسٹری بیان کرتی کرتی اپنے بھائی تک آئی تھی اور پھر بہت دیر تک خلا میں تکتی کبھی مسکراتی کبھی منہ بناتی چپ بیٹھی تھی اور جانے کہاں پہنچی ہوئی تھی..

''ماما اگر کرسچے نیٹی آپ کو اتنی فیسی نیٹ کرتی تھی تو آپ کرسچن کیوں نہ ہو گئیں... کیوں نہیں...''

''مجھے صرف نن ہو جانا فیسی نیٹ کرتا تھا اور یہ صلیب... توبہ توبہ میں اپنا مذہب بدلنے کا

تو سوچ بھی نہیں سکتی..''

دارا کسی حد تک ایک پرابلم چائلڈ تھا.. یعنی اپنے ماں باپ کی حد تک.. ورنہ اس معاشرے میں وہ ویسا ہی نارمل تھا جیسے اور لوگ نارمل ہوتے تھے.. زینب اپنی پڑھائیوں میں دیگر ہم جماعتوں کی نسبت بہت برتر اور روشن دماغ لڑکی تھی اور اس نے مزید ریسرچ کے لیے مذہبی تقابل کا شعبہ چنا تھا.. یہ اس کے لیے بہترین راستہ تھا کیونکہ وہ نام کی سہی مسلمان تو تھی.. وہ اپنی ماما کے ساتھ طویل انٹرویوز ریکارڈ کر کے مسلم کلچر کے بارے میں ایک مبسوط تھیسس تیار کر سکتی تھی.. معاشرہ اگرچہ بنیادی طور پر لامذہب تھا لیکن اس کے آس پاس تقریباً ہر مذہب کے افراد پائے جاتے تھے جن کے ساتھ روابط زندگی کو نہایت دلچسپ اور بامعنی بنا سکتے تھے..

لیکن دارا پڑھنے کی جانب قطعی طور پر قائل نہ تھا.. اس نے بمشکل ہائی سکول کلیئر کیا اور وہ لڑکیوں کی جانب بھی مائل نہ تھا.. وہ صرف لڑکوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا ان سے قریبی تعلق جوڑنے کا متمنی تھا۔

اس خصلت میں وہ کوئی جھجک نہ رکھتا تھا..

نتالیہ کے لیے وہ ایک معمول کا بچہ تھا.. اگر وہ پاکستان میں پیدا ہوتا تو شاید معمول کا ہی رہتا لیکن وہ بھی تو زینب کی مانند.. کہ ان کے باپ نے ہی اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں سے قطع تعلق کر کے امریکی اقدار سے ناتا جوڑنے کا فیصلہ کیا تھا.. دارا بھی ایک تھارو بریڈ امریکی تھا' اس لیے اپنی جدا خصلت میں کوئی جھجک نہ رکھتا تھا بلکہ ہر موقع پر ہر جگہ اور بے وجہ.. بغیر کسی ضرورت کے اپنے مختلف ہونے کا اعلان بڑے فخر سے کرتا رہتا تھا.. اور اکثر اپنی ماما کو اس بحث میں الجھانا چاہتا تھا کہ اگر وہ معمول کی مروجہ اقدار کے برعکس ایک غیر معمول کی جانب راغب اور مائل ہے تو اس میں اس کا تو کوئی دوش نہ تھا.. یہ ایک قدرتی عمل تھا.. اگر جینز کی آمیزش میں اس کی بظاہر مردانگی کے اندر نسوانیت کے جرثومے تیرتے تھے تو اس اتھل پتھل میں وہ بری الذمہ تھا..

اور نتالیہ اس کی باتیں سن کر زیر لب وظیفے دہراتی تھی.. اپنے رب کی مدد چاہتی تھی.. توبہ استغفار کرتی اسے ڈانٹتی تھی.. ''دارا.. پلیز شٹ اپ..''

''آپ کو حقائق کا سامنا کرنا پڑے گا ماما..'' دارا ذرا لچک کر کندھے سکیڑتا اور واک آؤٹ کر جاتا..

وہ اپنے باپ کے ساتھ اس موضوع پر بحث کرنا وقت کا زیاں سمجھتا تھا کیونکہ وہ بہت

تیزی سے طیش میں آ جاتے تھے.. یوں بھی ان دونوں کی ملاقات ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی کم کم ہوتی تھی..اور دارا اپنے باپ کو اپنی ذہنی سطح سے کمتر بھی جانتا تھا اور یہ جانتا تھا کہ..وہ نہیں سمجھ سکے گا..اگرچہ ماما بھی اس قابل تو نہیں تھیں مگر وہ ہمہ وقت گھر پر موجود ہوتی تھیں اور وہ محسوس کرتا تھا کہ کہیں گہرائی میں وہ اس کے ساتھ.. باپ کی نسبت زیادہ محبت کرتی ہیں..کم از کم وہ اپنے غصے پر اختیار رکھتی تھیں اور اس کے دلائل سن کر صرف یہ کہ ان کا رنگ پیلا پڑ جاتا تھا اور وہ کسی افریقی جادوگر کی مانند جانے کیا ممبو جمبو زیرلب دہرانے لگتی تھیں..

گے بارز..گے ریستوران اور گے جمگھٹے...

دارا گے رائٹس کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے ہر اس مظاہرے میں شامل ہوتا جو ان حقوق کو منوانے کے لیے شہر کے بازاروں میں پلے کارڈ اٹھائے نعرے لگا رہا ہوتا..اکثر مظاہرین عورتوں کے ملبوسات زیب تن کیے ہوتے..اور کچھ کی جینوں کی پشت بلکہ اس کی بھی.. برہنہ ہوتی..

دارا کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ''گے بال آف فیم'' میں اپنی پورٹریٹ آویزاں دیکھنا تھی..

سکینہ ابھی صرف آٹھ برس کی تھی لیکن ایسی باتیں کرتی تھی جو بیک ہوم اٹھارہ برس کی لڑکی بھی نہیں کرتی تھی..وہ اکثر ماما سے..اسے چھیڑنے کی خاطر..اپنی طرف سے محبت اور مزاح کا اظہار کرنے کی خاطر یہ پوچھا کرتی تھی کہ ماما آپ نے اور ڈیڈی نے جب لومیکنگ کی تھی تو اس لمحے آپ کو تو نہیں پتہ تھا کہ میں پیدا ہو جاؤں گی..پیدائش تو محض ایک حادثہ ہوتا ہے..کیوں ماما..؟

بخاری صحیح معنوں میں ایک رولنگ سٹون تھا جو اپنے وجود پر کائی جمع نہیں ہونے دیتا..

شادی کے اوّلین ایام میں وہ ایک ایسا باز بہادر تھا جس نے درجنوں سورماؤں کے مقابلے میں روپ نگر کی روپ متی کو جیت لیا تھا۔ آستانۂ رومی کی سب سے خوش شکل کومل اور کچی شہزادی کو حاصل کر کے روند دیا تھا..اگرچہ وہ اس کی قریبی عزیزہ تھی لیکن قبیلے کے بہت سے نوجوان..اس سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے اور وجیہہ اس کے حصول کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے بیٹھے تھے لیکن جیت اسی کی ہوئی تھی..

چاندی کی صلیب کے سانحے نے اگرچہ اسے بے حد ڈسٹرب کیا تھا لیکن جب وہ پگھلتے ہوئے لاوے کے بعد ٹھنڈا ہوا تھا تو اس نے نتالیہ سے شادی کے نتیجے میں اپنے قبیلے میں

یکدم برتر ہونے کے فائدے کو نظر میں رکھا..اور اگلی سویر جب قاعدے کے مطابق اس کی پچھلی شب کی مردانگی کے مظاہرے کے آگے ہتھیار ڈالے ایک شرمیلے..سرخ آنکھیں جھپکتے..انہیں جھکائے..شرمیلے چہرے کی بجائے ایک زاروقطار روتی..بیہوشی میں اترتی ایک لڑکی سے سامنا ہوا تو اس کے سب رشتے دار یہاں تک کہ اس کی اپنی ماں بھی اسے لعن طعن کرنے لگی کہ تم نے پچھلی شب اس بچی سے کیا زیادتی کی ہے تو وہ اور زیادہ ڈسٹرب ہو گیا..

یقیناً اُس پر جنات کا سایہ تھا..

اگرچہ ایک سید زادی پر جن نہیں آ سکتے لیکن شب عروسی کے بعد اگلی سویر اس کا ہچکیاں بھر بھر کے رونا اور نڈھال ہونا اس بات کی علامت تھے کہ اس پر جنات کا سایہ تھا..

اس پر بہت کچھ پھونکا گیا..بہت کچھ پڑھا گیا..

یہ جانے بغیر کہ اس پر جو جن آیا ہوا ہے اس کی نوعیت کیا ہے..

چند روز تو یونہی جھاڑ پھونک میں گزرے اور جب رشتے داروں کا..سسرال والوں کا ہجوم چھٹ گیا..تو ایک رات باز بہادر نے اپنی بہادری کا اپنے تئیں بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے اکھڑتے سانسوں اور پسینے میں پھسلتے ہوئے اسے خبردار کیا ''اب ڈرامہ بازی بند کرو..جنات پر مجھے یقین نہیں ہے..اور یہ بھی یقین ہے کہ آستانۂ رومی میں تم پر کسی غیر مرد کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا تھا..یہ ڈرامہ بازی صرف اس لیے ہے کہ تمہیں بابا نے کانونٹ بھیج دیا تھا اور سوان نے روسی ادب کی کتابیں بھیج کر تمہارے ذہن کو آلودہ کر دیا تھا..مجھے ایک کمیونسٹ بیوی پسند نہیں..کل صبح تم نے میرے کپڑے استری کرنے ہیں..بوٹ چمکانے ہیں اور میرے لیے ناشتہ تیار کرنا ہے..اور مجھے مکھن کے ساتھ تہہ دار دیسی گھی کے پراٹھے پسند ہیں..''

وہ اگرچہ دبی ہوئی..سسکتی ہوئی تھی لیکن اس کے بوجھ کے باوجود اس نے کمال معصومیت سے کہا تھا..مجھے پراٹھے بنانے نہیں آتے..میں نے آج تک چولہے کی شکل نہیں دیکھی..یہ کام تو نوکرانیاں اور مریدنیاں کرتی ہیں..

''اب تم کرو گی..'' اس نے آخری ہچکی لے کر حکم صادر کر دیا تھا کہ اب وہ ایک مجازی خدا تھا..

آستانۂ رومی سے اٹھا کر وہ اسے اُردن لے گیا تھا..جہاں وہ ایک معمولی موٹر میکینک تھا..ایک فلسطینی کی ورکشاپ میں دن بھر تیل پانی بدلتا تھا..کاریں دھوتا تھا اور انہیں پالش کرتا تھا..

اگر چہ اس نے ''بابا'' کو یہی باور کروایا تھا کہ وہ رائل جارڈن ایئر فورس میں گراؤنڈ انجینئر ہے.. بابا اگر چہ دلوں کا حال جانتے تھے لیکن ان کی پر خلوص عبادت اور روحانیت اُردن پہنچ کر اس باز بہادر کی اصلیت جاننے سے قاصر تھی..

ان کی سفید ریش میں سے بے شک چھوٹے چھوٹے منی ایچر پرندے برآمد ہو سکتے تھے لیکن ان میں کوئی ایسا پرندہ نہ تھا جو اُردن جا کر انہیں اصل صورتحال کے بارے میں آگاہ کر سکتا..

اردن اور پھر سرسبز چراگاہوں کی ہوس میں امریکہ..

زینت کے بعد.. امریکہ میں دارا اور پھر سکینہ جنہوں نے نتالیہ کے بیج میں سے اپنے سر نکالے تھے..

یہ نہیں کہ ان تینوں کے ورود کے بعد ناصر بخاری نے افزائش نسل کی تمنا.. بلکہ تنگ و دو ترک کر دی تھی.. نتالیہ پر اپنی مردانگی کا بوجھ نہیں ڈالا تھا.. ہر ویک اینڈ پر ڈالا تھا.. لیکن.. اس میں نتالیہ کے اندرون میں.. شاید بوجھ کی زیادتی سے.. شاید ایک قدرتی عمل کے نتیجے میں.. کسی خرابی نے جنم لیا تھا اور وہ زینب' دارا اور سکینہ کو تو سنبھال سکی تھی لیکن اب اس کے بیج کو سنبھالنے سے قاصر تھی.. جیسے دارا کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا' ایسے نتالیہ کی کوکھ اگر اس کے بیج کو نہیں سنبھال سکتی تھی تو وہ بھی بے قصور تھی..

بیج چند روز ٹھہرتا..

وہ حاملہ ہو جاتی..

اپنے چوتھے بچے کے خواب دیکھنے لگتی..

اور پھر کسی ایک صبح اس کے بستر کی چادریں خون سے بھر جاتیں..

بیج کچھ روز تو ٹھہرتا پھر ضائع ہو جاتا تھا..

اسے اتنا صدمہ ہوتا کہ وہ کئی روز تک بستر سے لگی رہتی.. وہ اس بچے کے دھیان میں رہتی جس نے اس کی کوکھ میں بسیرا کرنا تھا اور وہ اپنی جان پہچان کروائے بغیر معدوم ہو گیا تھا.. شدید بخار میں پھنکتی رہتی اور اس کے نقش و نگار جن کی تکمیل نہ ہو سکی تھی' انہیں یاد کر کے روتی رہتی.. کبھی وہ نام یاد کرتی جو اس نے اس کے لیے سوچ رکھے تھے اور کبھی اس کی ناک کی بناوٹ اور آنکھوں کی سیاہی کا ماتم کرتی جو اس کے نصیب میں نہیں تھی.. اور جب ایک چیک اپ اس معمے کو حل کرنے کے لیے ہوا کہ تین بچے پیدا کرنے کے بعد اب اس کے رحم میں ایک جرثومہ کیوں قیام

نہیں کرتا.. زائل کیوں ہو جاتا ہے تو ڈاکٹروں نے درجن بھر ٹیسٹ جو لکھ دیئے جن کے نتیجے میں یہ کھلا.. یہ سامنے آیا کہ اسے یوٹرس کا کینسر ہے..

اور وہ ہراساں ہو گئی..

اپنی بیڈ ٹیبل پر رکھے فون کو اٹھا کر رودین کے نمبر کو ڈائل کرنے پر مجبور ہو گئی..

آس پاس.. موت کے بلاوے کے بعد کوئی اور ڈھارس نہ تھی..

زینب مذہبی تقابل کے وسوسوں میں گم تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اس کی ماما کیوں اپنے مذہب اور نسل کو سپریئر گردانتی ہیں..

دارا اپنے تازہ ترین افروامریکی دوست کی لذت میں گم تھا..

سکینہ.. لاعلم تھی کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے.. اسے کارٹون چینل سے ہی فرصت نہ ملتی تھی.. اور بخاری میامی بیچ کی قربت میں ایک ایسا گھر دیکھ آیا تھا جو اس کے خوابوں کا گھر تھا.. وہ دن رات اسی ہذیان میں مبتلا رہتا' حساب کتاب کرتا رہتا کہ میں کیسے اور کون کون سے قرضے حاصل کر کے اس گھر کا مالک بن سکتا ہوں جس کی لوکیشن کمال کی تھی اور ہمسائیگی ساری کی ساری گورے لوگوں کی تھی..

چنانچہ آستانہ رومی کی نتالیہ کینسر وارڈ میں تنہا پڑی تھی..

•

صرف عشق.. ہمہ وقت کی زندگی بھر کی موجودگی کا متبادل نہیں ہو سکتا..

وہ رفاقت چاہتا ہے.. ایک مسلسل نزدیکی چاہتا ہے.. دیکھنا چاہتا ہے کہ جو اس کے لہو میں ایک پرندے کی طرح تیرتا ہے اس کا چہرہ.. رات کو منہ کھولے بے شک خراٹے لیتے ہوئے.. ان دھلا.. کبھی ستھرا.. کبھی غصے میں.. بیگانگی اور عارضی نفرت میں.. کیسا لگتا ہے..

نتالیہ کے اندر یہ آرزو اتنی شدت سے پلتی تھی کہ وہ اب تک ایک ایسے تناور درخت کی صورت اختیار کر چکی تھی جس کی جڑیں پھیلتی ہوئی اس کے بدن کے مساموں سے باہر پھوٹتی تھیں.. شاید نہیں' یقیناً عشق تو برقرار رہتا لیکن آرزو کی یہ شدت جنم نہ لیتی' اگر اس کی شادی شدہ زندگی سراسر پاکستان میں بسر ہوتی.. اسے بے شک ایک جھگڑالو خاوند مل جاتا.. ایک حکم چلانے والا ساتھی نصیب میں آ جاتا.. اس کی اولاد اس کی سہیلیوں کی آل اولاد کی مانند معمول کے مطابق ہوتی.. تو بھی وہ گزارہ کر لیتی..

گزارہ تو وہ ان حالات میں بھی کر رہی تھی لیکن وارڈ میں تنہا پڑے اور موت کے ڈر سے یکدم اُسے دیکھنے کی آرزو کی شدت نے جنم لیا تھا. تنہائی اور بیگانگی نے زخم ہرے کر دیئے تھے..

''نہیں' تمہاری آواز کٹ کٹ کر آ رہی ہے..''

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں بہت فاصلوں پر ہوں' بہت دوری ہے جہاں سے میں بول رہی ہوں..لیکن...میں یہیں ہوں..''

''تم یاد ہو..لیکن کہاں ہو..؟''

''میں نہیں جانتی' صرف یہ کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں' کیا تم مجھے مل سکتے ہو؟''

''اگر تم کہیں آس پاس ہو تو..''

''میں تمہارے آس پاس آ جاؤں گی.. جہاں میں ہوں وہاں محض انتظار ہے..''

میں اسے کسی بھی لمحے ترک کر کے آ سکتی ہوں..اگر تم مل سکتے ہو تو..''

یہ کیسا خط کہاں سے آ گیا ہے؟

محمد علی ڈاکیے کے توسط کے بغیر آ گیا ہے..

نہیں..اس ڈاکیے اور اس کے پوسٹ ماسٹر..جس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا یہ خط..یہ پیغام اسی کے توسط سے آیا تھا اگر ہم غور کرنے والوں میں سے ہوں..

جولاہے کے کھیس کو مکمل کرنے کے دن اس کی منشا سے قریب آ رہے تھے..

نتالیہ کی رودین کے لیے فون کے چونگے میں پہلی ''ہیلو'' کا اذن اس نے دیا تھا..

وہ کسی بھی لمحے اپنا آس پاس ترک کر کے اس کے آس پاس میں پہنچ سکتی تھی..انتظار ترک کر سکتی تھی..اس نے تہیہ کر رکھا تھا لیکن اُس اولین ''ہیلو'' کے تیسرے روز ہی اسے سٹریچر پر لٹا کر آپریشن تھیٹر کی جانب لے جایا گیا..آپریشن سے پیشتر درجنوں کاغذات پر اس کے دستخط لیے گئے کہ وہ یہ آپریشن اپنی رضا و رغبت سے کروا رہی ہے اور کسی قسم کی کوئی بھی خرابی یا موت ہو جانے کی صورت میں ہسپتال ذمہ دار نہیں ہوگا..وہ یا اس کی موت کی صورت میں لواحقین ہرجانے کا دعویٰ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے..اگرچہ آپریشن معمولی نوعیت کا تھا' اسے غیر معمولی نتالیہ کے ہراس اور ڈر نے بنا دیا تھا..

آپریشن سے پیشتر ہسپتال کے عملے نے اس کو یہ گنجائش دی تھی کہ وہ اگر چاہے تو اپنے عزیز و اقارب کو اطلاع کر دے..

نتالیہ نے یہ نہ چاہا..

وہ زینب..دارا..سکینہ اور ناصر بخاری کی زندگیوں میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس سے ہمدردی رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ..ماما کا آپریشن آج ہی ہونا تھا..اس کے پاس ایک بُوکے لے کر پہنچنا تو چاہیے..وہ انہیں مجبور نہیں کرنا چاہتی تھی..

یہ ایک معمول کا آپریشن تھا سو ہو گیا..

اس نے بیہوشی سے باہر آتے ہوئے جب آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے اسے کھڑکی کے آگے تنے پردے پر گل لالہ لرزتے ہوئے نظر آئے..اس نے اپنے بدن کو ٹٹولا..وہ سلامت تھی اور زندہ تھی..

اور اسے حیرت ہوئی کہ وہ زندہ ہے..

بعد میں بچوں نے سخت شکایت کی..اس سے روٹھ گئے کہ ماما آپ نے بتایا کیوں نہیں' آپ کو ہم پر اعتماد نہیں..

اور بخاری نے شدید ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا..اگرچہ میں مصروف تو تھا لیکن اتنا وقت تو نکال سکتا تھا کہ آپریشن تھیٹر میں لے جاتے ہوئے میں تمہارے ساتھ ہوتا..سٹریچر کو تھامے ہوئے تمہارے ساتھ ساتھ چلتا..میں تمہارا خاوند ہوں' میرا حق ہے تم پر..تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کیونکہ تم مجھے ناپسند کرتی ہو ورنہ شادی کے اگلے روز بے ہوشی اور رونے دھونے کے ڈرامے نہ کرتیں..

اس نے ان شکایتوں اور الزامات کے جواب میں کچھ نہ کہا..مسکراتی رہی..

''انہوں نے یکدم آپریٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا..ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ..''

وہ ایک گہرے آسودگی بھرے اطمینان میں تھی..

اس نے کھڑکی کے آگے تنے پردے پر نقش گل لالہ سے مستقبل کی فال نکال لی تھی..

آسودگی بھرے اطمینان کا باعث پاکستان تک کا وہ ون وے ٹکٹ تھا جو اس کی چاندی کی صلیب..جسے آپریشن سے پہلے اتار لیا گیا تھا' اس کی ہمسائیگی میں ہی ایک لفافے میں بند اس کے بدن پر دستکیں دیتا تھا..رودین..رودین!

''تم اب تک پچیس برس گزر جانے کے باوجود بھی..میرا غم کرتی ہو۔''

وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا..

جتنے بھی خط لکھے جا چکے تھے..سینکڑوں صفحات پر مشتمل جو تحریریں تھیں اُن میں سے اُس کی شکل کا جو بھی خاکہ بنایا جا سکتا تھا وہ اس سے بالکل مختلف اور جدا تھی..

آصف جاہ کے مقبرے کے اُس گنبد پر جس کی نیلی ٹائلیں کب کی اکھڑ کر گر چکی تھیں اور اس کی نیلی ٹائلوں کے نیچے پوشیدہ وہ اینٹیں جو نہیں جانتی تھیں کہ کبھی آیندہ زمانوں میں نیلاہٹ کی یہ سحر طراز چادر ہمارے بدصورت چہرے سے اتر جائے گی..لاہور کی کڑی دوپہر میں نمایاں ہو رہی تھیں اور ایک گدھ اینٹوں کو جوڑنے والے چونے کی سفیدی میں اپنے پنجے جما کر وہاں کچھ دیر ستانا چاہتا تھا اور بار بار پھڑ پھڑا کر اٹھتا تھا اور پھر بیٹھ جاتا تھا..اس گنبد سے پرے فوآروں کے خشک چہروں کے آخر میں جو ایک بلند مسمار ہوتا محراب دار دروازہ تھا' وہ دونوں اس کی بُھربُھری محرابوں میں سے ایک میں آمنے سامنے بیٹھے تھے..

مقبرہ جہانگیر میں تو لوگوں کا ایک اژدھام ہوتا تھا' لیکن اس کے پہلو میں آصف جاہ کی قبر پر جو ننگی اینٹوں کی ویرانی اور بے چارگی تھی..اس جانب کوئی نہیں آتا تھا..محراب دار دروازے کے دوسری جانب آبادی کے جمگھٹے کی بھول بھلیوں میں سے نکل کر ایک ریلوے لائن تھی' جس کے پار آصف جاہ کی ہمشیرہ کا بے چراغ مدفن تھا' جہاں دن کے وقت بھی شب کی سیاہی کا سماں ہوتا تھا..

وہ اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا..

اس کے رُومی سیدی چہرے کو پہلی بار دیکھ رہا تھا..

ایک سراسر اجنبی..ان دیکھے اُس چہرے کو دیکھ رہا تھا جس کے خدوخال ایک عام سے منشیوں والے رجسٹر کے فُل سکیپ لکیر دار کاغذوں پر لکھے گئے ہزاروں حروف سے تشکیل ہوئے تھے..

حرف اور حقیقت میں زمین آسمان کا فرق تھا..

تپتی دوپہر جو ڈھل رہی تھی اس کے رینگتے ہوئے سایوں میں وہ ایک ڈھلتی عمر کی قدرے سلیٹی رنگ میں اترتی سفید رنگت کی عورت کو دیکھ رہا تھا' جس کی سفیدی میں اس کی سلگتے کوئلوں ایسی آنکھیں دھری تھیں..جن پر عمر کی ہلکی راکھ اتر رہی تھی..اور اس کی اب تک پرکشش ڈھلکتی چھاتیوں کے درمیان..جنہوں نے تین بچوں کے پیاسے ہونٹوں کو ان میں سے دودھ کشید کرنے کی لذت سے آشنا کیا تھا..ان ڈھلکتی چھاتیوں کے درمیان چاندی کی وہ صلیب اب بھی کاٹن کی قمیض کے اندر پوشیدہ ہونے کے باوجود اس کے سانسوں کے زیروبم کے ساتھ کبھی ابھرتی تھی اور کبھی ان میں ڈوب جاتی تھی..

وہ قابل فہم طور پر اپنی دنیا.. بال بچے اور خاوند ترک کر دینے کے بعد ایک انجانے مستقبل میں اپنی منشا سے کود جانے کے باوجود ابھی تک نہیں جانتی تھی کہ اس کا فیصلہ ہر شے تیاگ دینے کا' درست ہے یا نہیں..

تو اس کے چہرے اور ہونٹوں میں ایک لرزش تھی..جو انہی زمانوں کی تھی جب اس کے لمبے بنگالی بال سوکھتے نہ تھے اور وہ انہیں جھٹک جھٹک کر سکھاتی تھی اور ایک رودین اَن دیکھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور لرزش تخلیق کر دیتا تھا.. بال اب گھنے نہیں رہے تھے اور رنگنے کے باوجود بے جان لگتے تھے..نتالیہ پژمردہ اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی..وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی تھی..

''کہا تو مجھے یہی گیا تھا کہ میری ناف میں ایک آلہ داخل کر کے اس گروتھ کو الگ کر دیا جائے گا لیکن مجھے بعد میں علم ہوا کہ میرے اندر کی آواز جو تشخیص کرتی تھی' وہی تھی..گروتھ پھیل چکی تھی' چنانچہ میرے علم میں لائے بغیر انہوں نے یوٹرس کو نکال دیا..اور میں ایک عورت کی حیثیت سے یہ شناخت کھو کر بیکار ہو گئی..ٹکٹ تو میں نے بہت پہلے ارینج کر لیا تھا لیکن ہسپتال سے آنے کے بعد میرے گھر اور اس میں میرے بچوں سے متعلق سامان اور تصویروں نے میرے پاؤں پکڑ لیے ..ان سے مکمل طور پر تعلق توڑ دینے کے خیال سے مجھے ہول آنے لگا..میرے اندر اسی ڈر نے پھر

سے جگہ بنالی جو کینسر کی خبر سن کر میری چھاتی پر براجمان ہو گیا تھا..اب مجھے گھر چھوڑنے سے ڈر لگتا تھا..میں نے بہت سی بے خواب اور تذبذب میں بھری راتیں گزاریں..کبھی میں ایک نو بیاہتا لڑکی کی مانند ناصر بخاری سے التجائیں کرتی کہ وہ مجھے صرف چند روز کے لیے آستانۂ رومی بھیج دے.. میں بابا کا مقبرہ دیکھوں گی..اُن کی قبر کے سرہانے کچھ دیر بیٹھوں گی..سوان سے ملوں گی..ماں باپ کی قبروں پر مٹی ڈلواؤں گی اور لوٹ آؤں گی..اس نے کبھی میری التجا دھیان سے نہ سنی اور ہمیشہ کبھی کروٹ بدل کر ٹیبل لیمپ کی جانب منہ کر کے بے دھیانی میں بڑبڑاتا کہ..کیا کرو گی جا کر.. شاید اگلے برس..اکٹھے چلیں گے..اور کبھی کام پر جاتے ہوئے کافی کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے..گھڑی پر نظر رکھتے گھر سے نکلتے ہوئے..وہی حکمِ حاکم..''نہیں''..اور میں تصویروں' بچوں کے ملبوسات اور گھر کے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہونے کے باوجود تمہیں دیکھنا چاہتی تھی..کہ زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی' اس میں سوائے صبح شام کرنے کے..بچوں کے نمودار ہوتے پھر اوجھل ہوتے چہروں اور ناصر بخاری کی بے اعتنائی جو مجھے ایک ذی روح کی بجائے ایک شے سمجھتی تھی..کے سوا اور کچھ نہ تھا..مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تم محض مروت کے مارے مجھ سے بات کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ ہاں تم یاد ہو..یا سچ مچ تمہارے وجود کے اندر اس رجسٹر کے لکیر دار کھردرے کاغذ پر لکھے ہوئے حروف ابھی تک قابلِ شناخت ہیں یا ان کی سیاہی کو کاغذ کا کھردرا پن جذب کر کے انہیں معدوم کر چکا ہے اور میری فون کال نے ان میں سے کچھ حروف کو یاد کے تہہ خانے میں سے نکال کر انہیں معافی دینے کی کوشش کی ہے..محض مروت برتی ہے..چنانچہ یہ بہت بڑا رسک تھا جو میں نے لیا..''

''اور اب...''

سفیدی میں سلگتے کوئلوں کی مانند دھری نتالیہ کی آنکھوں نے اپنے سامنے بیٹھے اُس رودین کو دیکھا..جو ہمیشہ ایک اَن دیکھا تھا..اور وہ بھی اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی..وہ اس سے عمر میں کئی برس بڑا تھا..

عمروں کا یہ تفاوت ان زمانوں میں..جب اس کے بنگالی بال سوکھتے نہ تھے اور وہ ترگنیف کے زیر اثر تھی' پوشکن کی شاعری کی طرح دل آویز اور رومان پرور تھا..لیکن پچیس برس بعد ان کے درمیان برسوں کا فاصلہ بہت بڑھ گیا تھا..وہ اسے نہایت دقت سے ''تم'' کہتی تھی ورنہ وہ ''آپ'' کہلانے کے لائق تھا..وہ قدرے کھویا ہوا ابھی تک اپنے ناک نقشے کو سلامت رکھے..

بوڑھا تھا..وہ دیکھ سکتی تھی کہ مقبرہ آصف جاہ کی اس تپتی دوپہر کی چندھیائی ہوئی روشنی میں..اگرچہ اس نے صبح شیو کی ہوگی..پھر بھی اس کے ڈھلکے ہوئے رخساروں پر سفید روئیدگی چمکتی تھی اور اس میں کہیں بھی سیاہی کا کوئی نشان نہ تھا..اس کا پیٹ بڑھ چکا تھا..مسلسل باتیں کرتے ہوئے سانس پھولتا تھا..سر کے بال اتنے چھدرے ہو چکے تھے کہ دوپہر کی دھوپ اُن کے اندر جا کر لشکتی تھی..آنکھوں میں ایک مردنی تھی اور وہ منہ کھولتا تھا تو کچھ خلا دکھائی دیتے تھے..دانت جتنے بھی رہ گئے تھے ان پر زردی اور گھن کی تہیں تھیں..

کیا رودین ایسے ہی ہوتے ہیں..یا ہو جاتے ہیں..صرف ناتجربہ کاری اور تخیل کا دھوکا انہیں ایک من پسند روپ دے دیتا ہے..ان کا وجود صرف ایک خانقاہی ماحول کی گھٹن میں ہی پرورش پاتا ہے اور وہ صرف حرفوں میں ہی سانس لیتے ہیں..دن کی روشنی اور حقیقت انہیں مردہ کر دیتی ہے..

پولو نیک سویٹر کے باوجود اس کے گلے کی جھریاں کروٹیں بدلتیں..وہ بات کرتا تو وہ کروٹیں بدلتیں..نمایاں ہونے لگتیں..

اور اس کے باوجود وہ بُت جو اس نے پچیس برس پیشتر اپنی اُن انگلیوں سے تراشا تھا' جن کے پپوٹوں میں سے مریدنیوں کے بوسوں سے منتقل ہوتی لہسن اور پیاز کی بو آتی تھی..ابھی تک کسی نگاہِ غلط انداز کی بدولت..کسی ایک بے وجہ مسکراہٹ کے باعث اور کسی ایک حرف کی ادائیگی کی دل کشی کی وجہ سے..وہ بُت اب بھی پرستش کے لائق لگتا تھا..

وہ جن جو پچیس برس پیشتر ایک سیدانی پر آیا تھا' اس میں اب بھی کہیں ایک رمق تھی آنے کی..عمر کا تفاوت مٹا دینے کی..اسے اسیر کرنے کی..اگرچہ وہ ایک عمر رسیدہ جن تھا' لیکن ابھی اس کا کچھ سحر اثر کرتا تھا..

''اور اب..'' عمر رسیدہ جن نے پھر سوال کیا..

''تمہیں یوں ننگی روشنی میں پہلی بار اپنے سامنے پا کر..میں کچھ مایوس ہوئی ہوں..مجھے کچھ دھچکے لگے ہیں..میرے ذہن میں تم کچھ اور تھے..اور تم..کچھ اور ہو..''

آصف جاہ کے مقبرے کے گنبد پر پہلے تو ایک گدھ اپنے پنجے ننگی اینٹوں کے درمیان جو سفید مصالحہ تھا اس میں گاڑھ کر بیٹھنا چاہتا تھا اور اب دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اور گدھ آ گئے..اور وہ سب کے سب اس پر اتر کر اطمینان سے بیٹھ گئے اور انہیں دیکھنے لگے جو فوّاروں کی روش کے

اختتام پر ایک نیم شکستہ محرابی دروازے کی محرابوں میں آمنے سامنے بیٹھے..زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے..اور شاید مایوس ہو رہے تھے..

''تم مایوس ہوئی ہو؟''

''ہاں..کسی حد تک..''

مقبرہ جہانگیر میں پکنک منانے والے جو ہجوم تھے' وہ شہنشاہ کے تعویذ کے سامنے پُرفخر مسکراہٹوں سے لبریز تصویریں کھنچوا کر گھروں کو لوٹنے سے پیشتر تجسّس کی خاطر کہ ادھر ایک سوکھے ہوئے تالاب کے سامنے جو محرابی دروازہ کھلتا ہے اس کے دوسری جانب کیا ہے..وہ ادھر آ رہے تھے..اور آصف جاہ کے کمپاؤنڈ کی ویرانی اور تیز دھوپ میں آنکھیں جھپکتے بیزار ہوتے واپس جانے کو ہوتے تو ان کی نظر فوّاروں کی روش کے اختتام پر ایک نیم شکستہ محرابی دروازے کی زیریں محرابوں میں آمنے سامنے بیٹھے ان دونوں پر ٹھہر جاتی..وہ ان کی عمر رسیدگی کو دیکھتے کہ انہیں اس تنہائی میں الگ ہونے کا کیا چاؤ تھا اور لوٹ جاتے..

''تم..ایک عام سے شخص ہو..''

''ہاں..میں ہوں..''

''شاید میں نے سب کچھ تیاگ کر اپنے تئیں مرنے سے پیشتر تمہیں دیکھنے اور ملنے کی حماقت کی ہے...ماضی کی راکھ کریدنے سے صرف حرف ملتے ہیں..ان حرفوں کی آس میں..میں کتنے جتن کر کے یہاں آئی ہوں..اگر نہ آتی تو بہتر نہ تھا..''

''اس کا فیصلہ تو تم کر سکتی ہو..''

''تم نہیں کر سکتے..''

''نہیں..''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میرے اختیار میں..میرے بس میں کچھ بھی نہیں..تم نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو نتالیہ میں ڈھالا..مجھے رودین بنایا..پچیس برس تک ایک قبر کی مانند خاموش رہیں اور پھر تم نے یہ فیصلہ کیا کہ..''

''میں مرنے سے پیشتر تمہیں دیکھنا چاہتی تھی..''

''تم موت کے ڈر سے ہراساں ہو گئیں..''

''ہاں..''

''اگر زندگی معمول کے مطابق گزرتی رہتی..تو یہ ہراس جنم نہ لیتا..''

''ہاں..''

''تو پھر اس میں میرا اختیار کہاں سے آ جاتا ہے..میں تو ایک فراموش کردہ کٹھ پتلی تھا.. اپنی حیات میں ساکن تھا جب تم نے دھاگوں کو جنبش دی اور مجھے متحرک کر لیا..طلب کر لیا''

''تم اپنے آپ کو بے اختیار کہتے ہو؟''

''ہاں..''

''میرے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کرتے؟''

آصف جاہ کے ننگی اینٹوں والے گنبد پر ایک گدھ نے پر کھولے اور لاہور کی تپتی دوپہر کی تمازت سہارتے کھجوروں کے اس جھنڈ کی جانب اترتا گیا جہاں شاہ درّے کے زنانوں میں مغلوں کے قافلے قیام کرتے تھے..

''میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں..''

''اگر ایک انسان کے احساسات تمہارے پاس اتنی کاملیت میں ہوں کہ تم اس کی رگ رگ سے واقف ہو..اس کے دکھ سکھ کو محسوس کر کے دکھی اور سکھی ہو سکتے ہو.. یہاں تک کہ اس انسان کے جو سگے ہیں' عزیز اور قریبی ہیں وہ بھی اس کی خصلتوں اور ذہن کے نہاں خانوں میں جو خیال بلبلوں کی طرح اٹھتے ہیں' ان سے آگاہ نہ ہوں..اور بے شک تم نے اسے کبھی نہ دیکھا ہو' تمہیں مکمل آگاہی ہو تو کیا پھر بھی کچھ محسوس کرنے کے لیے اس کی رفاقت ضروری ہے..اگر تم پہلی بار مجھے دیکھ رہے ہو تو یہ وہ ڈھانچہ ہے جس پر گوشت مڑھا ہوا ہے اور اس پر کچھ نقش نمایاں ہوتے ہیں' اسے دیکھنا نہ دیکھنا کیا اہمیت رکھتا ہے جب کہ تم اس ڈھانچے کے اندر جو روح تیرتی ہے اس سے خوب آشنا ہو..اتنا عرصہ میرے لہو میں ایک پرندے کی طرح تیرنے کے باوجود تم کہتے ہو کہ.. میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں..بے شک میں نے یکطرفہ طور پر..تمہیں چاہا..کہ یہ ایک مذہب کی مانند ایک ایسا رشتہ تھا' جس میں عبادت اور وصل کی خواہش ہمیشہ یک طرفہ ہوتی ہے..اُدھر سے تو کوئی جواب نہیں آتا..خدا نے کبھی جواب دیا ہے؟''

رودین کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ آئی جس نے نتالیہ کے سامنے بیٹھے شخص کے درمیان عمروں کی تفاوت کو صفر کر دیا تھا اور اسے سب کچھ ترک کر کے یہاں آنے اور اسے ملنے پر

کوئی ملال نہ ہوا تھا ''اگر اُدھر سے کبھی کوئی جواب نہیں آیا تو پھر تم جواب کی متمنی کیوں ہو؟''

''میری عبادت اور پرستش کے دوران موت کا ڈر آ گیا تھا..اور میں نے تمہیں پہلے بھی بلا جھجک بالکل کھری ہو کر بتایا تھا کہ اگر یہ ڈر نہ آتا تو میں بھی نہ آتی..''

''ہر مرد کی مردانگی کے تکبر کو بے جا الفت اور چاہت سے تسکین ملتی ہے..وہ بے شک ایک ابدی عشق خاص میں مبتلا ہو لیکن پھر بھی ایک اور محبت کی آنچ اسے گرما دیتی ہے..''

''ہاں..مجھے یاد ہے..تم ہمیشہ موازنہ کرتے تھے..کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ میں ایک لڑکی ہوں..اور ایک اور لڑکی کی فضیلت اور قصے سن کر..مجھے دکھ ہوگا..تم کبھی خیال نہیں کرتے تھے.. یاد ہے میں نے اپنے ایک خط میں عربی شیوخ کے حرم میں جو متعدد بیویاں ہوتی ہیں' ان کا حوالہ دے کر خواہش کی تھی کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پہلے کوئی ہے یا نہیں..آیندہ کوئی اور ہوگی یا نہیں..اگر تم وہاں ہو گے تو میں مطمئن اور شانت ہوں گی.. مجھے تنہا ملکیت کا کوئی چاؤ نہیں..میں شراکت میں بھی زندگی بسر کر سکتی ہوں..''

''اور اب..؟''

''میں اب بھی نہیں بدلی..''

''اب جب کہ شراکت کے لیے اور کوئی نہیں..''

''پچیس برس میں بہت کچھ آگے پیچھے ہو جاتا ہے..بدل جاتا ہے..''

''ایک اور محبت کی آنچ نے مجھے گرما دیا ہے..مجھ میں عمر رسیدگی نے جو یخ بستگی کی برفیں بھر کر میرے وجود کو حنوط کر دیا تھا تو وہ تمہیں سامنے پا کر زندہ ہونے لگا ہے..میں تمہارے لیے بہت کچھ محسوس کرتا ہوں..''

''میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی..''

''تم یہیں رہ جانے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟''

''اگر تم مجھے رہ جانے کے لیے کہو تو..ٹکٹ اگرچہ ون وے ہے لیکن اسے ٹو وے میں بدلنے کے لیے محض چند سو ڈالرز کی حاجت ہے جو میرے پاس ہیں..''

''بچے کیسے ہیں؟''

''کس کے؟''

''تمہارے..''

''میں نہیں جانتی..''

''ان کی ماں ہو کر بھی نہیں جانتیں؟''

''میں نے انہیں جنا ہے..وہ میری کوکھ سے نکلے ہیں..میں نے ان تینوں کو دودھ پلایا ہے' ناصر بخاری کی سرزنش کے باوجود کہ کیوں فگر تباہ کرتی ہو..لیکن جونہی وہ میری گود سے نکل کر چلنے کے قابل ہوئے ہیں تو میرے لیے سراسر اجنبی ہو گئے ہیں..میں ان کے لیے کڑھتی ہوں' ترستی ہوں' لیکن انہیں مجھ سے کوئی سروکار نہیں..میں ابھی تک آستانۂ رومی کی ایک دیہاتن ہوں..کانونٹ اور کمیونزم کے باوجود ایک ماں کے طور پر اجڈ اور گنوار ہوں..شالا تجھے تتی ہوا نہ لگے..کی دعائیں کرتی ہوں..ان کے کبھی کبھار میرے بیڈروم میں جھانک کر ''ہیلو ماما..لو یو ماما'' کہنے والے چہروں پر دَم درود پھونکتی ہوں..جی اٹھتی ہوں انہیں دیکھ کر..لیکن وہ ایسے پرائے ہو گئے ہیں..سراسر اجنبی ہو گئے ہیں کہ مجھے ان سے خوف آنے لگا ہے..یہ کون ہیں..میرے کیا لگتے ہیں..''

''تمہیں قلق نہیں ہوا انہیں چھوڑتے ہوئے؟''

''وہ تو دکھائی ہی کبھی کبھار دیتے ہیں..محض ان کے سامان اور ملبوسات نے مجھے جکڑ دیا تھا..رودین جب ایک عورت بے شک وہ ایک ماں ہی کیوں نہ ہو..بے ضرورت اور فالتو ہو جائے..تو وہ ایک کونے میں پڑی پڑی اکتا جاتی ہے..مجھے معلوم ہے کہ میری کسی بھی اطلاع کے بغیر گمشدگی ان کے لیے صرف چند لمحوں کی تشویش کا باعث بنی ہوگی..جیسے ریموٹ کا بٹن دبانے سے ایک پسندیدہ چینل کا رابطہ کچھ دیر کے لیے معطل ہو جائے..ٹیلی ویژن سکرین پر سیاہ تر مرے ذرّے برسنے لگیں تو کوفت ہوتی ہے..بس اتنی دیر کے لیے ہی انہیں کوفت ہوئی ہوگی کہ ماما کدھر چلی گئیں..''

''اور تمہارا خاوند؟..''

''شاید میں نے تمہیں بتایا ہے..یا نہیں بتایا..میں بھول گئی ہوں..نہیں بتایا ہوگا کیونکہ ہم تو پہلی بار ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں..وہ گوروں سے بھی زیادہ گورا ہونا چاہتا تھا..میری اولاد کی بے راہروی...میں تو اسے بے راہروی ہی کہوں گی کیونکہ میں آستانۂ رومی کی ایک گنوار اجڈ دیہاتن ہوں..اس کا بہت بڑا حصہ ہے..وہ عیدین پر بھی چھٹی نہیں کرتا..لیکن ہیلووئن بڑے شوق اور جذبے سے مناتا ہے..کرسمس کے دن آتے ہیں تو پورے نیبرہڈ میں سب سے بڑا..

سجا ہوا..اور قمقموں سے دَمکتا ہوا ہمارا کرسمس ٹری ہوتا ہے....اور ہماری بڑی کھڑکی کے عین آگے بلند ہوتا ہے تاکہ ہمسائے فٹ پاتھ پر سے گزرتے..ڈرائیو کرتے ہوئے اسے دیکھ سکیں اور رشک کر سکیں کہ یہ موزلم تو ہم سے بھی بڑھ گئے ہیں..صحیح امریکی ہیں..''

''کیا تم اسے موردِ الزام ٹھہرا سکتی ہو..''

''نہیں..قصور میرا ہے جو میں بدل نہیں سکتی..وہ ہمہ وقت کڑھتا رہتا ہے..اس کے کچھ دوست ایسے ہیں جن کے گھر ہم سے بڑے اور وسیع ہیں..ان کی کاریں سڑک سے یکدم ان کے گیراج میں نہیں آ جاتیں بلکہ ان کے ٹائروں کے لیے ایک طویل ڈرائیو ہوتی ہے اور تب جا کر گھر اور گیراج سامنے آتا ہے..اور سوئمنگ پول ہیں..یہاں تک کہ ان کے گیراج بھی سنٹرل ہیٹڈ ہیں..یعنی پھاٹک سے لے کر گیراج تک وہ ڈھکے ہوتے ہیں..راستے میں برف کے انبار نہیں ہوتے..تو وہ ان آسائشوں اور آسانیوں کے لیے کڑھتا رہتا ہے..''

''وہ سراسر امریکی ہو چکا ہے..اپنے آپ کو ڈھال چکا ہے..''

''ہاں..لیکن اس کے ساتھ ساتھ حال ہی میں اس میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی ہے..کہاں تو وہ آستانۂ رومی کے پس منظر سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا..اپنے مذہب اور روایات کا تقریباً منکر ہو چکا تھا اور ان دنوں وہ مذہب کی جانب مائل ہو گیا ہے..پاکستان سے جانے والے ان نعت خوانوں کی محفلوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتا ہے جو پنجاب کے دوافتادہ دیہات میں میراثی ہونے کے ناتے سے گانے بجانے کا کام کرتے تھے اور اب سبز ٹوپیاں اور تلے دار لبادے پہن کر اپنے پرسوز اور تجربہ کار گلے کے باعث امریکہ اور یورپ میں نیم خواندہ پاکستانیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں..وہ وجد میں آ کر ان پر ڈالروں کے نوٹ بھی برساتے ہیں..تمہارے ہاں سے جو علمائے کرام بڑی باقاعدگی سے ہمارے ہاں آتے ہیں ناصر بخاری ان کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی مغفرت کی التجا کرتا ہے..''

''وہ اتنا بدل گیا ہے..''

''ہاں..بس یہ ہے کہ اپنے سفید فام امریکی دوستوں کے ساتھ ڈرائی مارٹینی شیئر کرنے کے بعد جب وہ گھر لوٹتا ہے تو مجھے شدید سرزنش کرتا ہے کہ تم باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتیں..فوراً نماز کی نیت کرو..اور میں مجبوراً مصلّے پر کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر نماز کی نیت کر لیتی ہوں' اگرچہ اس لمحے کسی بھی نماز کا وقت نہیں ہوتا..اور کہتا ہے کہ بلند آواز میں پڑھو..اور

جب میں پڑھتی ہوں تو وہ مجھے ٹوکتا ہے کہ کمبخت عورت کیوں اپنے آپ کو اور مجھے گنہگار کرتی ہو..تلفظ درست کرو..''

''اس کے خون میں جو پیر مٹھا ہے..شاید یہ اس کا اثر ہے..''

''میں ہمیشہ سے اپنے اس بزرگ سے خوفزادہ رہی ہوں..ان کی داستانیں سنتی رہی ہوں..لیکن پیر مٹھا بننے کے لیے تو ایک خودفراموشی درکار ہے..اپنے آس پاس سے بیگانہ ہو جانا شرط ہے..لیکن ناصر بخاری مکمل طور پر بیگانہ نہیں ہوتا..ایک بڑے گھر اور ایک بڑے سوئمنگ پول کے لیے ترستا رہتا ہے..کڑھتا رہتا ہے..تم کیسے ہو؟''

''میں..'' وہ چونک گیا۔

''ہاں تم..''

''میں..'' وہ بہت دیر سے اس کے دُکھڑے سن رہا تھا..وہ اپنے آپ میں مگن اپنی پوری حیات کی پوتھی کا ایک ایک ورق کھول رہی تھی..اسے سنا رہی تھی اور جب یکدم اس نے پلٹ کر یہ سوال کیا کہ تم کیسے ہو..تو وہ بیدار ہوا..چونک گیا..

''میں..زندگی سے مطمئن ہوں..خوش ہوں..حالانکہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں..''

نتالیہ نے ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا..

آصف جاہ کے گنبد کی ننگی اینٹوں پر بیٹھنے کی کوشش کرنے والے ایک گدھ کے بھار سے کوئی ایک سرخ اینٹ قدیم چونے کی پکڑ سے علیحدہ ہوئی اور لڑھکتی ہوئی نیچے گر گئی..تعویذ کے سامنے جو بلند محراب تھی اس کے تلے چند اینٹیں پہلے بھی پڑی تھیں..وہ ان میں گر کر انہی کی مانند ساکن ہو گئی..

شاید یہ اولڈ ایج ہے..اس نے ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا..لیکن وہ اتنا عمر رسیدہ تو نہیں کہ دماغی طور پر کھسک جائے..چار مرغابیوں اور خوشی کا تعلق اس کی سمجھ میں نہ آیا..یقیناً اس کے ذہن میں اس کا کوئی فلسفیانہ مفہوم ہوگا جو میری گرفت میں نہیں آ سکا..

''یقیناً..'' اس نے صرف اتنا کہا اور سر ہلایا اور سر ہلانے سے صلیب کی زنجیر ذرا کھسکی اور اس نے محسوس کیا کہ جگہ بدل کر جب وہ اس کے ماس کے ایک نئے حصے پر تھمی ہے تو اس میں موسم کی حدت تھی..گرم تھی..

''بچے بیاہے ہوئے ہیں اور اپنے بچوں اور بکھیڑوں میں الجھے ہوئے ہیں..''

''اور بیوی؟''

''وہ یونہی چلتی پھرتی ایک شام چلی گئی تھی..''

''آئی ایم سوری..''

''سات برس ہو گئے ہیں..''

''بچے تمہارا دھیان رکھتے ہیں؟''

''الجھن کی حد تک..مجھے انہیں ڈانٹنا پڑتا ہے کہ میرا اتنا خیال رکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں اپاہج محسوس کرنا شروع کر دوں..میں نے بڑی مشکل سے انہیں قدرے دور کیا ہے..''

''کیوں..لیکن کیوں..یہ تو ایک خوش بختی ہے کہ وہ اتنے فرمانبردار اور تمہارے لیے فکرمند ہیں، تم سے سروکار رکھتے ہیں..''

''نہیں یہ بھی اتنا ہی بڑا المیہ ہے جو تم نے ابھی بیان کیا تھا..تم اپنے بچوں کی بے توجہی کے باعث...جو دراصل بے توجہی نہیں ہے بلکہ اس معاشرے کی اقدار کے مطابق معمول ہے..تم بے ضرورت اور بیکار محسوس کرتی ہو جب کہ بے وجہ توجہ اور فکرمندی بھی ایک انسان کے لیے اذیت کا باعث بن جاتی ہے..وہ اپنا فرض ادا کرتے ہیں تہہ دل سے میرے لیے فکرمند ہوتے میری خدمت کرنا چاہتے ہیں اور مجھے ایک انسان کی بجائے مسلسل نظریں رکھی جانے والی ایک شے بنا دیتے ہیں..ہر دوسرے روز بال بچوں سمیت آ دھمکنا..میرے لیے ہر وہ شے لے کر آنا جو پہلے سے درجنوں کے حساب سے میرے پاس موجود ہے اور بار بار اصرار کرنا کہ ابو آپ باقاعدہ چیک اپ کرواتے رہئے..میں آ جاؤں گا..میں پہنچ جاؤں گی..یہ سب فکرمندیاں اور محبت کے اظہار مجھ پر بوجھ ڈالتے ہیں..''

''تم چاہتے ہو کہ تم مکمل طور پر..میری طرح نظرانداز کیے جاؤ؟''

''میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ ہمیشہ نظروں میں رہوں اور اپنی شناخت کھو بیٹھوں۔''

''رودین تم واقعی کھسکے ہوئے ہو..کیسے ناشکرے ہو..'' وہ دل کھول کر ہنسنے کو تھی لیکن اس نے ضبط کر لیا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے اور مسکرا دی..

وہ بھی دل ہی دل میں مسکرایا کہ میں ناشکرا نہیں ہوں..اور تم ابھی ابھی جو میری ناشکری پر مسکراتی ہو تو میں ایسا نوخیز ہو گیا ہوں جو کھڑکی میں سے جھانکتی..بس سٹاپ پر کھڑی ایک لڑکی کی

ایک نظر سے گھائل ہو جاتا ہے.. بے شک وہ نظر اس کے لیے نہ ہو..

صرف مسکراہٹیں تھیں جو ان دونوں کو نوخیزی کی کشش کے قریب لاتی تھیں..

اگلے ہی پل میں وہ غصیلا اور ناراض ہو گیا ''میں کیسے کھسکا ہوا ہوں.. صرف اس لیے کہ میں اپنی زندگی بے جا مداخلت اور بے وجہ چاہت کے بغیر گزارنا چاہتا ہوں.. وہ بے شک میری علالت اور کسی اشد ضرورت میں میرا خیال رکھیں لیکن اپنے فرض کی ادائیگی اور ثواب کی خاطر مجھے بے آرام تو نہ کریں..''

وہ اس کے غصیلے پن اور ناراضی سے لطف اندوز ہونے لگی ''اور خوشی کا چار مرغابیوں سے کوئی تعلق کیوں نہیں ہوتا؟''

''بس نہیں ہوتا..'' اس نے جیسے روٹھ کر کہا ''میں جانتا ہوں کہ نہیں ہوتا..''

''او کے..'' اس نے ہتھیار ڈال دیئے..

''مجھے چڑانے کی کوشش نہ کرو..''

''میں نے تو صرف ''او کے'' کہا ہے..''

وہ کچھ دیر روٹھا رہا.. ان گِدھوں کو تکتا رہا جو مقبرے کے گنبد پر پنجے جمانے کی مسلسل تگ و دو میں مصروف تھے۔

''میری جانب دیکھو رودین..''

اس کی سیاہ کوئلہ آنکھیں چہرے کی سفیدی میں جڑی اس کی سیاہ پلکوں سے الگ دکھائی نہ دیتی تھیں.. سیاہی کا ایک ڈھیر تھا..

''تمہارا کوئی بچہ.. گے.. تو نہیں ہے؟''

اس کی بے اعتنائی اور غصہ اس عجیب سوال کی تاب نہ لا کر کافور ہو گیا ''گے؟''

''ہاں.. کیا وہ سب کے سب نارمل ہیں؟''

''ہاں.. اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ بیٹے ہنسی خوشی بیاہے ہوئے اور بچوں والے ہیں..''

''تم واقعی نصیب کے دھنی ہو.. تمہیں پتہ ہی نہیں کہ ایک گے بچے کی ماں.. یا باپ ہونا.. کرب کی آخری سیڑھی ہے.. بے بسی اور اذیت کی آخری تاریکی ہے..''

''تمہارے ساتھ ایسا ہوا ہے؟''

''ہاں..''

''یہ تو ممکنات میں سے نہیں ہے کہ تم اس معاشرے کی تمام تر سہولتوں.. آسائشوں.. بہترین مواقع اور سنٹری ہیڈ ڈرائیوز اور سوئمنگ پولز سے بھی لطف اندوز ہو سکو.. اور اپنے اقدار بھی برقرار رکھ سکو.. روم میں اپنی پسند سے قیام کرنے کو ترجیح دو اور پھر جو کچھ رومن کرتے ہیں وہ نہ کرو..''

''یہ میری پسند نہ تھی.. ناصر بخاری کی تھی.. اس کی بنیاد پرستی کی تھی.. اس نے ایک ٹپیکل امریکی بنیاد پرست ہونا قبول کیا.. حمد و نعت کی محافل میں اگر بتیاں سلگا کر نعت خوانوں پر ڈالر لٹاتے اور علماء کرام کے چرنوں میں بیٹھ کر وہ ایک اور نوعیت کا بنیاد پرست ہو گیا لیکن.. حقیقت میں یہ دونوں روپ ایک ہیں..''

''تم محض ایک تماشائی تھیں..''

''ہاں.. میں ایک تنکا تھی جو ناصر بخاری اور بچوں کے تیز و تند ریلے میں بے بس بہتی تھی.. تمہیں بتاؤں کہ ایک گے بچے کی ماں ہونا.. اس کے جننے کی اذیت سے کئی ہزار گنا بڑھ کر ہوتی ہے.. دارا.. میرا دارا شکوہ.. اپنے خاوند کے ساتھ رہتا ہے..''

''خاوند..'' اس کے لیے ٹھٹکنے اور تحیر زدہ ہونے کا ایک اور مقام تھا..

ہاں.. اور وہ ایک ناکارہ سکھ ہے.. اس کے پلّے سے کھاتا پیتا ہے.. بلکہ صرف پیتا ہے.. اور جب پہلی مرتبہ وہ اسے ساتھ لے کر آیا تو دارا ایک سرخ رنگ کے گوٹے تلّے سے مزّین غرارے میں ملبوس تھا.. اس نے اپنے ہونٹوں پر شوخ لپ سٹک کا لیپ کیا ہوا تھا اور ایک دلہن کی مانند شرماتا لچکتا چلا آتا تھا.. اس نے بنا حجاب کے کسی شرم کے مجھ سے کہا ''ماما.. میٹ مائی ہسبنڈ..'' اور وہ مشٹنڈہ بالوں سے اٹا بھرا سکھ مسکراتے ہوئے اپنی داڑھی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہتا ہے ''بہن جی.. آپ تو میری ساس ہیں ناں..'' اور پھر میرے سامنے میری موجودگی میں میرے دارا کو چومنا شروع کر دیا اور وہ لجا لجا کر کہتا تھا.. میری لپ سٹک خراب نہ کرو پلیز.. بولو رودین.. اس سے بڑھ کر امتحان کیا ہوگا.. بولو..''

وہ کیا بولتا.. اس آفت زدہ ڈھلتی عمر کی عورت کو ہمدردی اور چاہت سے دیکھتا رہا..

بہت دیر کے بعد.. جب کہ دوپہر ڈھل کر شام میں جانے کو تھی.. آصف جاہ کے گنبد پر براجمان ہونے کی کوشش کرتے متعدد گدھ اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ چکے تھے.. اور جب مقبرہ

جہانگیر کے محافظ سیٹیاں بجا بجا کر خبردار کر رہے تھے کہ شہنشاہ اب خلوت چاہتے ہیں.. تخلیئے کی خواہش کرتے ہیں تب نتالیہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر.. صلیب کو محسوس کرتے ہوئے کہا ''تم مجھے کہیں لے جا نہیں سکتے؟''

''کہاں؟''

''جہاں ہم ایک بچہ پیدا کر سکیں..''

غمِ حسین میں سینہ کوبی کرنے والوں کی ایک خاص ماتمی ردھم ہوتی ہے.. درد اور اذیت کی ایک لے ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس قدیم المیے کو اپنے سینے میں پھر سے زندہ کرتے ہیں.. عقیدے کی استقامت اور اس کا دکھ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ابھی یہ سانحہ ہوا ہے اور انہیں ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے..

لیکن ان میں سے چند ایک عشق اور شرک میں فرق نہیں جان سکتے.. اور سیانوں کا کہنا ہے کہ دونوں دراصل ایک ہوتے ہیں.. ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا.. اُس کے سوا ایک اور بُت بنا لینا.. بے شک وہ ایک پرندے کی شکل میں ہو اور اسے اپنے لہو میں تیرتے رہنے کے لیے کھلا چھوڑ دینا شرک نہیں تو اور کیا ہے..

ان چند ایک میں سے نتالیہ یقیناً تھی.. جو ہاتھی عشق کے روندے جانے کے بعد ایک بُت کے سامنے سجدہ ریز ہوتی تھی اور جو سینہ کوبی کرتی تھی تو صرف اس بُت کی خواہش میں.. اور یوں وہ اپنے ذاتی تخیلاتی المیے کو زندہ کرتی تھی..

ایسی سینہ کوبی بہت کٹھن اور دشوار ہوتی ہے کہ اس میں ماتم کرنے والے ہاتھ کی سینے پر ہر ضرب ثواب کی بجائے گناہ کے حساب بنتی چلی جاتی ہے..

ایک آسان راستے.. ثواب کے راستے پر چلنے کی بجائے جان بوجھ کر گناہ کے حصول کے لیے سینہ کوبی کرنے والوں کا حوصلہ' جرأت اور سینہ بھی بہت بڑے ہوتے ہیں۔

اور اس بڑے سینے کے اندر اگر ایک راہبانہ خواہش کی صلیب پوشیدہ ہو.. سینہ کوبی اور بھی دشوار ہو جاتی ہے کہ ہاتھ اور سینے کے درمیان وہ حائل ہو جاتی ہے.. مارکس اور لینن اپنی داڑھیوں سمیت موجود ہوں تو وہ اس عمل کو افیون کا نام دے کر ان کا ٹھٹھا اڑاتے ہیں.. اور اس پر

مستزاد یہ کہ ایک بُت بھی ہو..اس لیے ایسی سینہ کوبی کرنے والوں کا حوصلہ اور جرأت اور سینہ بہت بڑے ہوتے ہیں..

ورق کوبی اور سینہ کوبی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا..

تخت لاہور کے اندر موچی دروازے کے اندر ایک حویلی کے اندر سے سینہ کوب ایک اسپِ سفید کو مثال بنا کر ماتم کرتے نکلتے ہیں تو وہیں انہی علاقوں اور محلوں میں ایک اور ردھم جنم لیتی ہے جو سینہ کوبی کی لَے سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے..

چھوٹی قدیم اینٹوں کی بناوٹ والی تاریک کوٹھڑیوں میں..اینٹیں جو اپنی بوسیدگی اور طویل العمری کے سرخ سفوف جھاڑتی ہیں..سیلن زدہ دکانوں کے اندر..دبیز پوتھیوں میں ورق کے درمیان رکھے سونے یا چاندی کے ذرّے کو ورق کوب سر جھکائے ایک بھاری چوبی ہتھوڑے کے ساتھ کوٹتے ہیں..وہ کسی خاص حساب کتاب کے تحت سونے چاندی کے ان باریک ذرّوں کو ایک پھونک سے اڑ جانے والے ورقوں میں بدلنے کے لیے نہیں کوٹتے..بلکہ ان کے بدنوں میں سینکڑوں برسوں کا ورق کوبی کا جو تجربہ ہوتا ہے وہ ایک خودکار کیفیت میں یہ جان لیتا ہے اس پوتھی کو کھولے بغیر کہ اب اگر چوبی ہتھوڑے کی ایک اور زد پڑی تو ورق منتشر ہو جائے گا..اور تب وہ ہاتھ روک لیتے ہیں۔اسی لیے ورق کوبی کے لیے کسی تعلیم یا دانش کی حاجت نہیں ہوتی' صرف نسل در نسل سیلن زدہ کوٹھڑیوں میں سر جھکائے پوتھیوں کو ایک مخصوص ردھم میں کوٹتے رہنا درکار ہوتا ہے..

ورق کوٹنے کی ایک سمفنی ہے جو صدیوں پیشتر ترتیب دی جا چکی ہے اور ان کے تن بدن میں یہ میوزیکل سکور ریکارڈ ہو چکا ہے..چنانچہ ان کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا..ان کے جثّے کے اندر ہر شریان' ہر رگ میں' وہ سمفنی رواں ہو چکی ہوتی ہے اور اس سمفنی کا اتار چڑھاؤ..اور ترنگ ان کی انگلیوں میں اتر کر انہیں وہ مخصوص ردھم عطا کر دیتی ہے اور وہ سر جھکائے ورق کوٹتے چلے جاتے ہیں...

سینہ کوبی اور ورق کوبی کا وہی رشتہ ہے جو عشق اور شرک کے درمیان ہے...

سٹرینج آر دے ویز آف لو..

تخت لاہور کی انہی گلیوں میں سونے کے گہنے ڈھالنے والے..انہیں تراشنے والے..

اور جب وہ سونے کو تراشتے ہیں تو اس میں سے نامعلوم ذرّے اڑتے ہیں..دکھائی نہیں دیتے..وہ فرش میں..فرش ڈھانپتی دریوں میں جذب ہو جاتے ہیں اور ہر برس کے آخر میں ان کی بولی ہوتی

ہے..نہ دکھائی دینے والے سونے کے ذرّوں کی قیمت لگتی ہے اور یہ قیمت وہ خاندان لگاتے ہیں جو صدیوں سے اسی پیشے سے جڑے ہوتے ہیں..سنیاروں..سونے کے زیوروں کو تراشنے والوں کے قدموں میں جو نامعلوم ذرّے اس دھات کے گرتے ہیں..انہیں سمیٹ کر..وہ بوریاں اور دریاں جمع کر کے جو فرش پر بچھی ہوتی ہیں..وہ جانتے ہیں کہ کیسے انہیں ڈرموں اور تالابوں میں ڈال کر کیسے ان میں سے سونا کشید کیا جا سکتا ہے..صرف وہ جانتے ہیں..

یہ سونے والے ایک زمانے میں اتنے متمول ہوتے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی جنگوں کے اخراجات کے لیے ان سے ادھار لیا کرتا تھا..

نتالیہ ورق کوبوں کی ہمسائی تو تھی ہی لیکن وہ راکھ اور گندی دریوں میں سے سونے کے ذرّے تلاش کرنے والے خاندانوں کی ایک فرد بھی ہو گئی تھی جو ساری عمر اس جستجو میں رہتے ہیں کہ شاید ہمیں بیکار اور بوسیدہ اشیاء میں سے سونے کا ایک ذرّہ رودین کی صورت میں مل جائے..ہمارے نصیب میں آ جائے..

اور کبھی نسل در نسل کی تلاش کے بعد کسی نتالیہ کو ایک ذرّہ رودین کی صورت میں مل ہی جاتا ہے..اور وہ جولاہی ہو جاتی ہے..اس ایک سونے کے ذرّے کو تخیل کی کرنوں سے منور کر کے آفتاب بنا دیتی ہے اور اس کے سنہرے پن سے ایک بت تراش کر اس کی پرستش کرنے لگتی ہے اور اس کے غم میں آنسو بہاتی ہے..

اگر ایک پوتھی کے صفحوں میں پڑے سونے کے ایک ایسے ذرّے کو جس میں رودین ہو جانے کا امکان پوشیدہ ہو' خط لکھا جائے تو لفافے پر پتہ درج کرنے کی چنداں ضرورت نہ ہو گی..محمد علی ڈاکیا صرف سنتا جائے گا اور اپنے بدخشانی گھوڑے کو ایڑھ لگاتا جائے گا تا آنکہ اس کے کانوں میں ورق کوٹنے کی دھم دھم سنائی نہ دینے لگے..گھوڑا قدرے بدکے گا اور ڈاکیا اس نئے پر کان دھرے ورق کوبوں کے محلے میں پہنچ جائے گا..اور خط پہنچا دے گا..

نتالیہ ہو... ہیر ہو یا ماروی..سوہنی یا جولیٹ ہو..بے شک لیلیٰ ہو' ان سب کے خط نہایت حساس کان رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ان کا رودین' رانجھا' عمر' مہینوال' رومیو یا مجنوں ورق کوبوں کے کس محلے میں..کس پوتھی میں اور کون سے صفحوں کے درمیان سونے کے ایک ذرّے کی صورت پڑا ہے..اور وہ ورق کوبی کی مسلسل مترنم لَے کو سنتے اس تک پہنچ جاتے ہیں..

ڈاکیا محمد علی تو محض ایک ذریعہ ہے..وہ خود بھی پہنچ سکتے ہیں..

ورق کوبی کی اس لَے نے عشق اور شرک میں فرق نہ جاننے والوں کے لیے بڑا فتور مچایا..فریدالدین عطار نے اسے کانوں میں اتارا تو وہ کپڑے پھاڑ کر رقص کرتا..اس کی لے پر جھومتا رقص کرتا اپنی دنیا ترک کر کے ویرانوں میں چلا گیا..جہاں اس کے سامنے منطق الطیر کے پرت کھلے اور سی مرغ کی تلاش کی جستجو نے جنم لیا.تخت لاہور کے وارث شاہ حسین بھی دریائے راوی کے کناروں کی جانب چلتے تو ورق کوبوں کے اسی محلے کو اپنی راہ گزر بناتے.. ؎ میں نا ہیں سب توں..کا ورد کرتے ان کے قدم ورق کوٹنے کی ردھم سے ہم آہنگ ہوتے..اور وہ وجدان کی اس بے مثل سمفنی کی لہروں میں بہتے راوی تک پہنچ جاتے..گلے میں بستہ ڈالے ایک بچہ..سکول کو جاتے ہوئے..جس نے کبھی رودین ہو جانا تھا' جب اس محلے میں سے گزرتا تو ورق کوبی کی یہ دھم دھم اس پر یوں اثر انداز ہوتی..ایسے ڈورے ڈالتی کہ وہ ان میں بندھ جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ علموں بس کریں او یار کے مصداق کتابوں کا بستہ اپنے گلے سے اتار پھینکے اور ناچتا ہوا جنگل کو نکل جائے..لیکن اِن نئے زمانوں میں آفت یہی تھی کہ جنگل معدوم ہوتے جاتے تھے..انہیں انسانی آبادیاں نگلتی جاتی تھیں اور ان کے معدوں کی تسلی نہیں ہوتی تھی..ویرانے آباد ہوتے جا رہے تھے' یہاں تک کہ صحراؤں کے اندر پانی پہنچا کر انہیں اگرچہ ہریاول دی جاتی تھی لیکن وہاں ہزاروں برسوں سے مقیم پرندے اور اس کی جھاڑیوں میں پوشیدہ جھینگر اس ہریاول سے ہراساں ہو کر کوچ کر جاتے تھے..

عہد موجود میں کسی گوتم کے لیے ایک جنگل میں نکل جانے کی گنجائش نہ تھی.. چنانچہ وہ بچہ جو کسی اگلے زمانے میں اپنے رودین ہو جانے سے ہرگز آگاہ نہ تھا..اپنا بستہ سنبھالتا اپنے مشن سکول کی جانب بڑھتا جاتا..جہاں صبح کی دعا کے طور پر بائبل مقدس کی آیات تلاوت کی جاتیں اور ایک کالا سیاہ پادری سفید چوغے میں نہایت نامناسب لگتا بچوں کو حضرت عیسیٰ کے معجزوں پر وعظ دیتا کہ کیسے ان کے دربار میں بیماروں اور لاچاروں کے اتنا ہجوم تھا کہ ان تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا تو ایک بیمار کے رشتہ داروں نے اسے کوٹھڑی کی چھت پر لے جا کر..چھت کو ادھیڑ کر اتنا بڑا شگاف بنا کر کہ اس کی چارپائی عین عیسیٰ کے سامنے اتاری جا سکے..اسے اتارا کہ دم عیسیٰ اس مرگ کے قریب شخص میں پھونکا جا سکے اور وہ صحت مند ہو جائے..

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر کوئی عطار یا شاہ حسین ہو جائے..

لاکھوں لوگ ورق کوبوں کی دھم دھم سنتے تھے اور انہیں محض مشقتی مزدور سمجھتے..جلد از

جلد اس محلے سے گزر جانا چاہتے تھے تاکہ ان کے کانوں کو کچھ آرام مل سکے..

البتہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ اگر ورق کوبوں کی ایک ہمسائی..سونے وال خاندانوں سے متعلق کوئی نتالیہ اپنے خوابِ خانقاہی سے جاگے تو اس ردھم کو سن کر عمر بھر سینہ کوبی کرتی رہے.. جولاہی ہو جائے..

ایک ذرّے کے لیے..

اس ذرّے میں ایک تخیلاتی بُت کے امکان کے لیے..

محمد علی ڈاکیے کا بدخشانی گھوڑا اس امکان اور تخیل کی سرحد پر چلتا.. بدکتا..اپنے لامبے کان ورق کوبی کی دھم دھم اور اجنبی لے سے خوفزدہ کر کے کھڑے کرتا اس محلّے سے گزرتا تھا..

جہاں پوتھی میں پوشیدہ سونے کے ایک ذرّے کے نام ایک خط تھا..

''میں واپس نہیں جا رہی..''

سیّد زادی کی اجڑی ہوئی چھاتیوں کے درمیان.. تین بچوں کے بلکتے منہ ان میں سے کومل پن' تناسب اور خواہش کو چوس چکے تھے.. ان کے درمیان صرف صلیب تھی جو آباد اور زندہ تھی اور دھڑکتی تھی.. جس نے بچوں کی طرح بالآخر انہیں چھوڑا نہیں تھا' ابھی تک ان کے درمیان گھر بنائے رہتی تھی.. نتالیہ نے بھی اسے اپنے آپ سے جدا نہیں کیا تھا.. شاید اس میں ایک مصلحت تھی' وہ اپنے آپ کو مارنے کے لیے کوئی عامیانہ حربہ.. جیسے پنکھے سے لٹک جانا یا سلیپنگ پلز پھانک لینا استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی.. چپ چاپ کسی بھی شب مصلوب ہو جانا چاہتی تھی.. عمر کی نوخیزی میں تقریباً ہر فرد.. اور ایسا فرد جو ایک خانقاہ کے ماحول میں بند کمیونزم اور روسی ادب کے واسطے سے باہر کی دنیا میں سانس لیتا ہو.. موت.. بلکہ خودکشی کے رومان پرور فریب میں مبتلا ہوتا ہے.. ماحول اور معاشرے کی بے توجہی کا انتقام لینے آپ کو کبھی نہ کبھی مار ڈالنے کے خواب میں لینا چاہتا ہے.. وہ فنا کی اٹل حقیقت سے بھی آگاہ ہی نہیں ہوتا.. اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ سرسوں کے کھیتوں کی مہک' بارش کے بعد فضا دھل جائے تو ایک سرد سویر میں کنواری کی بانہوں میں چھنکتی چوڑیوں کی مانند سرد ہوا میں ایک گہرا سانس لینا.. کسی نامعلوم پرندے کی آواز سننا جو کسی گھنے شجر میں روپوش ہے.. صنف مخالف کے لبوں کے پہلے لمس اور جو پرندہ لہو میں تیرتا ہے' اسے اپنے اندر تیرتا محسوس کرنا.. یہ سب ہمیشہ کے لیے نہ ختم ہونے والی تاریکی میں فنا ہو جاتے ہیں.. زندگی کی وقعت اور اس کا لالچ عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ شدید ہوتے جاتے ہیں کہ وہ محسوسات اور منظر جو موت کے داؤ پر ہارنے سے کھو جاتے ہیں' صرف وقت کے گزرنے سے ہی ان کی ثروت اور خوش بختی کا اندازہ ہو جاتا ہے.. نوجوانی کے نامعلوم انداز میں کھسکتے لمحوں کے دوران نتالیہ بھی مرگ

کے اسی فریب میں مبتلا تھی.. لیکن شادی کے بعد بھی جیسا کہ ہمیشہ ہی ہو جاتا ہے' اس فریب میں تعطل نہ آیا' یہ اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ جڑا چلا آیا... یہ نہیں کہ ناصر بخاری کی بجائے اگر روپ متی کو کوئی اور باز بہادر مل جاتا تو اس فریب میں رخنہ پڑ جاتا.. بے شک رودین بھی اس کی زندگی کا شریک ہو جاتا تو بھی چنداں فرق نہ پڑتا.. وہ ناآسودگی کے کچھ اور جواز تلاش کر لیتی.. یا شاید ایسا نہ ہوتا.. تو پھر کینسر کی خبر نے اسے اتنا خوفزدہ کیوں کر دیا تھا.. وہ کیوں ڈر کے سیاہ آسیب میں اتنی جکڑی گئی تھی کہ مرنے سے پیشتر اپنے بچوں کے علاوہ صرف اسے ملنا چاہتی تھی.. اس لیے کہ وہ کسی اور کی طے شدہ موت قبول نہیں کر سکتی تھی.. مرنا تھا تو اپنی من مرضی سے مرنا تھا... وہ ڈر شاید اس نے خود بھی تخلیق کیا تھا تا کہ رودین تک پہنچا جا سکے..

سیّد زادی ابھی تک.. اسے صرف تین ہفتے ہوئے تھے آئے ہوئے.. ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیے ہوئے.. اور اسے روزانہ ملتے ہوئے.. اس کے باوجود وہ ایک اجنبی عورت تھی.. ایک ناآشنا سا سراپا تھا.. رجسٹر میں سے پھاڑے ہوئے کھردرے اور لکیردار کاغذ.. جن کے پھاڑنے سے وہ وہاں وہاں سے پھٹ گئے تھے' جہاں رجسٹر کی سلائیوں کے دھاگے تھے.. ان پر تحریر کردہ سینکڑوں خطوط کے باوجود صرف تین ہفتے پیشتر اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا..

وہ سناٹے میں آ گیا جب اس نے کہا کہ.. میں واپس نہیں جا رہی..

اگرچہ وہ کہتی رہتی تھی کہ میں سب کچھ چھوڑ کر آ گئی ہوں.. میں وہاں کسی کو.. بچوں کو.. ناصر بخاری کو درکار نہیں لیکن اس کے باوجود یہ ''میں واپس نہیں جا رہی'' ایک حتمی بیان تھا اور اس میں ایک پوشیدہ دھمکی تھی..

''واقعی؟''

''ہاں..''

''کیوں؟''

''میں نے ناصر بخاری کو طلاق کا نوٹس بھجوا دیا ہے..''

''طلاق؟''

''ہاں اسے امریکہ میں سمپل ڈائیورس کہتے ہیں اور یہ بہت عام ہے.. یہاں تمہارے ہاں.. آستانۂ رومی کے قرب و جوار میں طلاق کا لفظ زہریلے بچھو کی مانند ڈنک مارتا ہے.. لیکن یہ اتنا ہولناک نہیں ہے.. ایسا.. ہمارے ہاں ہوتا رہتا ہے۔''

''تمہارے بچے؟''

''وہ تو کب کے مجھے طلاق دے چکے.. میرے وجود میرے احساسات سے غافل ہو چکے..''

''کیا تم بھی ان سے غافل ہو چکی ہو؟''

''وہ میرے ساتھ ساتھ میرے تن بدن سے بندھے چلے آتے ہیں.. ان کی ناڑ ابھی تک کاٹی نہیں گئی اور وہ میرے وجود کے ساتھ اسی ڈوری میں ابھی تک منسلک ہیں اور میرے بدن سے خوراک حاصل کرتے ہیں.. ان میں سے کوئی ایک بھی اگر تڑ دکرے میرا کھوج لگا کر مجھے ٹیلیفون کردے کہ ماما مجھے تمہاری ضرورت ہے تو میں یہاں تمہارے سامنے بیٹھی ہوئی یکدم اٹھ جاؤں اور یک طرفہ ٹکٹ کو ریٹرن ٹکٹ میں بدلنے کے لیے تم سے بھی بے نیاز ہو جاؤں..''

نتالیہ کا کل بدن.. ماتھے سے ٹخنوں تک.. تلووں تک جو جوگرز میں محبوس تھے.. پسینے میں شرابور تھا.. اسے اتنی شدید گرمی کی عادت نہ تھی.. اس کے شہر میں برف گرتی تھی.. سیاہ بلاؤز کی ڈوریاں محض چھاتیوں کو سنبھالتی تھیں.. انہیں ڈھکتی نہ تھیں.. اور ان کے درمیان صلیب بے پردہ دکھائی دے رہی تھی..

''اگر تم واپس نہیں جا رہیں تو.. یہاں رہ کر کیا کرو گی؟''

''اس کا فیصلہ تم نے کرنا ہے..''

وہ ایک اور سناٹے میں چلا گیا..

''وہ کیسے؟''

''میں تمہارے ساتھ.. رہنا چاہتی ہوں۔''

وہ اس دھچکے سے سنبھلا تو ان دونوں کے آس پاس لاہور کے آخری کناروں پر ایک نوآباد بستی کی ویرانی تھی.. کہیں اکادکا زیر تعمیر گھر تھے.. دھوپ میں اکڑتی سمٹتی سڑکوں کا ایک جال تھا' جن کے کناروں پر سرکنڈوں سے اٹے ہوئے وہ پلاٹ تھے جو ابھی برائے فروخت تھے... بے شجر اور چٹیل ویرانے میں سربلند پانی کی ٹینکیاں تھیں اور سڑکوں کے کنارے ناتواں زرافوں کی مانند منہ اٹھائے بجلی کے کھمبے تھے جو دھوپ کی شدت سے پگھل کر کبڑے ہوئے جاتے تھے اور اس کی پرانی کار تھی اور اس کے باہر کھڑی نتالیہ تھی.. جو اپنی پسینے میں ڈوبی ہوئی قمیض کی نچڑتی ہوئی بے پردگی سے بے خبر تھی.. بے خبر تھی کہ رودین کی نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چھاتیوں اور

ان کے درمیان آرام کرتی صلیب پر بھٹکتی ہیں..

''ساتھ رہنے سے.. تمہاری کیا مراد ہے؟''

''تمہاری.. کون؟''

''تم.. یعنی تمہاری..''

''کیا میرا کوئی نام نہیں جو تم پچھلے تین ہفتوں سے مجھے صرف.. تم.. تمہیں.. اور تمہاری سے مخاطب کر رہے ہو.. تمہیں قطعی احساس نہیں ہوا کہ ایک فرد کو اس طرح مسلسل مخاطب کرنا.. اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے.. تم میرا نام کیوں نہیں لیتے..''

''مجھے قطعی احساس نہیں ہوا تھا..'' وہ اتنا شرمندہ ہوا کہ گرمی کی شدت میں اضافے کی وجہ سے نہیں شرمندگی کے باعث وہ پسینے میں بھیگ گیا ''نتالیہ..'' صرف اتنا کہہ کر وہ پھر شرمندگی میں ڈوب گیا.. اور پھر کچھ دیر کے بعد بولا ''ساتھ رہنے سے تمہاری کیا مراد ہے.. نتالیہ!''

''تمہارے آس پاس.. تمہاری نزدیکی میں..''

''ایک ساتھ.. ایک ہی گھر میں..''

''ہاں..''

''تم نے کیا کہا تھا کہ تم مجھ سے مل کر مایوس ہوئی ہو.. اس کے باوجود؟''

''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہیں..''

''مجبوری ہے؟''

''نہیں..''

''اور اگر میں انکار کر دوں تو..''

''تو میں منت سماجت نہیں کروں گی.. نہیں'' وہ یکدم اتنی پرائی ہو گئی کہ اسے اس سے ڈر آنے لگا.. ''نہیں.. میں واپس نہیں جا رہی.. میرے بابا کے مرقد کے آس پاس متعدد کوٹھڑیاں ہیں جن میں دور دراز سے آئے ہوئے.. ایران اور افغانستان سے آئے ہوئے درویش قیام کرتے ہیں.. میں ان میں سے کسی ایک کوٹھڑی میں رہائش اختیار کر سکتی ہوں.. کسی کو یہ بتائے بغیر کہ بابا میرے کیا لگتے تھے..''

''ایک کاغذی رابطے کے باوجود.. اور وہ بھی پچیس برس پرانا.. ہم ایک دوسرے کے لیے مکمل طور پر انجانے ہیں.. کسی حد تک ناواقف ہیں..''

''گویا تم انکار کر رہے ہو..''

اس کی کوئلہ سیاہ آنکھیں لاہور کی تپش میں مزید سلگتی تھیں..اور جب اس نے اپنی آنکھوں کو کچھ دیر سلگتے رکھا اور پھر کہا کہ..گویا تم انکار کر رہے ہو..تو وہ بھڑک اٹھیں..اس کی درمیانی عمر ایک خوفزدہ کوہ پیما کی مانند گہرائی میں گونجتے ایک پرشور پہاڑی نالے کے آر پار رکھے ایک شہتیر کے درمیان میں معلق تھی..وہ کسی لمحہ بھی نیچے..بڑھاپے کے پانیوں میں گر سکتی تھی..لیکن ابھی تک وہیں قائم تھی اور اس کے باوجود اس کی موجودگی اور بدن کی نمی میں ایک بے بہا کشش تھی اور..اس نے ایک عرصے سے کسی عورت کو یوں بے طرح محسوس نہیں کیا تھا..

وہ ایک فارغ شخص تھا..

ڈھل چکی عمر کا کسی حد تک ناکارہ ہو چکا شخص تھا..

اپنی بیوی سے بھی فارغ ہو چکا تھا..گھر کے نزدیک جو اس آبادی کے حصے کا قبرستان تھا' وہ کبھی کبھار وہاں جاتا تھا اور اس کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر نہ کوئی دعا کرتا تھا اور نہ کوئی خواہش..کچھ دیر خاموش کھڑا رہ کر واپس آ جاتا تھا..گھر واپس آ کر اسے قلق ہوتا تھا کہ اسے کم از کم اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ اس نے اس کے بچوں کو پالا..اسے بھی سہولت دی..محبت دی..لیکن ڈھل چکی عمر کا شخص ان اخلاقیات اور محسوسات سے ماورا ہو چکا ہوتا ہے..کسی حد تک بے حس ہو جاتا ہے..بلکہ خود غرض ہو جاتا ہے..اس کی غرض صرف یہ رہ جاتی ہے کہ اس کی موجودہ زندگی میں کوئی خلل نہ آئے..اسے اس کی چائے کی پیالی وقت مقررہ پر ملتی رہے..سردیوں میں غسل خانے کے شاور میں سے گرم بھاپ آلود پانی اترتا رہے اور گرمیوں میں ایئر کنڈیشنر کی سرد ہوا کے سامنے اپنے پسندیدہ نرم تکیے میں سر دیئے جب وہ اونگھ رہا ہو تو کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے..اور اخبار والا ناغہ نہ کرے..

ڈھل چکی عمر کے ایک شخص کی روٹین یہی ہوتی ہے اگر اس کی آل اولاد اپنے بال بچوں میں اور زندگی کی دوڑ میں مگن ہو چکی ہو..

''نہیں..میں انکار نہیں کر رہا..''

''میں سوانی نہیں ہوں سیّد زادی ہوں' یہ یاد رکھو..لوگ مجھ سے سوال کیا کرتے تھے..میری انگلیوں میں سے ابھی تک لہسن اور پیاز کی بو نہیں گئی..تم مجھ پر احسان نہ کرو..''اس کے چہرے کی تمتماہٹ کی سرخی پر سے بے رنگ پسینے کی دھاریں سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں..

''مجھے غلط نہ سمجھو..میں تو ایک بیکار ہو چکا' ڈوبتا ہوا شخص ہوں جو ایک تنکے کے سہارے کو بھی غنیمت جان سکتا ہوں..جب کہ تم تو..تم ہو..''

وہ آنکھوں کی سلگاہٹ سمیت پرائی اور بیگانی ہوئی بیٹھی رہی اور کچھ نہ بولی..البتہ اس کے جثّے کی نم مہک بولتی رہی..''ہم مکمل طور پر انجانے ہیں یہ تم نے کہا...ناواقف ہیں ایک دوسرے سے..یہ تم نے کہا..''

وہ اپنی عمر کی غنودگی میں چلا گیا۔

اس نے سراسر جھوٹ بولا تھا..محض کچھ کہنے کے لیے..کچھ کہہ دیا تھا..وہ اس کے لیے کیسے انجانی اور ناواقف ہو سکتی تھی..ایک اجنبی ہو سکتی تھی..وہ..ان خطوط کے سہارے اسے اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح جانتا تھا کہ کون سی لکیر کدھر ٹوٹتی ہے' کون سی ٹوٹے بغیر مسلسل چلتی ہے اور کدھر انگوٹھے کے ابھار میں گہری ہو جاتی ہے..یہ لکیریں اس کے کئی برسوں میں لکھے گئے خطوط میں واضح ہوتی چلی گئی تھیں..کہیں کوئی ابہام نہ تھا' کوئی الجھاؤ نہ تھا..جولاہی کے کاغذی کھیس پر ہر گل بوٹا واضح ابھرتا اور اپنا مطلب بیان کرتا تھا' وہاں انجانے پن اور ناواقفیت کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی..اس کے خط ایسے وقتی ابال نہ تھے جو کسی خوشبودار رنگین کاغذ یا فینسی لیٹر پیڈ پر رقم کیے گئے تھے بلکہ کھردرے کاغذوں پر صفحہ در صفحہ اپنی جان پہچان اور واقفیت کرواتے تھے۔

روزانہ..تاریخ وار..کسی حد تک ایک ڈائری کی صورت میں..جو کچھ بھی اس کی حیات میں ظاہر ہوتا تھا وہ رجسٹر کے کھردرے لکیردار کاغذوں پر ایسے منتقل کرتی تھی' جیسے بحیرہ مردار کی غاروں میں سے برآمد ہونے والے چمڑے کے مخطوطوں پر کسی زمانے میں قدیم پیغمبر اپنی داستانیں رقم کرتے تھے..

اس نے اسے..نتالیہ نے رودین کو..ان برسوں میں اپنی روزمرہ حیات کی کون سی تفصیل نہیں لکھی تھی..

اگرچہ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لکھنے والا لکھتا چلا جاتا ہے اور اسے پچیس برس کا فاصلہ طے کر کے کچھ یاد نہیں رہتا کہ تب اس نے کیا لکھا تھا اور اگر وہ بعد میں اپنی تحریر پڑھتا ہے تو کسی قدر پریشان اور بہت حیران ہوتا ہے کہ یہ میں نے لکھا ہے اور کبھی کبھار شرمندہ بھی ہوتا ہے..لیکن جو اس تحریر کو پڑھنے والا ہوتا ہے چونکہ اسے بہت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ سے لطف اندوز ہوتا' کبھی دکھ میں اور کبھی سکھ میں جاتا اسے پڑھتا ہے اس لیے جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ اس پر نقش

ہو جاتا ہے.. جیسے کوہ طور کے ایک پتھر پر فرمان نقش ہو گئے تھے.. یوں.. نتالیہ کے روزمرہ کی تفصیلات جو وہ تو یقیناً بھول چکی ہوگی.. اسے یاد تھیں..

وہ.. صبح سویرے.. منہ اندھیرے.. بیدار ہو کر.. کسل مندی سے اپنی کوئلہ آنکھیں مسلتی.. بنگالی بال سلجھاتی جب کھیتوں میں نکل جاتی تھی اور.. منہ اندھیرے اس لیے بھی نکل جاتی کہ کوئی نامحرم ایک سیدزادی کا محرم چہرہ نہ دیکھ لے تو وہ جھک کر شٹالے کے ہرے بھرے کھیتوں.. بوٹوں اور کونپلوں پر اپنا وہ ہاتھ پھیرتی.. ان کے ہریاول کو مس کرتی.. چھوتی.. وہ ہاتھ پھیرتی جس کی انگلیوں کی پوروں میں لہسن اور پیاز کی بُو تھی.. چلتی جاتی تھی.. اور چارے کے کھیتوں پر جو صبح سویر کی شبنم معلق ہوتی تھی' اسے اپنے ہاتھ سے سمیٹتی یوں چلتی جاتی تھی کہ بہت دور سے نظر آ جاتا تھا کہ سبزے کے ہرے سمندر پر کوئی ہاتھ ایک کشتی کی مانند رواں ہوا ہے اور نظر آتا ہے کہ وہ کہاں کہاں سے گزرا ہے..

جہاں جہاں اس کی ہتھیلی؟ بوٹوں پر پھسلتی' ان کو چھوتی چلتی تھی.. جیسے ایک بزرگ ایک بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے ایسے.. وہاں وہاں وہ بوٹے شبنم سے عاری ہوتے چلے جاتے تھے.. ایک راستہ دکھائی دیتا تھا..

اور جب وہ منہ اندھیرے کھیتوں میں نکل کر واپس آتی تھی.. سلگتے راکھ بھرے اپلوں پر رات بھر دھری دودھ کی چاٹی پر دھیرے دھیرے دبیز ہوتی اور قدرے سرخ ہوتی اپلوں کی مدھم مہک لیے.. گھنی بالائی کی تہہ کو بے آرام کیے بغیر گندم کے خشک بُوٹے کی نالی کو اس میں داخل کر کے نیم گرم دودھ تک رسائی حاصل کر کے کیسے وہ بھورا ہوتا گھنا دودھ سُرکیاں لے کر ایسے پیا جا سکتا ہے کہ اس کی ماں یہ کبھی نہ جان سکے کہ بالائی کی تہہ کو بے آرام کیے بغیر.. یہ دودھ کیسے کم ہو جاتا ہے۔ وہ دودھ پیتی تھی۔

کیسے وہ اپنے کمیونسٹ بھائی کی فراہم کردہ روسی ادب کی ترجمہ شدہ کتابیں سینت سینت کر اپنے سینے سے لگائے رات گئے تک پڑھتی رہتی تھی اور ان میں یوں حل ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے سان گمان میں نہ رہتی تھی.. انہی کا ایک کردار ہو جاتی تھی..

بابا کے دربار میں سنہری بالوں والا نوجوان درویش سر جھکائے عبادت میں مگن تھا' وہ کیسے اس کے سحر میں گرفتار ہوئی تھی..

سحر میں یا عشق میں..

جیسے عشق اور شرک ایک ہیں.. ایسے سحر بھی ایک سازشی ہے جو جوان میں شامل ہو جاتا ہے..

اس نے اپنے خطوں میں وہ کچھ بھی کھول دیا تھا.. جو کھولا نہیں جا سکتا.. وہ سب بھی بیان کر دیا تھا.. جو اپنے آپ سے بھی بیان نہیں کیا جا سکتا..

تو وہ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ ہم ناواقف ہیں.. انجان ہیں..

ایک ناواقف اور انجان عورت اپنی شادی کے اگلے روز ایک ایسا خط کیوں کر لکھ سکتی ہے..

تسلیمات!

تو آخر.... بقول میری ایک پروفیسر مسز قریشی کے ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا.... وہ سب کچھ ہم پر گزر گیا جو سب چاہتے تھے.... اور آپ بھی۔ وہی انجام اپنی دوسری رشتہ دار بہنوں والا۔ مگر وہ تو اتنی خوش ہوتی ہیں اس ''انجام'' پر۔ اور مجھے تو آج جب کہ بائیسواں دن ہے ناصر کی ملکیت بنے یہ ابھی تک سمجھ نہیں آ رہا کہ اس سب چکر میں آخر ایسی خوشی کی بات کون سی ہوتی ہے جو لوگ اتنے خوش ہو لیتے تھے اور اتنی آسانی سے اور خاص طور پر لڑکیاں بھی۔

میں اپنے گھر آئی ہوئی ہوں۔

دل اس قدر اداس ہوتا ہے جب گھر آتی ہوں کہ یہ اب میرا گھر نہیں رہا۔ میرا پیارا کمرہ' اس کی کھڑکی' اس کی الماریاں' میرا پلنگ' میرا بستر' میری کتابیں۔ پچھلے صحن میں میرے پسندیدہ گوشے پودے' درخت' پھول' گھاس' چیکو (کتا) اور روشی (بلی) یہ سب پیاری چیزیں جو ہمیشہ سے میری تھیں' مجھے خوشی دینے کے لیے بنی تھیں اب میری نہیں رہیں۔ میں یہاں مہمانوں کی طرح آتی ہوں مالکوں کی طرح نہیں رہ سکتی۔ خدایا! لڑکی ہونا کتنی خوفناک بات ہے اور شادی ہونا اس سے بھی زیادہ بھیانک۔ کیوں سمجھا جاتا ہے! شاید آپ بھی سمجھتے ہیں کہ لڑکی کی شادی کر دینا سب سے اہم اور خوشی کی بات ہے.... مجھے تو اپنے سے زیادہ خوش نصیب روشی لگتی ہے اپنی بلی جو تمام زندگی اگر چاہے تو اُسی مانوس اور پیارے

گھر میں اپنی پیاری چیزوں کے درمیان رہ سکتی ہے جہاں وہ پلی بڑھی۔ وہ تو اب بھی میرے بستر پر میرے کمرے میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے خواب دیکھ سکتی ہے اس احساس کے ساتھ کہ وہ اپنے گھر میں اپنی جگہ پر ہے۔ جب کہ میرے تمام خواب' تمام پیار یہیں ان چوبیس سال کی مانوس پیاری چھوٹی چھوٹی چیزوں میں رہ گئے ہیں اور مجھے دیس نکالا مل گیا ہے.... اسے کون خوش نصیبی کہہ سکتا ہے.... مگر لوگ کہتے ہیں۔

میرے عزیز.... عزیز.... عزیز ترین انسان یعنی کہ رُودین! تم کو بتاؤں کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے جسمانی طور پر میری موت واقع ہو چکی ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے میرا غرور' میری پاکیزگی اور میری خوبصورتی۔ لگتا ہے کہ جیسے سب کچھ ختم ہو چکا ہے' بک چکا ہے اور میں اب ان میں سے کسی بھی چیز کی مالک نہیں.... اور میں اپنے ذہن سے تنگ آ چکی ہوں۔ میں سوچنا نہیں چاہتی' سوچنے سے ڈرتی ہوں۔ اپنے ذہن سے ڈرتی ہوں.... اور اس خیال سے بڑا شکر بجالاتی ہوں کہ ناصر میرا ذہن نہیں پڑھ سکتا.... اس نے میرے جسم کو مار ڈالا لیکن میرا ذہن آزاد ہے اور زندہ اور اس کے اختیار و تصرف میں نہیں۔ اپنے آپ کو اتنا کمینہ اور بُرا محسوس کرتی ہوں کہ وہ اتنا خوش ہے' اُس بچے کی طرح جسے چاند مل جائے کھیلنے کو۔ ایسا لگتا کہ جیسے وہ اس خوشی میں اپنی ماں کا غم بھی بڑی جلدی بھول رہا ہے۔ وہ اتنا بے پناہ پیار کرنے والا ہے کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں.... مگر میں اپنے آپ کو کیا کروں۔ میں تو اُس کی ہر بات' ہر حرکت پر بس یہی سوچنے لگتی ہوں کہ.... اگر اُس کی جگہ تم ہوتے تو کیا ہوتا! اور ہر خوشی' ہر جذبہ نامکمل لگتا ہے۔ ساری مصیبت یہ ہے کہ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا تھا اس دنیا میں ایک پیکر اور ایک نام کی شکل میں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو ڈھونڈ تو لیا تھا' آپ مل تو گئے تھے مگر مل کر بھی نہ ملے تھے۔ حاصل ہو کر بھی حاصل نہ تھے۔ ہم ایک دوسرے کو کبھی حاصل نہ تھے لیکن اس کے باوجود.... کیسی عجیب بات ہے کہ.... جب پہلی بار.... ناصر نے میرے غرور' میری پاکیزگی' خوبصورتی اور دوشیزگی پر تصرف حاصل کیا.... تو اس کے بعد میرا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں اور مر جاؤں.... میں نے تمہیں پایا کبھی

نہیں تھا لیکن اُس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بس اب میں نے تمہیں کھو دیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیسے تم اب تک اِس تصرف سے پہلے تک مجھے حاصل تھے مگر اب نہیں رہے اور اب کبھی نہ مل سکو گے اور لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے اب اپنے آپ کو بھی کھو دیا ہے' ختم کر دیا ہے اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی ہوں تم سے بھی اور خود سے بھی اور یہ کتنی عجیب اور سمجھ نہ آنے والی سوچ ہے کہ جیسے میرے نزدیک میری تمام خوبصورتی اور دوشیزگی کا دوسرا نام تم تھے۔ جب میں نے اسے کھو دیا تو یہی احساس ہوا کہ اب تمہیں بھی کھو دیا۔ (پتہ نہیں فرائڈ اس کی کیا توجیہہ کرتا) اور شاید اسی دکھ اور غصے اور بے بسی میں اپنے جسمانی طور پر مر جانے اور تمہیں کھو دینے کے دُکھ میں میں نے شادی کی اگلی صبح (یعنی لوگ جسے سہاگ رات کہتے ہیں اس کی صبح) بلکہ بہت صبح سویرے ایک اچھا خاصا ڈرامہ کر دیا.... اور سب کو پریشان کر دیا' سب سے زیادہ ناصر کو۔ اب یاد کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے مگر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ.... صبح کی روشنی ہلکی ہلکی نظر آئی تھی تو میں بس ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی بستر پر اور رونا شروع کر دیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ بے تحاشہ روؤں' خوب چیخ چیخ کر شور مچا کر۔ اتنے بہت سے غم اور دکھ تھے لگ رہا تھا میں مر چکی ہوں' فنا ہو کر ختم ہو چکی ہوں۔ میں نے ہر چیز کھو دی ہے اور میں سچ مچ مر جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔ اپنا گھر' اپنا کمرہ' اپنی ہر چیز اتنی شدت سے یاد آ رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا بس ابھی وہاں واپس چلی جاؤں اور اپنے کمرے میں اپنے بستر پر اُس بستر پر جس پر سالوں سے سوتی آئی تھی جا پڑوں اور روتے روتے مر جاؤں.... مگر ہوا یہ تھا کہ ناصر بے چارہ جو غالباً اُسی وقت بمشکل کچھ سویا تھا کہ ایک دم میرے رونے پر جاگ اُٹھا تھا اور وہ بھی گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا.... اور پھر اس نے اتنی محبت' اتنے خلوص اور بزرگی سے مجھے سینے سے لگا کر چپ کرایا تھا کہ جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں اور مجھے واقعی سکون ملا تھا' کتنی عجیب بات تھی کہ جو میرا قاتل تھا' وہی مسیحا بھی بن گیا تھا.... میں نے اسے بتایا تھا کہ بس میرا دل سخت گھبرا رہا ہے اور مجھے ڈر لگ رہا ہے ہر چیز سے اور دم گھٹ رہا ہے۔ بس میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد میں اس کے سینے سے لپٹے ہوئے ہی سو گئی تھی مگر بعد میں پتہ چلا کہ

میں تو بے ہوش ہوگئی تھی۔ ناصر نے گھبرا کر اپنی بہنوں' بھابی وغیرہ کو جگایا تھا۔ سب اکٹھے ہوگئے تھے۔ ایک بندہ فوراً سوان کو بلانے بھاگا تھا اور جب میں جاگی تھی یا مجھے ہوش آیا تھا تو سوان میرے پاس میرے پلنگ پر بیٹھا تھا اور ناصر اور سب دوسرے لوگ کھڑے تھے اور مجھے پھر پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ سوان کو دیکھ کر مجھے اپنے مرنے' اپنا گھر اور اپنے خواب کھو دینے کا خیال پھر آ گیا تھا اور میں نے پھر بے تحاشہ رونا شروع کر دیا تھا.... اور شوہر اور بھائی میں کیا فرق ہوتا ہے یہ بات مجھے اُس پہلی صبح ہی پتہ چل گئی تھی کہ سوان کے گلے لگ کر جب میں نے رونا شروع کر دیا تو وہ اتنا سخت کمیونسٹ اور لاشوں کو چیرنے پھاڑنے والا سخت دل لڑکا.... میرا پیارا بھائی' وہ بھی رونے لگا (جب کہ ناصر نے صرف مجھے چپ کرایا تھا) میں نے کہا کہ میں بس ابھی گھر چلنا چاہتی ہوں' مجھے اپنے ساتھ لے چلو گھر۔ تو فوراً راضی ہوگیا کہنے لگا ہاں بس ٹھیک ہے چلو اٹھو چلتے ہیں.... مگر پھوپھو نے جو میرے پاس آئی ہوئی تھیں اُسے یاد دلایا کہ یہ ماسکو نہیں پاکستان ہے اور مجھے بھی احساس دلایا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے جو میں نے گھر جانے کی رٹ بچوں کی طرح لگالی ہے۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں سب لوگ رشتہ دار کیا کہیں گے کہ یہ روتی ہوئی صبح ہی سسرال سے گھر آ گئی۔ ولیمے سے بھی پہلے اور بھائی لے آیا۔ ہزار باتیں بنیں گی تو مجھے عقل آئی اور واقعی میں نے غور کیا تو ناصر کی اور میری بہنوں اور سب دوسری رشتہ داروں کی نظریں مجھ پر بڑی متجسس تھیں۔ آپا بھی میرے ساتھ ہی آئی تھیں۔ وہ مجھے چپکے چپکے سمجھانے لگیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کیا اسے دولہا پسند نہیں آیا.... ہوش میں آؤ کیا کر رہی ہو' کچھ عزت کا خیال کرو' کوئی بھی لڑکی ایسا نہیں کرتی جو تم کر رہی ہو نہ ماں باپ کی عزت کا خیال ہے نہ سسرال کی عزت کا۔ تو واقعی مجھے عقل آ گئی۔ ناصر بے چارہ الگ مجرموں کی طرح سر جھکائے پھر رہا تھا۔ پریشان اور شرمایا جیسے یہ سب کچھ محض اس لیے ہو رہا ہے کہ اُس نے مجھے بڑا پریشان کیے رکھا تھا شب بھر.... اور شاید بات بھی یہی تھی۔ لیکن باجی نے مجھے سمجھایا تو میں نے سوچا کہ واقعی مجھے نارمل نظر آنا چاہیے اور میں ایک دم خوش نظر آنے لگی۔ میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا' تیار ہوئی اور ناصر کی آپا میری سہیلیوں کے پیچھے پڑ گئیں' انہیں گالیاں

دینے لگیں کہ میں نے انہیں کہا تھا کہ کل اسے اتنا نہ سجاؤ' سنوارو اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے یہ تو خود ہی چاند ہے مگر کسی نے میری نہ مانی' ان کا خیال تھا کہ میں جو بے ہوش تھی تو ضرور کسی کی نظر لگ گئی تھی کیونکہ جنات تو سیدزادیوں پر آ نہیں سکتے (اب انہیں کیا پتہ کہ رُودین تو آ سکتے ہیں جو جنات سے بھی زیادہ آفت چیز ہوتے ہیں) اور انہوں نے تیار ہو جانے کے بعد فوراً مجھے اور ناصر کو دربار پر بابا کے پاس حاضری کو لے جانے کا پروگرام بنالیا تھا حالانکہ رسم کے مطابق ہمیں ولیمے کے بعد جانا تھا۔ اور جب ہم بابا کے پاس گئے اُن کے قدموں کو میں نے چھوا' انہوں نے اپنی شفیق' پُر سکون گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا' میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں تو ایک بار پھر مجھے کچھ ہونے لگا۔ میری آنکھوں سے خاموش آنسو خود بخود بہنے لگے اور میں نے بابا کا ہاتھ تھام لیا۔ میں رونے لگی ان کے ہاتھ پر آنکھیں رکھ کر اور میرا دل چاہا کہ ان سے کہوں مجھے صرف ایک دعا دیں صرف ایک دعا کہ میں مر جاؤں یہیں اسی وقت یہاں دربار میں آپ کے سامنے' آپ کے قدموں میں۔ (پتہ نہیں میں بابا کے معاملے میں بھی اتنی رومنٹیک کیوں ہوں) مگر میں نے دیکھا کہ میرے آنسوؤں پر پھر دیکھنے والوں کو حیرت اور تجسس ہے' باجی اور پھوپھو کی آنکھوں میں تنبیہ ہے تو میں چپ ہوگئی۔ بابا نے ایک لڈو توڑ کر اپنے ہاتھ سے مجھے اور ناصر کو آدھا آدھا کھلایا اور میں نے.... بڑے سکون سے تصور کیا کہ اس وقت اگر بابا کے یوں دائیں بائیں ناصر کے بجائے میں اور تم بیٹھے ہوتے' بابا یوں آدھا لڈو تمہیں کھلاتے.... تو کیا تب بھی میں اسی طرح روئی ہوتی.... کیا تب بھی میں نے اسی طرح صبح سویرے ڈرامہ کیا ہوتا اور کیا تب بھی.... میں اپنے اندر یوں مردہ' تنہا اور فروخت شدہ محسوس کرتی خود کو.... کیا تب بھی گھر چھوڑنے کا دکھ یونہی ہوتا؟ اوہ! تم ہی بتاؤ کہ کیا واقعی تب بھی یونہی ہوتا؟ مجھے تو لگتا ہے کہ نہیں۔ تب تو تمہیں پالینے کا سکھ' اپنا آپ تمہارے سپرد کر دینے کا سکھ' تمہارے ''ساتھ'' کا سکھ' باقی سب چھوٹے چھوٹے دکھوں پر حاوی آ جاتا.... اور میں یوں صبح روتے ہوئے اُٹھنے کی بجائے چاہتی کہ اُٹھوں ہی نہیں۔ صبح آئے ہی نہیں ہمیں اٹھانے کے لیے جدا کرنے کے لیے۔ اور ایک اپنی بہت بے ہودہ آرزو آپ کو بتاؤں کہ جس رات

میری مہندی تھی اور صبح بارات تھی اُس رات ایک تو ہنگامہ ہی رات بارہ بجے تک رہا پھر بعد میں بھی مجھے نیند نہ آسکی تھی۔ یہ خیال تھا کہ بس یہ میری آخری رات ہے یہاں اس کے بعد.... کل میں وہاں ہوں گی۔ دن مقرر ہونے اور مائیوں کی رسم کے بعد سے گھر چھوڑنے کا دُکھ اپنوں سے جدا ہونے کا دُکھ اس رات مجھ پر پوری طرح حاوی ہوا تھا (ورنہ تو آپ کو بتاؤں کہ میں تو مائیوں بیٹھ کر زرد جوڑا پہن کر مزے سے فنون کا سالنامہ اور قرۃ العین کی ''آگ کا دریا'' اور ''سرخ و سیاہ'' نامی ناولیں پڑھتی رہی تھی۔ اور ان میں اس طرح گم ہوگئی تھی کہ مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ سب تیاریاں کسی اور کی ہیں' کسی اور کی شادی ہے' کسی اور کو زرد جوڑا پہنا کر بٹھایا گیا ہے فرش پر۔ میں تو بس ژولیان اور ماتیلا اور گوتم نیلمبر چمپا اور قراۃ العین کے ساتھ ساتھ مشہد' فرانس' لکھنؤ اور لندن میں ہوں۔ وہ لڑکی کوئی اور ہے جسے رخصت ہو جانا ہے اگلے ہفتے اور کتنی رومنٹیک اور انوکھی بات ہے آپ کو بھی شاید ہنسی آجائے کہ ایسے مائیوں کوئی لڑکی نہ بیٹھی ہوگی کہ سہیلیاں منہ کے آگے ڈھولک رکھے گا رہی ہیں ع

کھول ہریالی گھونگھٹ کھول

اور ''ہریالی'' صاحبہ (ویسے یہ ہریالی پتہ نہیں کیا معنی رکھتا ہے) سفرنامے میں گم ہیں اور تصور کر رہی ہیں کہ تم اور تمہارا سکھ' دوست کس طرح ان کے اجداد کے ملک ایران کے ایک گردوارے میں مسکین صورتیں لیے بیٹھے ہیں اور یہ جنات سے بھی آفت ترشے تم ان کے آبائی شہر مشہد میں کس طرح مزے سے گھوم رہا ہے (بے مروت اور خوش قسمت انسان.... کیونکہ تم اُس وقت مشہد میں یقیناً میرے تصور کے بغیر گھوم رہے ہوگے.... اور شاید اگر آئندہ بھی اتفاق ہو تو ایسا ہی کرو گے۔) اور ایک دن جب میری کچھ سہیلیاں عین میرے کان پر ڈھولک پیٹ پیٹ کر ایک گیت گا رہی تھیں تو صرف تھوڑی دیر کو میں گوتم نیلمبر اور چمپا اور نرملا اور کمال اور ہری شنکر کے نرغے سے نکل آئی تھی چونک کر۔ وہ گا رہی تھیں

بنو تیرے بابا کی اُونچی حویلی۔ بنو میں پوچھتا چلا آیا

''کیا بکواس ہے'' میں نے ایک دم چیخ کر کہا تھا۔ ہنس کر کہا تھا کہ کیا

بکواس ہے وہ تو بچپن سے میرے بابا کی حویلی کی اینٹ اینٹ سے واقف ہے۔ اُسے کسی سے پوچھتے ہوئے آنے کی کیا ضرورت۔ وہ کوئی غیر تھوڑا ہی ہے۔ اور دل میں میں نے سوچا تھا اپنی سہیلیوں کی اب شروع ہونے والی چھیڑ چھاڑ سے مکمل طور پر بے نیاز ہو کر آنکھیں بند کر کے تھک کر لیٹ جانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے سوچا تھا کہ اگر تم آتے تو واقعی تمہیں میرے بابا کی اس واقعی اونچی حویلی کا پتہ پوچھنا پڑتا کیونکہ تم رومیوں کے گھرانے سے اُٹھ کر نہیں بلکہ راوی' ستلج' چناب سب کے پار سے سوہنی کے دیس سے آتے.... مگر تم تو ہو ہی بے مروت۔ میں نے بے اختیار سوچا تھا' یاد کیا تھا کہ تم نے تو ایک بار بھی اس طرف آنے کی خواہش کا ذرا سا بھی اظہار نہ کیا تھا۔ میں لاکھ جتن کے باوجود ہزاروں خواہشوں کے باوجود لاہور نہ آسکتی تھی.... لیکن تم تو ادھر آسکتے تھے مرد تھے اور بقول تمہارے یہ معاشرہ ہے ہی مردوں کا جو چاہے کر سکتے ہیں (اور یہ سچ بھی ہے) شاید تم آتے تو ہم پروگرام کوئی بنا لیتے اور اجنبیوں کی طرح ہماری کسی بک اسٹال پر ملاقات ہو سکتی۔ میں تم سے دو چار باتیں بھی کر لیتی صرف یہ ظاہر کر کے کہ اچانک نظر آ گئے ہو مگر تم نے ایسا کبھی نہ سوچا' کبھی ادھر آنے کی خواہش نہ کی.... اور اب بھی ایسا کبھی نہ کرو گے۔ مجھے معلوم ہے.... پھر اب تو ایسا کرنے کا فائدہ بھی کیا.... میں مر چکی ہوں۔

اور اس رات مہندی والی رات جس کی صبح بارات آنی تھی میں سو ہی نہیں سکی تھی اور علاوہ دوسری کئی باتوں کے پتہ نہیں رات کے کس وقت ایک وحشیانہ اور احمقانہ خیال مجھے بے اختیار یہ آیا تھا کہ کاش صبح سے پہلے کسی طرح کسی جادوئی طریقے پر میں وہاں پہنچ سکتی جہاں تم ہو اور تم سے کہتی وہ جو میں نے پتہ نہیں کہاں پڑھا تھا کہ Dont Spare Me پتہ نہیں اس کا اردو ترجمہ کیا ہوگا۔ میں کہتی کہ اس سے پہلے کہ صبح ہو' اس سے پہلے کہ وہ مجھے لے جائے اور کل کی رات آئے.... تم مجھ سے وہ سب کچھ لے لو.... جسے میں نے صرف تمہاری امانت سمجھا ہے۔ میرا غرور اور میرا حسن اور میری نسوانیت اس سے پہلے کہ یہ اُس کے اختیار میں جائے تم اسے قبول کر لو.... اور پھر صبح سے پہلے میں واپس بھی آجاتی مطمئن اور مسرور۔ مگر ایسا بھلا کب ہوتا ہے ہم بے چارے' بے حقیقت مجبور انسان ہم سوچ تو سکتے ہیں۔

مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آنسو لوگوں کو شک میں مبتلا کر دیتے ہیں حتیٰ کہ میری امی تک کو۔ اس لیے میں مسلسل بہت خوش ہونے کی ایکٹنگ کیے جا رہی ہوں۔ اور کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ اداکاری نہیں حقیقت بھی ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں مکمل خوش تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے' اس کی قربت اچھی لگتی ہے' کبھی کبھی وہ سامنے نہیں ہوتا تو لگتا ہے کہ کچھ کمی ہے کہیں.... اور جب وہ مجھے... چھوتا ہے' پیار کرتا ہے' چومتا ہے تو یہ خیال میرے ذہن میں فوراً لہرانے لگتا ہے' فوراً سوچنے لگتی ہوں کہ کیا تمہارا پیار کرنے کا انداز بھی ایسا ہوتا ہوگا! کیا تم بھی یونہی بوسہ لیتے ہوگے ''کسی'' کے ہونٹوں اور رخساروں کا۔ یونہی تعریف کرتے ہوگے کسی کی گردن کی.... شاید اس سے کہیں زیادہ خوبصورتی اور شاعری سے.... اور میں سوچتی ہوں اکثر سوچتی ہوں کہ کیا یہ بھی ممکن نہ تھا کہ تم نے ایک دفعہ... صرف ایک دفعہ... مجھے صرف چوما ہی ہوتا... کبھی میرے صرف ہاتھ ہی اپنے ہاتھ میں لیے ہوتے لیکن ہم تو وہ لوگ ہیں جو کبھی ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکے۔ (اور یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں کہ شادی انسان کو کتنا بے حیا' بے باک اور بااعتماد بھی اور تجربہ کار بھی بنا دیتی ہے) مگر کبھی ناصر بہت اُکتا دیتا ہے مجھے ہر چیز سے' خود سے اور اس سے بھی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہم مری گئے اور ایوبیہ اور نتھیا گلی اور وہاں سے ایبٹ آباد اور پھر دس دن بعد گھر واپس۔ ایوبیہ اور ایبٹ آباد میں ہم کسی کے گھر ٹھہرے اور مری اور نتھیا گلی میں ہوٹل میں۔ ہم صبح یا شام یا رات کو سیر کو نکلتے یا میں ہوٹل کی گیلری یا کھڑکی سے باہر کا بے پناہ حسن دیکھتی' ہر پل خدا کی قسم میرا جسم ناصر کے ساتھ ہوتا اور ذہن کہہ رہا ہوتا کہ جتنا شدید حسن ہے یہاں ہر چیز کا.... اتنا ہی شدید خیال آتا ہے تمہارا۔ یاد آتا تھا کہ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی شادی کے بعد یہاں آئے تھے اور میں سوچتی ان وادیوں' ان راستوں' ان پہاڑوں پر تم پتہ نہیں کہاں کہاں پھرے ہوگے' کہاں کہاں رُکے ہوگے اور تم نے اُس سے کیا کیا کہا ہوگا جو تمہاری بیوی ہے۔ اور پھر میرا دل آپ ہی آپ ڈوبتی ہوئی اکیلی شام جیسی اُداسی سے بھر جاتا تھا اور میں سوچتی تھی تمہیں کیا خبر ہوگی' کیا خیال ہوگا کہ کوئی تمہیں اب بھی یوں مِس کر رہا ہے۔ تم تو مزے سے اپنے خوبصورت انداز میں

اپنے دوستوں سے کہیں باتیں کرتے ہوگے' اپنے بچوں کے ساتھ ہنستے ہوگے' اپنا خوبصورت سر جھکائے انہماک سے کچھ لکھتے یا پڑھتے ہوگے یا پھر اپنی بیوی کے ساتھ ہوگے اور تمہیں میرا خیال تک نہ آتا ہوگا۔ بالکل ایسا تھا ناں؟ یقیناً تھا کیونکہ ہونا ہی ایسا چاہیے تھا.... اور تم ہو ہی بالکل ایسے۔ میرا خیال ہے کہ رانجھے کی وِنجھلی میں جو اثر تھا وہ تمہارے قلم اور تمہاری تحریر میں ہے۔ وہی جادو' وہی سحر ہے جس میں محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ سے صدیوں سے جانتی تھی۔ سوچتی ہوں شاید تمہیں یہ خیال آیا ہو کبھی کہ بس میں بھی عام لڑکیوں کی طرح اب شادی کی مسرتوں میں گم ہو چکی ہوں گی اور تم کو بھول چکی ہوں گی.... لیکن تمہیں صرف اب ہی نہیں ہمیشہ سالوں بعد بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تمہیں جب بھی کوئی ایسا خیال آئے گا وہ بے معنی اور غلط ہوگا' جھوٹ ہوگا۔ کبھی بھی اور کہیں بھی تمہیں بھلانا ناممکن ہی نہیں خلافِ فطرت ہے۔ میں نے پڑھا تھا کہ محبت چاہت ہر چیز کے حسن کو بڑھا دیتی ہے اور جب تمہارا خط آتا تھا تو مجھے ایک دم سے احساس ہوتا تھا کہ پھول اور آسمان اور کھیت اور درخت ہر چیز کتنی خوبصورتی لیے ہوئے ہے۔ عام دنوں سے زیادہ دلکش ہے ہر چیز.... لیکن اب تو میں نے تمہارا ہر خط پھاڑ ڈالا ہے' مجبور ہو کر' بے بس ہو کر جس دن مجھے مائیوں بٹھایا گیا تھا اُس دن میں نے شدید ظلم کیا تھا خود پر اور حسبِ عادت بہت روئی تھی' بہت بیزار رہی تھی اپنے آپ سے مگر ایسے میں کتابوں اور ''فنون'' نے مجھے بڑا سہارہ دیا تھا اپنے آپ کو بھول جانے میں.... مگر پتہ نہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم نے میرے خطوط نہیں پھاڑے ہوں گے.... تم انہیں نہیں پھاڑ سکتے کیونکہ تم میری طرح مجبور اور بے بس نہیں ہو.... اور پھر میرے خطوں میں سچائی ہے' جذبہ ہے' حسن ہے اور کیا یہ چیزیں ضائع کر دینے کے لیے ہوتی ہیں! کیا تم نے انہیں ضائع کر دیا ہے' شاید کر دیا ہو کیونکہ ایک مرتبہ تم نے مجھے لکھا تھا کہ کاغذ پر پھیلی ہوئی سیاہی اور الفاظ کا فائدہ! تمہارے لیے شاید یہ صرف سیاہی ہی ہوگی لیکن میرے لیے تو اس میں جو جذبہ اور سچائی اور حسن ہے شاید تم اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ کیا تم نے انہیں پھاڑ ڈالا اور ضائع کر دیا ہے؟ دل چاہتا ہے کہ تم نے ایسا نہ کیا ہو شاید ان کے حوالے سے ہی تم مجھے یاد رکھ سکو.... ہمیشہ.... زندگی بھر۔ کچھ لکھ سکو!

اب میں تو تمہارا خط' تمہاری تحریر پتہ نہیں کبھی پڑھ سکوں گی یا نہیں (تمہاری وجھلی کبھی سن سکوں گی یا نہیں) لیکن ایسا لگتا ہے کہ جب بھی وقت ملا تمہیں لکھے بغیر رہوں گی نہیں۔

ناصر اتنا اچھا اور پُرخلوص ہے کہ میں اُسے کوئی تکلیف پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی یا اُس سے بدخلوص ہونے کا۔ لیکن آپ سے باتیں کرنا تو کوئی بدخلوصی یا بے وفائی نہیں ہے ناں؟

آپ نے بھی ''سرخ وسیاہ'' پڑھ رکھی ہوگی۔ میں جب پچھلے دنوں ہاتھ میں بندھے ہوئے بہت سے گانوں یا کنگنوں اور زرد جوڑے کے ساتھ یہ کتاب پڑھتی رہی اور میری سہیلیاں ڈھولک پیٹتی رہیں تو کئی بار مجھے ایسا لگا کہ مجھ میں اور سرخ وسیاہ کی ماتیلا میں تو کوئی فرق ہی نہیں۔ وہ بھی سوچتی تھی' قسمت نے مجھے کون سی خوبی نہیں دی۔ حسب ونسب' مال ودولت' حسن ذہانت' محبت.... مگر ایک خوشی میسر نہیں۔ پھر اُس کا بھی خاندانی حسب ونسب اور برادری تھی جو اُس کے اور ژولیاں کے آڑے آئی تھی اور اُس پر بھی بار بار ندامت کے دورے پڑتے تھے کہ میں کیا کر رہی ہوں اور جب اُس کے باپ کو پتہ چلا تھا تو وہ کیسا پاگل ہو گیا تھا۔ غم وغصے سے کہ میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں کہ میری بیٹی نے کس کو پسند کیا ہے۔ میں تو اُسے ڈجز بنانے کو تھا مگر ماتیلا میرے سے زیادہ لکی تھی کہ اُسے ژولیاں حاصل تو تھا اُس کے سامنے رہتا تھا اور اُس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا۔ کبھی مجھے لگا کہ میں تو آگ کے دریا کی نرمل ہوں یا چمپا جو دیویوں کی طرح تھیں' آوارہ نہیں تھیں مگر مشکل یہ تھی کہ وہ بھیا صاحب اور گوتم نیلمبر میں فرق محسوس کر سکتی تھیں۔ اور وہ تو ملا کسی کو بھی نہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ کوئی مجھے قراۃ العین حیدر کے بارے میں بہت کچھ بتائے' وہ اتنا اچھا لکھتی ہے' جادو کرتی ہے ذاتی زندگی میں کیا ہے' کون ہے۔ وہ بھی سیدزادی ہے اور مجھ سے کہیں زیادہ سر پھری اور یقیناً خوبصورت بھی ہوگی مجھ سے کہیں زیادہ۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ کرشن کی بھی تو کتنی لاتعداد گوپیاں تھیں مگر رادھا تو بس ایک ہی تھی ناں اور وہ کسی بھی گوپی سے جلتی نہ تھی۔ اگرچہ تم کرشن ہو میرے لیے لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے رادھا نہیں سمجھتے.... چلو کیا فرق پڑتا ہے تم تو

کرشن ہی رہو گے ہمیشہ۔

ابھی خیال آیا ہے کہ میں اس زندگی میں کچھ نہیں تو تمہاری وہ سُرخی مائل خوبصورت آنکھیں بھی نہ دیکھ سکوں گی جو فضول امریکن لڑکی تک نے دیکھ لیں۔ اور آپ کو کبھی بھی یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ ایک سیدزادی (اپنی دنیا میں شہزادی) چاہے کہیں بھی رہے کسی کے ساتھ.... اُس کے دل میں آپ رہتے ہیں خدا کی طرح کہ اِس سے زیادہ وسیع اور گہری اور شدید محبت کا تصور' ہر لمحے کی یاد اور محبت اور ساتھ رہنے کا تصور انسانوں کے پاس اور کوئی نہیں۔ خدا حافظ۔

''نتالیہ''

تسلیمات!

میرا خیال ہے کہ ستمبر کے بعد مجھے فرصت ملے گی تو میں ضرور کچھ لکھوں گی۔ آپ کا خیال' آپ کی یاد مجھے ہر لمحے کچھ نہ کچھ لکھنے کو اُکساتا رہتا ہے۔ ذہن حسن اور رومانیت سے بھر جاتا ہے.... اور آپ کو خط تک نہیں لکھ سکتی۔ پچھلے دنوں ایک ہندوستانی ادیب کا افسانہ پڑھا بہت خوبصورت۔ اس میں بھی رُودین جیسا کردار تھا اور شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ۔ میں نے بے اختیار سوچا کہ یہ تمام رُودین ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں۔

موسم یہاں بہت خوبصورت ہو رہا ہے ان دنوں۔ آپ تو کہتے تھے کہ کوئی محبت کرنے والا ساتھی ساتھ ہو تو موسم کا حسن بڑھ جاتا ہے.... مجھے تو پچھلے سال کے مقابلے میں کچھ کم ہی لگ رہا ہے۔ اس سال اس موسم کا حسن۔ ناصر پر آپ کی بات شاید صادق آتی ہے۔ وہ ہر وقت مسکراتا' گنگناتا' خوشی سے بھرا بھرا نظر آتا ہے۔

تم نے اپنی محبت سے جو آرام دہ گوشہ میرے دل میں بنا لیا ہے مجھے اس سے نجات کبھی نہ ملے گی۔ زندگی اتنی پُرسکون ہے.... مگر کمی صرف تمہاری ہمیشہ رہے گی۔ تمہارا خیال کبھی تو ہر کوفت مٹا دیتا ہے اور کبھی دل کو اتنا ''تانگ تانگ'' کر دیتا ہے کہ اس کی مانگ رلا دیتی ہے۔ یوں تو زندگی بھر میرے لیے خوشیوں اور آنسوؤں

کا کھیل بنے رہو گے۔ چاہے میں خط کبھی بھی نہ لکھوں (ایسا تو خیر ممکن ہی نہیں) لیکن تم سے باتیں کرنے کی آرزو کبھی نہیں مر سکتی۔ اس قدر اعتماد آپ کو خود پر ہونا چاہیے اپنے والدین' بیوی بچوں' بہن بھائیوں کے علاوہ ایک اور ہستی کے لیے بھی ناقابل فراموش ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ خوش رہیں۔

پتہ نہیں کب پڑھے ہوئے الفاظ یاد آ گئے ہیں اور اپنے دل کی آواز لگتے ہیں

''میری محبت کو اب بھی تمہاری تلاش ہے۔ کیونکہ یہ جذبہ جو میرے دل میں ہے صرف تمہاری روح کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور میرا حسن تمہاری آنکھوں کے لیے۔ میں تمہاری منتظر ہوں اور روتی ہوں (اگرچہ اب میں تمہاری منتظر نہیں ہوں) اور تم اپنی محفلوں میں گم ہو۔ کوئی راج ہنس بھی میرا پیغام تم تک نہیں لے جاتا۔ تمہیں میری خبر نہیں ہوتی۔''

''نتالیہ''

تسلیمات!

خدا کرے کہ اس تمام عرصے میں آپ بالکل بخیر اور خوش و خرم رہے ہوں.... اور اپنے بارے میں مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے.... ع تو نے مجھ کو کھو دیا میں نے تجھے کھویا نہیں۔

سوچتی ہوں نہ جانے کیسے لوگ ہوتے ہوں گے جو ماضی کی ملاقاتیں تک بھول کر خوش و خرم نئی زندگی میں گم رہتے ہیں۔ میں تو صرف خوابوں کو بھی نہیں بھول سکتی۔ اگر کہیں کوئی ملاقات بھی ہوئی ہوتی تو نہ جانے کیا ہو گیا ہوتا۔

میرا دل تو اب بھی بالکل ویسا ہی ہے۔ اب بھی تمہارا خیال آتے ہی مجھے اپنا فرض' اپنی حیثیت' اپنا مقام' اپنی زندگی کی تبدیلی کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ میں تو بس پھر سرتاپا محبت بن کے رہ جاتی ہوں صرف تمہارے لیے۔ بلکہ نہیں محبت یا چاہت یہ الفاظ میرے دل کا مفہوم صحیح طرح ادا نہیں کر سکتے۔ تمہارے لیے تو ہمیشہ سے وہ کچھ محسوس کیا ہے جو صرف خدا کے لیے کرنا چاہیے۔ ایک ایسا جذبہ جس میں ادب' محبت' اطاعت' اعتماد سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ یہ چاہت سے بھی آگے کوئی چیز ہے۔ اگر صرف چاہت ہوتی تو میں بھی نئی زندگی کے بعد تمہیں بھول جانے میں

کامیاب رہتی۔ میں نے تمہیں کبھی دیکھا تک نہیں' اس کے باوجود یہ جذبہ اُسی طرح قوی اور شدید ہے اور میں جانتی ہوں کہ ہمیشہ اسی طرح رہے گا کیونکہ.... خواب کبھی نہیں مرتے۔ انسان کہیں بھی رہے کسی کے ساتھ بھی رہے خواب دیکھنے کو تو اس کا ذہن ہمیشہ آزاد ہوتا ہے اور میں نے تو خواب ہی واحد دیکھا.... اور اس خواب سے خواب در خواب ذہن بنتا گیا۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ''محبت تو زندگی میں ایک حادثے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ حادثہ صرف ان لوگوں کو پیش آتا ہے جو اعلیٰ ظرف ہوں۔'' تو یہ خیال مجھے آج بھی مسحور و سرشار کر دیتا ہے کہ میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آ چکا ہے۔ میرے پاس بھی گلاب کے چند شگوفے ہیں جو اگرچہ کھل کر پھول نہ بن پائے لیکن اُن کی تازگی' مہک اور جوانی لازوال ہے' روح کے ہر ذرّے کو سرشار کرنے والی۔ مجھے ماتیلا کی طرح خیال آتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ تھا.... مگر دل کی بے لطفی نہ جاتی تھی۔ پھر محبت اپنی تمام تر کرشمہ سازیوں کے ساتھ مجھ پر حکمران ہو گئی اور مجھے پتہ چلا کہ یہی ایک نعمت تھی جو مجھے ابھی تک نہ مل سکی تھی۔

لیکن آپ میری عظیم مسرت ہی نہیں عظیم محرومی اور دُکھ بھی بن جاتے ہیں کبھی کبھی۔ جب سب سے ہر چیز سے سخت اُکتا جاتی ہوں.... اور بالکل تنہا پاتی ہوں خود کو۔ اور پتہ نہیں کیوں ایسی شدید محرومی اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے کہ.... آنسو بے اختیار بہتے جاتے ہیں بے بسی کے اور خیال آتا ہے اوہ خدایا.... میں اُسے کبھی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ دیکھ بھی نہیں سکتی ایک لمحے کو بھی نہیں۔ میں اپنے خاندان کی بڑی نک چڑھی قسم کی اکڑ باز سی لڑکی تھی۔ اپنے اعلیٰ خاندان' اعلیٰ دماغ' اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ حسن سب پر بے طرح نازاں.... مگر سب کچھ کتنا بے معنی اور بے کار ثابت ہوا.... کہ میں صرف ایک دفعہ بھی اُسے دیکھ بھی نہ سکی اور وہی عام گھریلو بیوی بن کر رہ گئی جیسی کہ میری کزنز ہیں۔ اب جو اُن کی خوشیاں ہیں وہی میری۔ مجھے آپ کے الفاظ یاد آتے ہیں.... بالکل ایسے ہی الفاظ ژولیاں بھی ماتیلا سے کہتا تھا کہ ''شادی کے بعد تمہاری رومانیت پسند روح کو رفتہ رفتہ تمہارے نوجوان شوہر کی حقیقی خوبیاں سمجھ آنے لگیں گی۔ تم بھی صبر و شکر کے ساتھ ان چیزوں کا لطف لینے لگو

گی جنہیں دنیا خوشی کے نام سے تعبیر کرتی ہے یعنی عزت' دوست' گھر' بچے' شوہر.... آج سے پندرہ سال بعد تمہیں اپنی یہ محبت اور دیوانگی حماقت معلوم ہوگی۔ ایسی حماقت جو معافی کے قابل تو ہے مگر پھر حماقت ہے۔ میری جان وہ حسن جو تمہارے دل میں اس وقت موجود ہے اُس زمانے تک ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا۔''

ہوسکتا ہے کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو کیونکہ آپ نے بھی مجھے ایسا ہی لکھا ہے کئی خطوں میں۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔ میرے دل کی سب سے بڑی مسرت بن کر بھی اور سب سے بڑی محرومی اور حسرت بن کر بھی۔

ویسے ناصر بہت ہی اچھا ہے.... اور افسوس ہوتا ہے کہ میں اُسے بلاوجہ پریشان کر دیتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنی شدید محرومی اور دُکھ اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور میں بغیر کسی وجہ کے رونا شروع کر دیتی ہوں.... بے چارہ ناصر اور اُس کے گھر والے (ویسے ہم دونوں اکثر گھر والوں سے چھپا لیتے ہیں یہ بات۔ انہیں خواہ مخواہ تشویش ہو ورنہ) سمجھتے ہیں کہ میں گھر جانے کے لیے اُداس ہوں اور ناصر کہتا ہے چلو آؤ گھر چلیں۔ ہم پیدل ہی چل پڑتے ہیں اور راستے میں واقعی کھیتوں' پہاڑیوں اور ہواؤں اور خوبصورت مناظر کے درمیان ناصر کے ساتھ چلتے ہوئے آپ خود بخود ہی محرومی کی بجائے سرشاری بن جاتے ہیں میرے لیے اور میں خود بھی حیران ہو جاتی ہوں کہ کیا واقعی ابھی کچھ دیر پہلے میں رو رہی تھی اتنی تنہا اور اداس تھی۔ پتہ نہیں میری فطرت کیا ہے' میں خود کو سمجھ نہیں سکتی۔ البتہ بس اتنا جانتی ہوں کہ میں ایک سخت رومانیت پسند روح ہوں اور اس روح کی سب سے بڑی حسرت اور سب سے بڑی مسرت صرف آپ ہی ہمیشہ رہیں گے۔

اگر آپ ان دنوں مجھے دیکھ پاتے تو بہت ہنستے۔ اتنے تعویذ ہیں گلے میں۔ گلا بھرا ہوا.... کیونکہ میں بیمار رہی ہوں ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر۔ ذہنی طور پر تو جیسا بے ہوشی کا دورہ ویسے کی صبح پڑا تھا ایسے ہی تین چار اور بعد میں پڑے۔ ڈاکٹر یہ سن کر کہ یہ شادی شدہ ہے بڑا حیران ہوا کیونکہ اس نے تشخیص کیا تھا کہ یہ ہسٹریا ہے اور اس لڑکی کی جلد شادی کر دینی چاہیے.... لیکن سب سے بڑی بات یہ

ہے کہ خود میں نے اپنے آپ کو ہر پل سمجھایا' مصروف رکھا تو شکر ہے کہ اب تقریباً دو مہینے سے یہ دورہ نہیں پڑا.... اور جسمانی پریشانی الگ.... مجھے کوئی شوق نہ تھا کہ اس قدر جلد.... لیکن کیا کیا جائے۔ یہ اس قدر بے چین ہی کیوں ہوتے ہیں دنیا میں آنے کے لیے.... آپ ہنسیں گے کہ بار بار شیشہ دیکھتی ہوں.... کہ بھلا کیا میرے چہرے میں تبدیلی آئی۔ وہ کوئی نورانی ہالہ یا مقدس جذبہ چمکا یا نہیں چہرے پر یا اس کے گرد جس کے لیے پڑھا ہے کہ ''ماں'' کے چہرے پر نمودار ہو جاتا ہے.... مجھے تو کچھ فرق نظر آتا نہیں ابھی تک۔

میں تنہا رہنا چاہتی ہوں ان دنوں.... تنہا یعنی صرف آپ کے ساتھ۔ آپ کے خیال' آپ کے تصور' آپ کے عکس' آپ کی تصویر کے ساتھ.... تاکہ ''وہ'' بالکل ''خزانے'' جیسا ہو۔ آپ کی بھی یہی دعا ہے ناں.... خدا کی قسم میں نے تو تمہیں بھلایا ہی نہیں کبھی.... کسی دن بھی نہیں.... کسی رات بھی نہیں.... مگر تم نے تو شاید ایک دن بھی مجھے یاد نہ کیا ہوگا۔

ایک اور بڑی مصیبت ہے۔ دودھ پینا پڑتا ہے۔ زبردستی پینا پڑتا ہے اور اتنا زیادہ۔ مجھے تو کبھی بھی تھوڑا سا دودھ پینا بھی پسند نہیں رہا۔ سب کا خیال ہے کہ میں نے شادی کے بعد وزن گھٹایا ہے اور کمزور نظر آتی ہوں پہلے کے مقابلے میں۔

بھئی آپ تو صرف رُودین ہی نہیں رُوسی ادب کا ایک خوبصورت انسانی کردار ہیں۔ ایک طویل رُوسی افسانہ ''ابر گزراں'' مجھے بہت پسند آیا۔ اور مجھے بالکل اپنی تصویر لگا۔ اس میں بھی ہیرو ایک مشہور سٹیج ایکٹر اور ادیب اور لینا سے عمر میں کئی سال بڑا اور شادی شدہ ہے.... اور یہ کردار بھی بالکل حیرت ناک طور پر آپ جیسا ہے۔ ایک جگہ وہ لینا کو کہتا ہے کہ ''لینا میں تم سے محبت تو کرتا ہوں.... لیکن کاش تم جان سکو کہ جب تمہاری محبت کا خیال کرتا ہوں تو کتنا زیادہ بے چین ہو جاتا ہوں.... ایسی بے پناہ محبت کا مستحق ہونے کے لیے میں نے کیا کیا ہے.... تم مجھے جانتی تک نہیں ہو.... تمہیں بالکل معلوم ہی نہیں کہ میں صحیح معنوں میں کس قسم کا آدمی ہوں.... ٹھیک اسی طرح جیسے کہ میں نہیں جانتا ہوں کہ تم دراصل کیسی ہو۔''

تمہاری ہی ''نتالیہ''

حرف کی دنیا ایک صحرا ہوتی ہے جس کے ذرّے ایک دوسرے میں جُڑتے چلے جاتے ہیں اور اپنا مفہوم واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں پڑھنے والا ایک ایک ذرّے پر آنکھیں رکھتا اس صحرا میں سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں اتنا گم ہو جاتا ہے' محو ہو جاتا ہے کہ اسے دھیان ہی نہیں رہتا کہ اس صحرا کے باہر جو دنیا ہے' وہی حقیقت ہے اور یہ صحرا اس کا سراب ہے.. وہ ان ذرّوں کی تسبیح کے دانوں میں مگن تھا اور جب لہسن اور پیاز کی بو میں گندھی انگلیاں اس کے شانوں پر اتریں تو وہ اپنی صحرائی گمشدگی میں سے چونک کر باہر آ گیا..

''تم دیر سے چپ ہو..''

''ہاں..''

''ایک سوال کے جواب کے لیے اتنی دیر.. اور مائنڈ یو یہ صرف ایک سوال ہے درخواست نہیں..''

''تم بھی تو دیر سے چپ ہو..''

''صرف اس لیے کہ تم یہاں موجود نہیں تھے.. مجھ سے جدا بے خبر ہو چکے تھے.. بے جان اور بے پروا ہو چکے تھے تو میں کیسے کلام کرتی..''

''ایک انسان وقت کی غار میں پچیس برس پیچھے لوٹ جائے تو وہ کیسے لمحہ موجود میں موجود ہو سکتا ہے.. میں تمہارے خطوں کے حروف کی لڑی میں پرو دیا گیا تھا..''

''مجھے شرمندہ نہ کرو..''

''تم نے ان دنوں جو کچھ مجھے لکھا اس پر شرمندہ ہو؟''

''مجھے کیا یاد کہ میں نے ان دنوں میں کیا کیا لکھا.. انسان جو کچھ آج لکھتا ہے وہ سب اگلے ماہ نہ سہی اگلے برس تک متروک ہو جاتا ہے.. پچیس برس تو بہت عرصہ ہوتا ہے.. میں اس حوالے سے کیسے شرمندہ ہو سکتی ہوں.. اگر ہوتی تو یہاں تمہارے سامنے کیسے آتی اور ایک سوال کے ساتھ کیسے ہوتی.. لیکن لکھے گئے ہر حرف کو لوح محفوظ نہیں سمجھنا چاہیے.. صرف اس کی اجتماعی روح پر دھیان دینا چاہیے.. تم تذبذب میں ہو.. عقیدے کا مسئلہ ہے یا..''

''مجھے عقیدے کے بارے میں چنداں فکرمندی نہیں.. لیکن تم میں عقیدہ بدل دینے کی خصلت کا شائبہ ہے.. تم ایک جانب ایک سیدزادی ہونے پر تکبر کرتی ہو اور دوسری طرف ایک صلیب کو سینے سے لگائے رکھتی ہو..''

''مرد مختلف نہیں ہو سکتے..''

''نہیں؟''

''ہاں.. ہر مرد کسی نہ کسی لمحے ناصر بخاری ہو جاتا ہے.. حاکم اور ڈکٹیٹر... بخاری نے بھی پہلی شب یہی ہنگامہ کھڑا کیا تھا کہ یہ صلیب.. اور تمہاری خصلت بھی یہی پوچھتی ہے.. ایک ایسا سوال جس سے میں تنگ آ چکی ہوں..''

''آئی ایم سوری..''

''نہیں تمہیں افسوس نہیں صرف میرا دل رکھنے کے لیے کہ میں اتنی دور سے صرف تمہارے لیے آئی ہوں تم ایسا کہہ رہے ہو.. بہت سے لوگ جو بہت شرعی اور پابند ہوتے ہیں اپنے گھروں میں گندھارا یا گپتا عہد کے مجسّمے رکھتے ہیں جو ان کے ذوق جمال کو.. ان کی نگاہ کو تسکین دیتے ہیں لیکن.. وہ انہیں پوجتے تو نہیں.. ہاتھ جوڑ کر ان سے مرادیں تو نہیں مانگتے.. ان کے چرنوں میں پھول تو بھینٹ نہیں کرتے۔ میں بھی اس صلیب سے کچھ نہیں مانگتی.. اسے اپنے ہونٹوں سے لگا کر کوئی مراد نہیں مانگتی.. یہ محض تسکین ہے.. میرے عقیدے میں داخل نہیں ہوتی.. کوئی اور اعتراض..''

''آئی ایم سوری..''

''کیا ہم صرف فروعی مسائل میں الجھے رہیں گے یا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم الجھے رہیں اور اصل کی جانب نہ لوٹیں' راستے میں ہی رہ جائیں؟ میں پھر بتا دوں' میں سوالی نہیں ہوں.. درخواستی یا گداگر نہیں.. درخواستی اور گداگری ایک سیدزادی کے حضور ہوتی ہے اس لیے تم صرف ''ہاں'' یا ''نہ'' کہہ سکتے ہو..''

جولاہے کے تانے پیٹے میں یہ سب سے بڑی اٹک تھی..

سب سے دل آزار گانٹھ تھی جو کھیس کی بناوٹ میں رکاوٹ بن گئی تھی..اگرچہ دھاگے تو سب کے سب اُلجھے ہوئے تھے پھر بھی وہ قدرے مشقت سے اس اُلجھاؤ کو سلجھاتا کھیس بُنتا جاتا تھا..

لیکن اس ایک گانٹھ نے اُس کی کھڈی کی کھٹا کھٹ کو روک دیا تھا..

وہ شائد آگاہ نہیں تھا کہ..

سینہ کوبی..

ورق کوبی..

اور کھڈی کی کھٹ کھٹ ایک ہی سُر کی مختلف آوازیں ہیں..

اور یہ سب کی سب شرک کے زُمرے میں آتی ہیں..

جس گانٹھ میں.. چاندی کی ایک صلیب..زین العابدین کی آل اولاد.. مارکس اور لینن..اور پھر رُودین بندھے ہوں وہ بھلا کیسے کھڈی کو روانی سے چلنے دے سکتی ہے..

محمد علی ڈاکیا بھی اس گانٹھ کو کھولنے میں مددگار ثابت نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ محض ایک ہرکارہ تھا..اُس کا کام گانٹھیں کھول کر کھڈی پر بُنے جانے والے کھیس کی راہ ہموار کرنا نہیں تھا..

اُسے تو پوسٹ ماسٹر نے ایک خط پہنچانے کے لیے بھیجا تھا..

کس کا خط..کس کے نام..یہ اُس کا مسئلہ نہ تھا..

وہ بھی..ڈاکیا..ایک بڑی گانٹھ میں بندھا ہوا بے اختیار اور بے بس تھا..

صرف وہ جس نے اس گانٹھ کو باندھا تھا..کھول سکتا تھا..

معاشی معاملات کچھ پیچیدہ ہو رہے تھے..

پچھلے جنم میں کہیں ایک آسودگی سے لدا پھندا گھر تھا جس کے ایک الگ سے کمرے میں اُس کا بسیرا تھا.. چاروں بیٹے برسرروزگار تھے..تین اپنی سرکاری ملازمت کے گریڈوں کا حساب کرنے میں مشغول رہتے تھے اور چوتھا جو سب سے چھوٹا تھا اور جس نے شائد اُن کے لاڈ پیار کے باعث پڑھائی کی جانب کبھی توجہ نہ کی تھی اور سرزنش کرنے پر اگر وہ کچھ توجہ کر بھی لیتا تو یہ توجہ کچھ دنوں میں پھر سے بھٹک جاتی..اُس کے دو ہی جذبے تھے پتنگ بازی اور تازہ ترین ماڈل کی کاریں جو اکثر اُس کے پاس دکھائی دیتیں اور پھر ایک مختصر مدت میں بدل جاتیں..وہ اُسے تو یہی کہتا کہ یہ کار...کیونکہ اُس کے اپنے ذاتی وسائل تو اتنے بھی نہ تھے کہ وہ اُسے کوئی بھی کار خرید کر دے سکتا تو وہ یہی کہتا کہ یہ کار..تو میرے فلاں دوست کی ہے جو میں چند روز کے لیے مانگ کر لایا ہوں..اور یہ کار ایک مکینک نے یہ جان کر کہ میں کاروں کو پرکھ سکتا ہوں مجھے ٹیسٹ کرنے کے لیے دی ہے..لیکن اُسے خدشہ تھا کہ وہ یہ کاریں مانگ کر نہیں لاتا تھا..ایک بار جب اُس نے اپنی بیوی سے نت نئی کاروں کی آمدورفت کے بارے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا تو اُس نے سر جھکا کر کہا تھا ''جوان اولاد کے ساتھ سوال جواب کرو گے تو وہ ساتھ چھوڑ دے گی..کیا یہ کافی نہیں کہ ہمارے تین بیٹے ایسی سرکاری ملازمتوں پر فائز ہیں جہاں وہ تنخواہ کے سوا بھی بہت کچھ حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں..کاروں کے بارے میں اسے سرزنش نہ کرنا..''

اُس کی بیوی اولاد کی محبت کے آگے ہتھیار ڈال چکی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیٹا کبھی کبھار چار پانچ روز کے لیے کوئی بہانہ بنا کر غائب ہو جاتا ہے..جاتا اپنی تازہ ترین ماڈل کی کار میں ہے جو واپسی پر اُس کے نیچے نہیں ہوتی..اور ہمیشہ اُس کے لیے کوئی قیمتی تحفہ لاتا ہے..

وہ چاروں ماں کی سالگرہ کو یاد رکھتے تھے..اُسے ''تم دنیا کی عظیم ترین ماں ہو'' کے کارڈوں کے ہمراہ پھولوں کے ڈھیر اور بیس پاؤنڈ کا ایک کیک پیش کرتے تھے اور ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' چلاتے گاتے اتنے زور شور سے تھے کہ ہمسایوں کو بھی خبر ہو جاتی تھی لیکن وہ چاروں..نہ اُس کے..نہ اُس کی بیوی کے بس میں تھے..اپنی زندگیوں میں آزاد اور اُن دونوں سے بے پروا تھے..

پھر بیوی ایک پَل میں تھی اور دوسرے پَل میں وہ اُسے قبر میں اُتار رہا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چاروں بیٹے جب فکرمند اور پُرتشویش نظروں سے اُس کے نیم تاریک کمرے میں..اُسے صوفے پر اونگھتا ہوا پا کر اُسے دیکھتے تھے تو اُسے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ اُس کے ہاتھوں کو دیکھ رہے ہیں..

ابھی کچھ عرصہ ہوا تھا اُسے ملازمت سے فارغ ہوئے جب بہت نامعلوم انداز میں... اُس کے عزیزوں یا دوستوں کو تو احساس نہ ہوا..اُس کے بیٹوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے کمرے سے باہر آنے سے کتراتا ہے...ڈائننگ ٹیبل پر کم دکھائی دیتا ہے..بہانے تراشتا ہے..سر درد اور طبیعت کی گرانی کے جواز پیش کرتا ہے..گھر میں آنے والے مہمانوں سے ملنے سے گریز کرتا ہے..

اُس کا بیشتر وقت غسل خانے میں گزرتا تھا..

یہ اُس کا پسندیدہ ترین مقام تھا..غسل خانہ..اُس کا سفید سنک.. پانی کے نل اور صابن.. اور مٹی کا ایک جھانواں...جو ہر تیسرے روز تبدیل کر دیا جاتا کہ اُس کے دندانے گھس جاتے..

صابن کی کم از کم ایک ٹکیہ تو روزانہ صرف ہو جاتی..

بہت نامعلوم انداز میں اُسے پاکی اور ناپاکی کا خبط ہو گیا..اسی لیے وہ گریز کرتا تھا باہر جانے سے..لباس پر کوئی چھینٹ نہ پڑ جائے..جوتے آلودہ نہ ہو جائیں..وہ ایک نیا نکور تازہ اخبار بھی کھولتا تو اُسے وہم ہو جاتا کہ اسے چھونے سے کچھ جراثیم میری اُنگلیوں کے پوروں میں سرایت کر گئے ہیں اور وہ غسل خانے کا رُخ کرتا..رگڑ رگڑ کر ہاتھوں کو بار بار دھوتا..اُنہیں تولیے سے نہ پونچھتا کہ اُس میں بھی آلائش ہو سکتی تھی..واپس آتا تو فوراً ہی اُسے احساس ہوتا کہ صابن کی جو ٹکیہ استعمال کی تھی وہ بہت دیر سے وہاں پڑی تھی اس لیے صاف نہ تھی اور وہ پھر غسل خانے کا رُخ کرتا ایک اور ٹکیہ کا ریپر اُتار کر دوبارہ ہاتھوں کو دھونے لگتا..دھونے کے بعد اُنہیں جھانویں سے رگڑتا اور پھر صابن لگاتا..

اُس کی انگلیاں زخمی ہو چکی تھی..متواتر ہاتھ دھونے سے ہتھیلیوں کی پشت پر جو رگیں تھیں وہ پھٹنے کو آ رہی تھیں..

وہ کسی عزیز کی شادی کی تقریب میں بھی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس لیے شریک نہ ہوتا کہ وہاں پر پانچ دس منٹ کے بعد ہاتھ دھونے کی سہولت میسر نہ ہو سکتی تھی..خوراک اُس کے کمرے میں پہنچا دی جاتی..

اور یہ غذا صرف اور صرف شوربے پر مشتمل ہوتی..آلو شوربہ..بھنڈی شوربہ..اور صرف شوربہ..کیونکہ کوئی بھی ٹھوس غذا اُس کے حلق سے نہیں اُترتی تھی..

یہ سب کچھ ریٹائرمنٹ کے بعد ہوا ورنہ وہ ایک نارمل شخص تھا..

وہ اکثر نہایت سنجیدگی سے اپنی بیوی سے شکوہ کیا کرتا تھا کہ پرانے زمانوں میں آبادی اتنی مختصر تھی کہ ہر بستی سے نکلتے ہی کوئی گھنا جنگل..نیلے تالابوں اور اُن کو ڈھکتے کنول کے پھولوں' اشوک کے درختوں اور بوڑھے برگدوں اور جانوروں اور پرندوں سے پُر جنگل شروع ہو جاتا تھا..اور جو لوگ کچھ ناآسودہ ہوتے تھے یا زندگی سے اُکتا جاتے تھے وہ ایک پوٹلی کاندھے پر ڈال اُدھر چلے جاتے تھے..اور اب تو بستیوں کے باہر بھی بستیاں ہیں' شہر ختم ہونے کا نام نہیں لیتے' آبادی ایک تسلسل کے ساتھ چلی ہی جاتی ہے تو ایک ناآسودہ اُکتایا ہوا شخص اب کیا کرے..کدھر جائے..

بیوی اُس کے نفسیاتی مرض سے آگاہ تھی' وہ ہنس کر کہا کرتی تھی ''تم اپنے گھر کی آسائشوں کے اتنے عادی ہو چکے ہو کہ اگر ان دنوں بھی شہر کے باہر کوئی جنگل ہوتا اور تم ہم سے ناخوش ہو کر اُدھر نکل جاتے تو دو چار دن میں ہی..مچھروں سے تنگ آ کر..خاموشی اور تنہائی سے خوفزدہ ہو کر..بیڈ ٹی نہ ملنے پر یا اپنے کموڈ کی سہولت نہ ملنے پر کانوں کو ہاتھ لگا کر گھر واپس آ جاتے..''

وہ اس جواب کو اپنی تضحیک پر معمول کرتا اور کئی روز تک بیوی سے رُوٹھا رہتا..بیوی کے چلے جانے پر اُس کی پاکی اور ناپاکی کا خبط تو برقرار رہا' لیکن گھر چھوڑ کر کہیں بھی چلے جانے کا اُسے کبھی خیال نہ آیا..

چھ ماہ ہو چکے تھے اُسے نتالیہ کے جنگل میں آئے ہوئے..

پہلے روز ہی اُس نے اُس کے ہاتھوں کو دیکھ کر پوچھا تھا ''یہ زخم کیسے ہیں؟''

''یہ..بس..گھر میں ردّوبدل کرتے ہوئے..فرنیچر اِدھر اُدھر کرتے ہوئے..یہ خراشیں آ گئیں..''

''لیکن یہ خراشیں تو نہیں لگتیں' زخم ہیں..''

''خراشیں ہیں'' اُس نے تلخی سے کہا اور ہاتھ پرے کر لیے..وہ اُس کو قطعی طور پر نہ جانتی تھی

ابھی پہلا روز تھا اس لیے چپ ہوگئی..لیکن آئندہ دنوں میں اُسے اُس کی آنکھیں محسوس ہوتی تھیں اپنی اُنگلیوں پر..وہ کچھ کہے بنا اُن خراشوں کے بارے میں پُرتشویش تھی..پھر وہ خراشیں مندمل ہوگئیں..

نتالیہ سے پہلی بار ملنے میں اُسے تامل تھا یہی تشویش تھی کہ کہیں آس پاس کوئی باتھ روم نہ ہوا تو میں کیا کروں گا..کدھر جاؤں گا..وہ کیا سوچے گی اس کی اُسے پروا نہ تھی وہ خود کیا کرے گا یہ اُس کے لیے سوہانِ روح تھا..لیکن اُسے حاجت نہ ہوئی' کوئی بے چینی نہ ہوئی..گھر پہنچ کر وہ فوراً باتھ رُوم میں گیا لیکن ہاتھ دھونے کو اُس کا جی نہ چاہا..

نتالیہ کی آمد کے بعد وہ پاکی اور ناپاکی کا خبط گم ہوگیا..بار بار ہاتھ دھونے کی خواہش گھٹ کر مرگئی اور اُس کی خراشیں مندمل ہوگئیں..

تو معاشی حالات کچھ پیچیدہ ہوگئے..تنہا زندگی میں جوں توں کر کے گزر بسر ہو جاتی تھی مگر اب معاملات مختلف ہوگئے تھے..اگلے ماہ کے کرائے کے لیے..مختلف بلوں اور خوراک وغیرہ کے اخراجات کے لیے...گھریلو ملازم کی تنخواہ کے لیے رقم کم پڑتی دکھائی دیتی تھی..

''تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا؟'' ناراضی اُس کے چہرے پر پھیل رہی تھی..

''میں تمہارے پیسوں پر انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا..''

''ایک عورت کے پیسوں پر..''

''ہاں..''

''عورت اتنی حقیر اور بے توقیر ہوتی ہے؟'' ناراضی کے ہمراہ غصے سے اُس کا چہرہ تمتمانے لگا..

''نہیں..بالکل نہیں لیکن..''

''میں مالی طور پر اتنی آسودہ کبھی نہیں ہوئی جتنی اب ہوں..طلاق کے بعد! میرے پاس بہت سے شیئر ہیں' سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں' جن سے ماہانہ اتنا منافع آتا ہے کہ ہم اُنہیں پاکستانی روپے میں بدل کر اگر جلاتے بھی رہیں تو بھی ہماری زندگی متاثر نہیں ہوگی..اگر تم انکار کرو گے تو تم یقیناً مجھے حقیر اور بے توقیر سمجھتے ہو..''

اس گفتگو کے اگلے روز وہ باغِ جناح کے اندر گئے تھے..

جہاں ایک شیر دھاڑا تھا..

جہاں ایک اشارہ ہوا تھا..

یہ نہیں کہ صرف جولاہے پر...بلکہ رُودین اور نتالیہ پر بھی وہ پچیس برس گزر چکے تھے..

لیکن ان برسوں کے گزر جانے کے باوجود..

جولاہی برنے کی پینگ سے نہیں اُتری تھی..جھول رہی تھی..

ہاتھی عشق نے جو بدن کو روندا تھا تو اُس کی ٹیسیں بدستور اُٹھتی تھیں..وہ خاوند اور اولاد کے دھاگوں میں بندھ کر کسی روایتی کھیس میں نہیں بُنی گئی تھی..

''تم مجھے ہی خط کیوں لکھا کرتی تھیں؟''

''اگر میں صدقِ دل سے بیان کردوں تو تم شاید دُکھی ہو جاؤ..سمجھ لو کہ یہ نصیب میں تھا..''

''شاید میں دُکھی ہو جاؤں لیکن اس کے باوجود خلش کی دُوری اگر دُکھ کا باعث بھی بن جائے تو میری ترجیح یہی ہوگی..''

''مجھے کسی نہ کسی کو خط لکھنا تھا..جو مجھ پر گزرتی تھی..ایک خانقاہی ماحول میں اگر تو میں سراسر محفوظ رہتی..تو میں اُسی آب و ہوا میں پنپ جاتی..کسی کو خط لکھنے کی حاجت پیش نہ آتی' ایسا کرنا میرے گمان میں بھی نہ گزرتا..اگر گزرتا تو توبہ استغفار کرتی لیکن مجھے ایک اور ہوا لگ گئی..کانونٹ' ساون اور رُوسی ادب نے مجھے برباد کر دیا..میرے وجود کی اینٹیں اُکھڑنے لگیں۔اگر میں کسی کو..یا تمہیں خط نہ لکھتی تو مسمار ہو جاتی..''

''کسی نہ کسی کو؟''

''ہاں..میں نے کہا تھا کہ تم دُکھی ہو جاؤ گے..تمہیں برا لگے گا''

''تو میں محض ایک بہانہ تھا... جذبہ نہ تھا''

''بہانوں کو جذبوں میں بدلتے اور ڈھلتے دیر نہیں لگتی.. ہاں وہ پہلا خط جو میں نے کسی نہ کسی کو لکھنا تھا.. محض کسی کو لکھا.. اور یونہی بے دھیانی میں ہر کسی کو نہیں.. ایک ایسے کسی کو جو کانونٹ' ساون اور رُوسی ادب کے معیار پر پورا اُترتا تھا.. وہ بہت آسانی سے کوئی اور بھی ہو سکتا تھا.. لیکن یہ صرف نصیب میں تھا کہ اُس کسی میں سے تم سے رابطہ ہو گیا.. جیسے ایک لاٹری نکل آتی ہے..''

''تو میں ایک بہانہ تھا.. اور ایک اتفاق تھا..''

''تم تھے.. اب نہیں ہو''

''اور اب..''

''اب بھی تمہیں کسی دلیل کی ضرورت ہے.. تم مجھ سے جواب طلبی کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں آ سکتے' کیونکہ یہ معاملہ تو سراسر یکطرفہ تھا.. تم مجھ پر کب توجہ دیتے تھے.. تمہاری توجہ تو کہیں اور جا کر ایسی ٹھہری تھی کہ وہیں پتھرا گئی تھی.. کہ نہیں؟''

''ہاں..''

''تو تم مجھ سے جواب طلبی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو..''

جب کبھی وہ اپنے دونوں بازو سمیٹ کر... ایسے جیسے برہنگی کو چھپانے کے لیے سمیٹے جاتے ہیں اُس کی جانب باتیں کرتی ہوئی جھکتی تو اُس کی ڈھلکنے کو چھاتیاں بھی سمٹ کر اُس کے کڑھائی دار ملتانی کرتے کو بھرتی ہوئی اُبھر کر نمایاں ہو جاتیں اور اُن کے درمیان میں چاندی کی صلیب کا دَم گھٹنے لگتا اور اُس کی زمانوں کے گزر جانے سے بجھتی ہوئی آنکھیں اُن کے اُبھاروں پر ٹھہر جاتیں جیسے ایک ڈوبتا ہوا شخص بے کراں سمندر میں اُبھری ہوئی دو چٹانوں کو دیکھ کر اُن تک پہنچ جانا اور اُن کو چھونا چاہتا ہے..

بوڑھا.. اپنے پنجرے میں مدتوں سے ٹہلتا ببر شیر دھاڑنے لگا..

تُرت مراد کے مزار کے برابر میں جہاں باغِ جناح کا آخری بوڑھا برگد جس کے تنے کے اندر پچھلی شب کے جلائے ہوئے چراغ اب بھی جلتے بجھتے تھے اور اُس کی شاخوں اور داڑھیوں میں بندھے خواہشوں اور تمناؤں کے چیتھڑے سرسراتے تھے اُن کے برابر میں چڑیا گھر کا آہنی جنگلہ دیوار تھا جس کے پرے مدتوں سے اپنے پنجرے میں بند.. ٹہلتا ہوا.. وہ بوڑھا ببر شیر دھاڑنے لگا..

اور اُس کی دھاڑ باغِ جناح کے ہر شجر کو.. بے شک وہ سِلور اوک ہو.. چنار یا بُدھا ٹری ہو.. میگنولیا' بائل پام یا ایرو کیریا ہو.. ہر شجر کو یوں لرزاتی تھی کہ اُس کی کمر دوہری ہوتی تھی.. ہر بوٹے اور ہر شجر کو تھرتھراتی تھی.. صرف آخری بوڑھا برگد تھا جس کے تنے یا پتوں میں ذرّہ برابر لرزش نہیں آتی تھی کہ وہ بوڑھے ببر شیر کی دھاڑ کا عادی ہو چکا تھا.. ترت مراد کے مزار کی قربت میں یہ سینکڑوں برس سے سانس لیتا بڑھتا بوڑھا برگد... باریش برگد جس کے کھوکھلے تنے میں دیئے جلائے جاتے تھے.. اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر منتیں مانی جاتی تھیں.. گیندے کے ہار بھینٹ کیے جاتے تھے صرف وہ تھا جو جنگلے کے پار پنجرے میں بند ببر شیر کی دھاڑ سے متاثر نہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں بوڑھے تھے..

وہ چراغ اب بھی جلتے بجھتے تھے.. اگرچہ صبح ہو چکی تھی..

صبح ہو کر دوپہر ہو چکی تھی.. اگر ابھی شبِ دیجور ہوتی تو ان چراغوں کی روشنی دل کے دیئے کی روشنی کی مانند زمینوں کے اندر تک جاتی... بہت سے شجر.. بیشتر جھاڑیاں.. کئی بوٹے اس باغ میں بے سبب لگتے تھے.. وہ روکھے سوکھے.. ٹنڈ منڈ اور ہریاول سے عاری بے وجہ لگتے تھے.. باغبانوں کی بصیرت پر شک ہوتا تھا کہ یہ جن کی کوئی زیبائش کوئی نمائش نہیں ہیں انہیں یہاں کیوں بویا گیا ہے.. لیکن وہ جو اس باغ میں بلاناغہ ہر موسم میں.. ہر حالت میں آیا کرتے تھے وہ گواہی دیتے تھے کہ سال میں کوئی ایک وقت... بے شک مختصر ہی سہی.. چند دیہاڑوں کا ہی سہی آتا تھا جب اُس روکے سوکھے.. ٹنڈ منڈ درخت یا ہریاول سے عاری جھاڑی پر ایک ایسا وقت آتا تھا جب وہ پورے باغ میں سب سے نمایاں ہو جاتا تھا کہ اُس کی شاخوں اور ٹہنیوں پر ایسی کونپلیں پھوٹتی تھیں اور پھر ایسے گل نمایاں ہوتے تھے کہ نظر اور کہیں نہیں صرف اُس پر ٹھہرتی تھی..

کوئی بھی شجر.. جھاڑی.. بوٹا.. روئیدگی... بے سبب نہ تھی چاہے ظاہر میں وہ روکھی سُوکھی اور بے آبرو ہو.. کبھی نہ کبھی اُس پر بھی وہ وقت آ جاتا ہے جب وہ.. رُوکھی سُوکھی بے آبرو جھاڑی بنی سنوری دولہن بن جاتی ہے اور پورے باغ پر حاوی ہو جاتی ہے.... اس باغِ جہاں میں بھی بہت سے انسان سُوکھے اور بے سبب لگتے ہیں' بے کار اور بے مصرف لگتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ بڑے باغباں نے اُنہیں کیوں تخلیق کیا لیکن اُن پر بھی کبھی نہ کبھی ایک ایسا وقت آ جاتا ہے جب وہ بے مثل ہو جاتے ہیں' چمکتے ہیں' کل عالم پر اپنے لشکارے ڈالتے ہیں اور پھر یکدم بجھ جاتے ہیں۔ تو کوئی بھی ذی روح جو اس باغِ جہاں میں پھوٹتا ہے ہمیشہ پس منظر میں نہیں رہتا' کبھی نہ کبھی دنیا

کی سٹیج پر ایک مرکزی اداکار کے طور پر سامنے آ جاتا ہے.. تمام تر روشنیاں اُسے منور کر کے نمایاں کر دیتی ہیں.. اس نظام میں اُلجھاؤ صرف اتنا ہے کہ بیشتر لوگ یہ جان ہی نہیں پاتے کہ اُن پر وہ وقت آ گیا ہے.. وہ مرکزی کردار بن چکے ہیں.. اور وہ ہمیشہ کی طرح بُت بنے کھڑے رہتے ہیں کہ میرے نصیب میں بس گمنامی اور بیکاری ہے اور یوں وہ وقت گزر جاتا ہے' وہ چاہیں تو اُس لمحے کو اپنی پوری زندگی پر محیط کر سکتے ہیں..

شیر پھر سے دھاڑنے لگا..

اُس کی دھاڑ ایسی تھی جیسے وہ دونوں ایک گھنے گھپ اندھیرے جنگل میں بے آسرا ہیں اور اُس کی دھاڑ لرزتے پتوں کو چیرتی اُن تک مرگ کا پیغام لاتی ہے..

''مجھے ڈر لگتا ہے'' نتالیہ نے اپنی چھاتیوں پر بندھے ہاتھ کھول دیئے اور اُس کے بازو کو تھام کر اُس کے شانے کا سہارا لیا ''یہ کہیں اپنے پنجرے سے باہر تو نہیں آ جائے گا؟''

''تمہیں ڈر لگتا ہے؟''

''ہاں..''

''تمہیں کینسر سے ڈر نہیں لگا تھا؟''

اُس کی ہنسی اب بھی دل کو موہ لینے والی تھی.. پچیس برس پیشتر جانے وہ اپنے مقابل کو کس طور مفلوج کر دیا کرتی تھی.. بنگال کا جادو اُن دنوں تو سر چڑھ کر بولتا ہوگا مگر اب اُس کے بالوں کی گھٹا ٹوپ سیاہی میں برفیلی سفید ندیاں تھیں اور پھر بھی اُس کی دل کشی گناہ پر آمادہ کر دینے والی تھی..

''نہیں.. مجھے کینسر سے تقریباً ڈر نہیں لگا تھا.. کیونکہ وہ تو خاموش اور بے آواز ہوتا ہے.. دھاڑتا نہیں.. تم نے کہا تھا کہ آج میں تمہیں ایک سکون میں ٹھہرے ہوئے خاموش باغ میں لے جاؤں گا تو سکون کی یہ کیفیت کیا ہے کہ اس میں ایک شیر دھاڑتا ہے..''

''یہ پنجرے سے باہر نہیں آئے گا..''

''تم اس باغ سے بہت واقف ہو؟''

''یہ ایک ایسا عجوبہ ہے جس سے بہت واقف نہیں ہوا جا سکتا.. یہاں آنے والا ہر شخص اسے اپنی ذات کے حوالے سے پرکھتا ہے.. اس کی پہچان کرتا ہے.. فاتر العقل لوگ.. دھتکارے ہوئے.. پرندوں سے پیار کرنے والے.. تعلیمی اداروں سے بھاگے ہوئے جوڑے... غم زمانہ اور

غم روزگار کے مارے ہوئے.. بیماریوں کے مارے ہوئے.. اس عجوبے میں کیسے کیسے لوگ آتے ہیں..''

''تم کیوں آتے ہو؟''

''چمگادڑوں کے لیے..''

''اوہ رئیلی..'' اُس کا منہ ایک امریکی حیرت میں کھل گیا.. پہلی بار اُس کی ''اوہ رئیلی'' کی ادائیگی میں اُس کے امریکہ میں برس ہا برس کے قیام کی ایک جھلکی دکھائی دی ''یو مین بیٹس؟''

''ہاں.. یہاں تین ایسے بلند قامت شجر ہیں جن کی چوٹی پر پہنچتے پہنچتے نگاہ کا سانس بلندی کی وجہ سے پھول جاتا ہے اور اُن پر صرف اور صرف چمگادڑیں بسیرا کرتی ہیں.. اُن کی شاخوں سے قطار اندر قطار لٹکتی ہیں اور اُن کے سائے تلے جو راستہ ہے وہاں ان کی سیاہ بیٹیں اور اُن کی دل خراش چیں چیں کی آوازیں مجھے متوجہ کر کے اوپر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں..''

''تمہیں چمگادڑیں پسند ہیں؟'' نتالیہ کے ہاتھ میں سے ایک بے اختیار جھرجھری اُس کے بازو میں منتقل ہوئی..

''وہ زندگی کی علامت ہیں''

نتالیہ ہنسنے لگی.. دل کو موہ لینے والی ہنسی ہنسنے لگی ''تم کیسے رُودین ہو جو چمگادڑوں کو زندگی کی علامت جانتے ہو''

''میں خواب و خیال کا رُودین نہیں ہوں..''

''یہ تو میں آہستہ آہستہ جان رہی ہوں کہ خطوں میں اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے..''

''انہی بلند قامت پیڑوں پر کبھی کبھار لمبی رنگدار دُموں والے غشپ پرندے بھی آن اُترتے ہیں جو شمال کی برفوں سے گھبرا کر ادھر گرم ہواؤں میں آ نکلتے ہیں اور جتنے روز وہ یہاں بسیرا کرتے ہیں.. دو چار روز.. اتنے روز حیرت انگیز طور پر چمگادڑیں وہاں سے کوچ کر جاتی ہیں''

''کہاں جاتی ہیں؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں..''

''چمگادڑیں اور... کون سے پرندے؟''

''غشپ پرندے..''

اس رُودین کا میڈیکل چیک اَپ ہونا چاہیے.. نتالیہ نے اُسے انتہائی پُرتشویش نظروں سے دیکھا.. چمگادڑیں اور پتہ نہیں کون سے پرندے.. ہم ایک ہی گھر میں شب و روز گزارتے ہیں.. ساتھ ساتھ رہتے ہیں اگرچہ ہمارے درمیان کوئی جنسی قربت نہیں لیکن اس کے باوجود کیا پتہ یہ کسی رات کوئی اور رُوپ اختیار کرلے' میرا گلا دبا دے..

رُودین اُس کی تشویش سے ہرگز آگاہ نہ تھا..

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد شیر نے شائد ایک جمائی لی اور پھر سے دھاڑا.. اس بار اُس کی دھاڑ نے نتالیہ کو کم ڈرایا.. اُس کے دھاڑنے کی عادت ہوتی جاتی تھی..

ابھی تک وہ جنسی قربت میں نہ آئے تھے..

ایک دوسرے کے گالوں اور ہونٹوں پر ایک واجبی اور سراسر روایتی لمس کے سوا وہ ایک دوسرے سے الگ رہے تھے.. اس میں شائد عمر کی نقاہت بھی اپنا کردار ادا کرتی تھی اور ایک حجاب بھی.. اگرچہ اُن کے آس پاس جو لوگ تھے.. ہمسائے تھے.. وہ چہ میگوئیاں کرتے تھے.. شک شبہ کا اظہار کرتے تھے..

جمائی لینے کے بعد شیر جب پھر سے دھاڑنے کو آمادہ ہوا تو وہ کچھ دیر کے لیے چُپ ہو گئے..

اُس دھاڑ کے احترام میں کچھ دیر کے لیے چُپ ہو گئے..

اُنہوں نے شیر کو دھاڑنے دیا تا آنکہ وہ اپنی کہولت کے باعث نڈھال ہو کر چُپ ہو گیا..

''کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟'' اُس نے شیر کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر کہا..

''شائد پچیس برس..''

''شائد کیوں؟''

''تم بے شک بے یقین ہو جاؤ لیکن مجھے کچھ حساب نہیں.. برس جتنے بھی گزرے ان کی گنتی میں نہیں کر سکی.. میرے حساب میں ابھی میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں اُن اُنگلیوں میں قلم پکڑے ہوئے جن میں لہسن اور پیاز کی بُو پوروں تک رچی ہوئی ہے اور ابھی میں تمہارے ہمراہ تمہارے شانے کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی ہوں.. درمیان میں جو کچھ گزرا.. مجھ پر نہیں کسی اور پر گزرا..''

''کیا تم کبھی بھی اپنے آستانہ رُومی کے پاک صاف ماحول میں یہ امکان دل میں لا سکتی تھیں کہ جس... کسی کو بھی.. تم خط لکھتی ہو بالآخر.. عمر جب ڈھلے گی تمہارے بنگالی بالوں میں سفید ندیاں اُتریں گی تو تم نہ صرف اپنے خاوند کو بلکہ اولاد کو بھی ترک کر کے اُس کسی کے ساتھ ایک ہی چھت تلے زندگی گزارنے لگو گی.. بِنا کسی قانونی یا مذہبی بندھن کے.. کبھی یہ خیال دل میں آیا؟''

''یہ سب کسی ایک خیال یا امکان کا نہیں محض نصیب کا کیا دھرا ہے.. ایک گلیشیر میں سے برآمد ہوتی تیز دھار ندی میں اگر چند تنکے گر جائیں تو اُن کے پاس اپنی منشا کے مطابق بہنے کا کوئی اختیار ہو گا؟.. اُن کے بس میں سوائے بے اختیار ہو کر بہہ جانے کے اور کچھ نہیں ہو گا.. میں بھی بہتی بہتی تمہارے کنارے آ لگی ہوں.. کسی اور کنارے بھی جا لگ سکتی تھی..''

اُن کے بنچ کے قریب سمندر پھل نامی درخت کے پتوں میں سے چھوٹے چھوٹے سرخ بیر بہوٹیوں ایسے پھول دھوپ کی تمازت کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹپ ٹپ گرتے تھے.. درخت تلے گھاس نہ تھی اور وہ سُوکھی زمین کے سادہ کینوس میں ٹپ ٹپ رنگ بھرتے جاتے تھے..

''یہ امرتا شیر گل کون تھی؟''

''ہوں..'' وہ اپنی اونگھ سے باہر آ گیا.. یہ حوالہ کہاں سے آ گیا.. وہ رُوسی ادیبوں سے تو متعارف تھی لیکن ایک لاہوری مصورہ کے نام سے کیسے آگاہ ہو گئی ''یہ نام کہاں سے آ گیا؟''

''تمہارے کتابوں کے شیلف میں سے.. تم بازار سے سودا سلف لانے کے لیے نکلتے ہو تو اکثر بھول جاتے ہو کہ میں گھر میں ہوں.. واپسی پر اقرار کر لیتے ہو کہ ہاں اتنا عرصہ تنہا رہنے کے بعد مجھے یاد نہیں رہتا کہ کوئی منتظر بھی ہے.. تو اس دوران میں کیا کرتی ہوں.. بالکونی سے سڑک پر سے گزرتی ٹریفک کو تکتی رہتی ہوں.. یا پھر تمہاری کتابوں کو اُلٹتی پلٹتی رہتی ہوں.. ان میں یہ شیر گل بہت ہوتی ہے.. اُس کے بارے میں مضامین.. اُس کی پینٹنگز کی ری پروڈکشنز.. اور ایک بار مال روڈ پر سے گزرتے ہوئے تم نے ایک پرانی عمارت کی جانب اشارہ کر کے.. ایک مبہوم سا اشارہ کر کے یہ کہا تھا کہ امرتا ادھر رہتی تھی.. اور پھر فوراً ہی موضوع بدل کر کسی اور طرف نکل گئے تھے..''

''ہاں..'' وہ کھسیانہ سا ہو گیا ''یہ عورت میری کمزوری ہے..''

''ہر عہد میں کوئی نہ کوئی عورت تمہاری کمزوری رہی ہے..'' وہ پھر سے ہنس کر دل موہنے لگی ''لیکن میں کبھی بھی ان کمزوریوں میں شمار نہیں ہو سکی..''

''تمہیں اُس سے حسد کرنا جائز نہیں کہ وہ میری پیدائش سے بھی پہلے کی بات ہے.. اُس کا باپ ایک سکھ سردار تھا جیسا کہ گل سے ظاہر ہے جو جاٹوں کی ایک ذات ہے اور ماں ہنگری کی تھی.. وہ ان دونوں نسلوں کی تمامتر بے مُہار اور وحشی خصلتوں کی وارث ہوئی.. ساری زندگی بے مُہار اور وحشی گزاری.. یہیں لاہور میں اُسی فلیٹ میں جس کی جانب میں نے ایک موہوم سا اشارہ کیا تھا اُس نے شائد اپنے آپ کو جان سے مار ڈالا اور راوی کے کنارے ایک شمشان گھاٹ میں جلا دی گئی..''

''اُس کا نام بے حد میوزیکل ہے..'' وہ پھر ہنسی ''لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے چہرے کو سُرخ ہونے سے بچا نہیں سکتے.. بلش کر جاتے ہو''

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ میری پیدائش سے بہت پہلے کی بات ہے.. وہ کمال کی مصورہ تھی اور اُس کی دل آویزی اور کشش اُس کی مبہم بلیک اینڈ وہائٹ تصویروں میں بھی چھلکتی ہے.. اُس کی آزاد رُوح' بے راہروی اور تخلیق قوت اتنی شدت سے مجھ پر اثر کرتی ہے کہ میں خواہش کرتا تھا کہ کاش میں اُس کے زمانوں میں ہوتا''

''اگر ہوتے تو کیا کرتے؟''

''اُس کے چاہنے والوں کی لمبی صف میں کھڑا ہو کر انتظار کرتا..''

''تمہاری باری آ جاتی؟'' اُس نے ہنسنا ترک نہیں کیا تھا.. وہ اُس کی اس کمزوری کا لطف لے رہی تھی اُسے چھیڑ رہی تھی...

''ہاں..'' اور وہ سنجیدہ تھا'' کیونکہ وہ ایک نمفومینک تھی.. اُسے اپنے مرد بدلنا پسند تھا.. کیا تم تصور کر سکتی ہو کہ ابھی پچھلے ہفتے ایک انگریزی اخبار میں ایک اَسّی برس سے تجاوز کر جانے والے بوڑھے نے اعتراف کیا ہے کہ امرتا نے مجھ سے تقریباً زبردستی کی تھی.. میرا کوئی دوش نہ تھا نہ خواہش تھی لیکن اُس نے مجھے مجبور کیا تھا.. کیونکہ وہ پیش قدمی ہی ایسے انداز میں کرتی تھی..''

''پیش قدمی؟''

''ہاں.. ہاں اُس نے اقرار کیا کہ وہ اُس فلیٹ میں.. مال روڈ کے کنارے اُسی فلیٹ میں آتش دان کے سامنے اپنے آپ کو لباس سے الگ کر کے لیٹ گئی.. اور یاد رہے کہ یہ برطانوی راج کے زمانے تھے جس میں ایک میم صاحب.. بے شک وہ ایک سردارنی ہی کیوں نہ ہو نہایت مقدس اور ہیجان خیز ہوتی تھی تو پھر.. ایسی پیش قدمی کے بعد..''

''تم چُپ نہیں ہو سکتے..'' نتالیہ نے اُس کی کمر میں ایک سیدھی اُنگلی چبھو دی ''اب میں بلَش کر رہی ہوں.. چُپ ہو جاؤ''

''اتنے بچے جننے کے بعد.. اتنا عرصہ امریکہ رہنے کے باوجود بھی..''

''ہاں..'' اور واقعی اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور وہ اُسے نہیں زمین کے اُس ٹکڑے کو تکتی تھی جس پر سمندر پھل کے سُرخ پھول ایک تواتر سے گرتے چلے جاتے تھے.. ''مرد اور عورت اس لیے الگ الگ کر دیئے گئے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ ہی نہیں سکتے.. اُن میں محض انسان ہو جانا مشترک ہے ورنہ اُن کے قبیلے الگ ہیں.. پہلے دو چار برس کے بعد بھی بخاری کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ جنسی رابطہ میرے لیے اتنا اہم نہیں جتنا اُس کے لیے ہے.. اُس کے لیے تو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا.. کیونکہ اُس کے لیے مردانگی کا اظہار اُلفت میں نہیں محض اُس طوالت میں تھا جس سے اُسے تسکین نہیں ملتی صرف روایتی داستانوی تشفی ملتی ہے کہ وہ کمال کا مرد ہے.. اور عورت اُسے سہتی جاتی ہے.. اقرار کرتی جاتی ہے کہ وہ کمال کا مرد ہے اگرچہ وہ ہوتا نہیں.. متعدد بچے پیدا کرنے اور امریکہ میں رہنے سے ایک عورت بدل نہیں جاتی.. جنسی رفاقت کی سینکڑوں راتوں کے بعد.. اگرچہ اُن میں کچھ راتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں وہ حظ اُٹھاتی ہے.. ان کے بعد بھی ایک عورت میں بلَش ہو جانے کی صلاحیت باقی رہتی ہے..''

''اوہ رئیلی..؟'' اُس نے نتالیہ کے ''اوہ رئیلی'' کے امریکی لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے کہا۔

''ہاں.. اور میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں.. ایک ایسا راز جس میں ایک عورت کسی کو بھی شریک نہیں کرتی اور اس کے باوجود میں تمہیں اس اعتماد کے ساتھ بتاتی ہوں کہ اسے سننے کے بعد تم بھی بلَش کر جاؤ گے''

دو ایک مرتبہ پھر ''اوہ رئیلی'' کہنا چاہتا تھا لیکن اُس نے نہیں کہا اور اُس نے کہا ''عمر کے اس حصے میں.. اس عمر میں تو کوئی بھی ہیجان یا حرکت باقی نہیں رہتے.. بلَش کر جانا.. چہرہ سُرخ کر لینا تو نوعمری یا جوانی کا ایک شرمیلا ردِعمل ہے..''

''اس پر تو شرط لگ سکتی ہے.. از دیٹ اے بیٹ..'' نتالیہ نے ہتھیلی کھول کر اُس کے آگے کر دی..

''بہت زیادہ امریکی نہ ہو جاؤ.. وہ بات کرو.. جو بات بھی ہو گی مجھے بلَش کرنے کے

لیے نا کافی ہوگی کہ میں ٹھنڈا پڑ چکا ہوں..تم آزما لو..''

وہ ذرا سی اُس سے الگ ہوگئی' اپنے آپ میں سمٹ گئی..ایک حجاب میں چلی گئی..

پچھتانے لگی کہ اُس نے کیوں ایسا دعویٰ کیا ہے اور پھر حجاب کی اُسی چادر میں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں بولی ''بخاری..اتنی سینکڑوں راتوں اور بعض اوقات دن کی روشنی میں بھی اپنی طوالت اور مردانگی سے مجھے پگھلا نہیں سکا..میں کبھی گیلی نہیں ہوئی.. یہاں تک کہ اپنے آپ کو اذیت سے بچانے کی فکر میں ہمیشہ سائیڈ ٹیبل پر ایک کریم رکھتی ہوں..اپنے اندرون کو نرم کرنے کی خاطر....اور تم...'' وہ خاموش ہوگئی..

''یہ راز کی بات تھی؟''

''نہیں..جب کہ..'' وہ اٹھنے لگی ''جب کہ..میں سُوکھی رہی ہوں آج تک اور.. پہلے روز جب ہم ملے..تو محض تمہاری قربت سے میرے اندر سیلاب آ گیا..تم صرف میری طرف دیکھتے ہو تو مجھ میں نمی پھوٹنے لگتی ہے''

وہ بری طرح بلبلش کر گیا..

حالانکہ اُس نے مصمّم ارادہ کر رکھا تھا کہ اُسے غلط ثابت کرنے کے لیے وہ جتنی مرضی چونکا دینے والی اور کھلی بات کرے گی وہ پتھر کا چہرہ بنائے بیٹھا رہے گا..جنس کی کسی کتاب میں اس قسم کے ردِّعمل کا تو کوئی اشارہ نہ ملتا تھا..وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عورت مکمل شادی شدہ زندگی کے دوران بالکل خشک رہے..ایک راستہ برسوں تک زیرِ استعمال رہے اور اُس کے اندر نمی کی ایک بوند بھی جنم نہ لے..گیلا نہ ہو..اور پھر صرف اُس کی قربت سے...بنا ملاپ کے..وہ..کیا وہ سچ کہہ رہی ہے یا اُسے خوش کرنے کی کوشش میں ہے..

یا پھر یہ ایک اشارہ ہے..

اُس کا..نتالیہ کا چہرہ ایسے سپاٹ تھا جیسے ٹیلی ویژن پر تجارتی خبریں سنانے والی خاتون کا ہوتا ہے اور اُس نے اُسی سپاٹ چہرے سے ایک سپاٹ سا فقرہ بولا ''میں نے شرط جیت لی ہے..''

اُس نے کچھ نہ کہا..چُپ رہا.

شیر دھاڑتا دھاڑتا شائد نڈھال ہو چکا تھا..اُس میں دَم خم باقی نہ رہا تھا..اگر یہ ایک اشارہ تھا تو کیا وہ اب بھی دھاڑ سکتا تھا..یا محض چاؤں چاؤں ہی کرنے کے قابل رہ گیا تھا..

''شرط ہار جانے کو اتنی سنجیدگی سے تو نہ لو..'' وہ اُسی طرح سپاٹ لہجے میں بولی ''اگر مجھے ذرّہ برابر بھی شائبہ ہوتا کہ تم شرمانے کے علاوہ یوں چُپ ہو جاؤ گے تو میں اس کا تذکرہ نہ کرتی..لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ میں...اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کیوں سوچ میں پڑ گئے ہو''

اُس نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا..

''تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں مائل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں..ایک اشارہ دے رہی ہوں..

''نہیں..نہیں''

''ہاں یہ خیال تمہارے ذہن سے گزرا ہے..لیکن میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہیں کوئی اشارہ نہیں دے رہی..میں پچھلے چھ ماہ سے تمہارے ساتھ رہتی ہوں اور اس دوران کوئی ایک لمحہ بھی مجھ پر نہیں آیا جب میں نے جنس کے بارے میں سوچا ہو..ہاں اگر میرا بدن سوچتا ہے تو وہ مجھ سے الگ سوچتا ہے..نمی کی پھوٹ پر میرا اختیار نہیں..اس کے باوجود یہ ایک اشارہ نہ تھا..''

شجر کی بلند ترین شاخوں سے چمگادڑوں کے اُلٹے لٹکتے سیاہ پھریرے چیں چیں کرتے غل مچانے لگے..شائد اُن کے درمیان لمبی دُم والا کوئی غشپ پرندہ اُتر آیا تھا جس کے خوش نظر رنگین پروں کو دیکھ کر وہ حسد میں مبتلا ہو کر شور کرنے لگی تھیں..

پھر وہ گنبد نظر آنے لگا جو آستانۂ رومی کی پہچان تھا اور جس کے نیچے اب اُس کے بابا دفن تھے..

گنبد کی پہلی جھلک نے اُس کے پاؤں کو جکڑ لیا.. اُسے اپاہج کر دیا اور وہ جہاں تھی وہیں رُک گئی' ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکی.. پھر اُس کی آنکھوں کو بھی اُس گنبد نے جکڑ لیا جس کے نیچے اب اُس کے بابا دفن تھے اور اُن میں سے دھاریں پھوٹنے لگیں.. وہ چارے کے ایک ہریا دل کھیت کنارے سر جھکا کر بیٹھ گئی اور رونے لگی.. اپنا دایاں ہاتھ حرکت میں لا کر بہت مدھم آہستگی سے سینہ کوبی کرنے لگی.. جیسے بین کرتی ہو ایسے ایک بھرائی ہوئی مختلف آواز میں کہ یہ اُس کی آواز نہ تھی جس میں وہ بین کرتی تھی.. گنبد کی جانب بایاں ہاتھ بلند کر کے جیسے اُس سے مخاطب ہو کہنے لگی... ''بابا میں تمہارے پاس اس حالت میں کیسے حاضری دوں.. آپ کہیں گے کہ پُتری تو کیا تھی اور کیا ہو گئی ہے..''

وہ اُس کے ماتم میں مخل نہ ہوا نہ اُسے کوئی ڈھارس دی نہ تسلی کا کوئی لفظ اُس کی زبان پر آیا.. اُس کے برابر میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا..

''رُودین.. مجھے سب کچھ بھول چکا ہے.. اپنے جَنے ہوئے بچے بھی.. لیکن سوان نہیں بھولتا... میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں..''

''سوان...'' وہ ایک تھکا دینے والے دن کے بعد.. شیر کی دھاڑ کی گونج کانوں کے پردوں پر ابھی تک لرزتے دن کے اختتام کے بعد بے سکت ہو چکا ایک عمر رسیدہ اونگھ میں تھا جب وہ بھی تھکاوٹ کی ماری ہوئی بے سُدھ ہو رہی تھی تو اُس نے سر اُٹھا کر کہا تھا.. میں اُس سے ملنا

چاہتی ہوں..

''کون سوان...''

''اس کا مطلب ہے تم میرے خطوں کو فراموش کر چکے ہو..''

''پچیس برس پیشتر جو کچھ لکھا گیا تھا کہ میں اُسے حرف بہ حرف یاد رکھ سکتا ہوں..؟''

اُس کے لہجے میں بیزاری تھی..

''اُن میں بابا کے علاوہ سب سے زیادہ ذکر سوان کا ہوتا تھا.. میرے بھائی کا''

''ہاں..'' وہ اپنی اونگھ اور بیزاری سے باہر آ گیا ''سوان.. چھوٹے شاہ جی.. اچھا کھانا کچھ نہ کرنا اور پیر بچوں کی پیروی میں کند ذہن' لڑاکے اور مریدوں کی بے وجہ ٹھکائی کرنے والے چھوٹے شاہ جی..''

''ہاں وہی...''

''مجھے یاد ہے.. مجھے یاد ہے.. جسے ایک پروفیسر نے خراب کر دیا تھا اور وہ کمیونسٹ ہو گیا تھا.. لومبا یونیورسٹی ماسکو میں پتہ نہیں کیا پڑھنے چلا گیا تھا اور وہاں سے تمہیں روسی ادب کے ترجمے بھیجا کرتا تھا' مجھے یاد ہے''

''تم نے.. میرے خطوں کو فراموش نہیں کیا..'' نتالیہ جی اُٹھی..

''نہیں.. ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اَن دیکھے تھے اگر ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو انہی خطوط نے ہمیں وہ بینائی دی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے..'' وہ چُپ ہو گیا..

''میں.. سوان سے ملنا چاہتی ہوں..''

''وہ کیسا ہے.. ان دنوں کیا کر رہا ہے..''

''مجھے نہیں معلوم.. پچھلے بیس برس سے نہیں معلوم..''

''اچھا..'' اُس کا منہ کھل گیا اور زردی میں جو دانت آئے ہوئے تھے وہ دکھائی دینے لگے ''تمہارا رابطہ نہیں رہا.. اپنے اکلوتے اور محبوب بھائی سے؟''

''نہیں.. بیس برس ہو گئے مجھے اُس کی کوئی بھی اطلاع ملے ہوئے.. تم جانتے ہو کہ ہم دونوں میں کیسی زبردست دوستی اور ناقابل یقین حد تک لگاؤ تھا.. ناصر کزن ہونے کے باوجود میری اور اُس کی قربت کو سمجھ نہیں سکتا تھا.. دراصل اُس کے گھرانے میں کسی بھی رشتے سے محبت کرنے کا رواج نہ تھا.. نہ اُس کی ماں نے اُسے کبھی منہ لگایا اور نہ کبھی باپ نے شفقت کا اظہار کیا..''

"یہ کیسے ہوسکتا ہے.."

"ایسا ہوتا ہے..کئی گھرانوں میں ہوتا ہے..لیکن ہم ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے کلیشے پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی اور ردِعمل کو ناممکن سمجھتے ہیں..اُس کے ماں باپ اُسے تمامتر آسائشیں مہیا کرتے تھے لیکن مسلسل ان مہربانیوں کا چرچا بھی کرتے تھے..ماں کسی زمانے میں خوش شکل رہی ہوگی..یعنی میری طلاق شدہ ساس اور وہ چہرے کے پچک جانے کے باوجود.. ذہنی سکون کی گولیاں پھانکنے کے باوجود..کبڑی اور بدہیئت ہونے کے باوجود اپنے نخروں سے باز نہیں آتی تھی..تمہیں پتہ ہے کہ بعض ایسی مائیں بھی ہوتی ہیں جو اپنی سگی اولاد کی خوشی بھی برداشت نہیں کرسکتیں..حسد کی آگ میں جلتی رہتی ہیں...نہیں...یہ نہیں کہ وہ میری ساس تھی اس لیے میں اُس کی بدخوئی کررہی ہوں..نہیں..ناصر بھی بعض اوقات جذبات کی رَو میں بہہ کر اپنی ماں کے بارے میں یہی کچھ کہتا تھا..اُس کی متعدد بہنیں بھی اپنی ماں پر گئی تھیں..نہایت سرد مزاج کی اور چُپ چُپ...تو ناصر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سوان مجھ پر کیوں نثار ہوتا ہے..دن رات ٹیلیفون کرتا ہے.. میری سالگرہ پر..شادی کی اینی ورسری پر تحفے بھیجتا ہے اور میں کیوں اُس سے پہروں باتیں کرتی قہقہے لگاتی آپے سے باہر ہوتی ہوں..اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا..."

"اُس نے تم پر پابندی لگادی.."

"نہیں اُس نے ایک اعتراض کیا.."

"کیا؟"

"وہ ان دنوں مکمل طور پر امریکی ہوچکا تھا اور امریکی اقدار کے مطابق ایک بہن اور بھائی کی قربت..اتنی چاہت اور مسلسل رابطہ اُس کے نزدیک غیر قدرتی تھا..جب تک کہ اُن کے درمیان وہ تعلق نہ ہو جو حرام ہے..اُسے شک نہیں تقریباً یقین تھا کہ میرے اور سوان کے درمیان یہی رشتہ ہے تو اس ہولناک الزام کے بعد میں چُپ ہوگئی..اُس کے فون آتے تو میں اُس کی اُلفت بھری "ہیلو" کو سنتے ہی فون رکھ دیتی..نہ میں نے اس کے کسی بھی خط کا جواب دیا اور جب اُس کا ایک نزدیکی دوست پاکستان سے امریکہ آیا اور میرے ہاں آیا تو بھی ناصر نے اُسے شک کی نظروں سے دیکھا..اُس دوست کی معرفت میں نے سوان کو پیغام بھیجا کہ اگر تمہیں میری خوشی عزیز ہے تو آیندہ رابطہ نہ کرنا..تو میں اُسی سوان کو ملنا چاہتی ہوں رودین.."

شام ہونے کو تھی..

راستہ کچا' دُھول بھرا اور تاریکی میں گم ہونے کو تھا..جس پر وہ تھکے قدموں سے چلتے تھے..

وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں نے کیوں نتالیہ کے ہمراہ یہاں...آستانۂ رومی کی جانب آنے کی حامی بھری کہ اُس کو اب پیدل چلنے کی عادت نہ رہی تھی..اُس کا بدن متحمل نہ ہوسکتا تھا..

لاہور سے چلنے والی ویگن نے اُنہیں آستانۂ رومی سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر اُتار دیا تھا..

"میں ان کھیتوں میں اوس بھرے بُوٹوں پر ہاتھ پھیرتی چلا کرتی تھی.."

اُسے ہر بوٹے ہر پتے کی پہچان ہورہی تھی..

پھر وہ گنبد نظر آنے لگا جو آستانۂ رُومی کی پہچان تھا اور جس کے نیچے اب اُس کے بابا دفن تھے..

وہ اس کے برابر میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب وہ رونے دھونے اور اپنے ماتم سے فارغ ہو اور کب وہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں..

وہ اُسے پہلی بار روتے ہوئے دیکھ رہا تھا...

ایک عورت چاہے مکر اور فریب میں اپنی بات منوانے کی خاطر روئے یا سچائی اور سنجیدگی سے روئے..اُس کے آنسو برداشت نہیں ہوتے..لیکن رُودین بے اثر اور لاتعلق رہا..اُس کے ماتم میں مخل نہ ہوا..اُس کے برابر میں بیٹھا انتظار کرتا رہا..تا آنکہ نتالیہ کے آنسوؤں میں تسلسل باقی نہ رہا اور پھر اُس نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "اب چلو..ہمیں لاہور واپس بھی پہنچنا ہے.."

اُن سب نے جو خانقاہ کے گنبد تلے سر جھکائے تعظیم اور عقیدت میں سرنگوں ہوئے بیٹھے تھے اُن دونوں کی آمد کو محسوس کیا سر اُٹھا کر انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر سر جھکا لیے..بابا کی قبر کے سرہانے اُس کے ساتھ ٹیک لگائے..سبز عبا جس کے کناروں پر گوٹے کی جھالر تھی' سبز عمامے میں ملبوس ایک ایسی داڑھی کے ساتھ جس کے بارے میں مرید کہتے تھے کہ یہ بابا کی داڑھی سے بے حد مشابہت رکھتی ہے وہ بھی سر جھکائے عالم استغراق میں تھا..بھاری پپوٹے بند تھے اور کبھی

کبھار اُس کے تن وتوش کو ایک جھٹکا سا لگتا اور پھر سے ساکت ہو جاتا..

نرم نرم سفید نورانی داڑھیوں والے چند خانقاہی درویش اُس کے قدموں میں بیٹھے زیرلب کچھ پڑھ رہے تھے..اُن کے ہاتھوں میں قدآدم تسبیحاں تھیں جنہیں وہ پھرول رہے تھے..

خانقاہ سے ملحقہ ایک حجرے میں مٹھائی کے کھلے اَن کھلے ڈبوں اور پوٹلیوں کا ایک انبار تھا جو چھت تک پہنچنے کے بعد دروازے کے راستے خانقاہ کے فرش پر آ چکا تھا..مٹھائیوں کے اس ڈھیر پر بے اَنت مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں..گنبد تلے انسانی آوازوں کی مدھم لے کے ساتھ یہ بھنبھناہٹ بھی گونجتی تھی..

اُنہیں اُس کی قربت حاصل نہ ہو سکتی تھی کہ درجنوں مرید..اُن میں اُجڈ دیہاتی بھی تھے اور شہر سے آئے ہوئے پڑھے لکھے لوگ بھی..بڑی تعداد عورتوں کی تھی..اور یہ سب راستے میں حائل محوِ عبادت تھے اس لیے وہ دروازے کے قریب ہی جوتیوں کے پاس بیٹھ گئے..

خانقاہ کا اندرون مختصر تھا اس لیے حکم تھا کہ جونہی کوئی اور مرید اندر داخل ہو تو پہلے سے موجود زائرین میں سے کوئی ایک باہر چلا جائے..چنانچہ نتالیہ اور رُودین کے اندر آتے ہی دو مرید ناگواری سے اُٹھے اور اُن پر ناپسندیدگی کی نظریں ڈالتے باہر چلے گئے..

''رُودین..یہ سوان تو نہیں ہے..'' نتالیہ نے سبز عبا اور عمامے میں ملبوس محوِ استغراق شخص کو تادیر دیکھنے کے بعد سرگوشی کی..

وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ تلملا گیا ''میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ یہ سوان ہے یا نہیں' یہ جو بھی ہے اُسے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں..تمہیں پتہ ہونا چاہیے''

''سوری..''

وہ ایک سیاہ چادر کی بُکل مارے اُسے اپنے چہرے پر کھینچے آبدیدہ ہونے کے قریب اُسے تک رہی تھی جسے پہچاننے میں اُسے دشواری ہو رہی تھی..وہ اگر سوان تھا تو پہلے سے تگنی جسامت کا ہو چکا تھا اور اُس کی سبز عبا کا گھیرا بابا کی قبر پر بچھا جاتا تھا..گھنی داڑھی میں اُس کے نین نقش پوشیدہ ہو رہے تھے اور ہاں یہ داڑھی بابا کی ہی تھی..وہی ملائمت اور گھنا پن صرف اس کی سفیدی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی' کہیں کہیں سیاہ بالوں کی لٹیں موجود تھیں..کیا سچ مچ کبھی ایسا ہوا تھا کہ اُس نے بابا کی داڑھی میں سے ننھے منے مختصر رنگ برنگے پرندے برآمد ہوتے دیکھے تھے جنہوں نے خانقاہ کے گنبد کو بھر دیا تھا..وہ اُس کے استغراق پر نظریں جمائے تکتی رہی..اور وہ اُس

سے بہت دُور آنکھیں بند کیے بابا کی قبر کے سرہانے سے ٹیک لگائے اپنے آپ میں گم بیٹھا رہا..

اُس کا جی چاہا کہ وہ مریدوں کو روندتی ہوئی اُس کے قریب جا کر اُس سے لپٹ جائے اور کہے..سوان..اگر تم سوان ہو تو..تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے..کیا بھیس بنا رکھا ہے..تم ایسے کیسے ہو گئے..تمہارے نظریات کیا ہوئے..تم ہی نے تو مجھے آزاد کیا تھا..اسی خانقاہی نظام کو ڈھا دینے کی جستجو اور آرزو کی تھی..اور اب...

دبے پاؤں کوئی مرید خانقاہ کے دروازے میں سے داخل ہوا..فرش پر سر جھکائے ہجوم میں سے جھکا ہوا اُن کے کندھوں پر معذرت کے ہاتھ دھرتا راستہ بناتا بمشکل اُس تک پہنچا اور مٹھائی کا ایک ڈبہ اُس کے قدموں میں رکھ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا..وہ دیر تک کھڑا رہا اور پھر جھک کر ایک مؤدب اور بھرائی ہوئی آواز میں درخواست کی ''پیر مٹھا..سرفراز فرمائیں''

پیر مٹھا...نتالیہ کے ذہن کے تاریک کونوں میں ایک جھماکا سا ہوا..تب بھی لوگ کہا کرتے تھے کہ چھوٹے شاہ جی میں جو بابا کے پردادا تھے شائد اُن کی روح ہے ویسی ہی طبیعت ہے اور سوان اس موازنے پر ہنسا کرتا تھا اور کارل مارکس کے پیروکار کی حیثیت میں اس گئے گزرے زمانوں کے پیر مٹھا کے بارے میں سخت نازیبا الفاظ استعمال کیا کرتا تھا..

مرید کھڑا کھڑا تھک گیا اور پھر جھک کر التماس کی ''شاہ جی بڑی دُور سے آیا ہوں پینڈے مارتا..گوجر خان کے گلاب جامن اور پیڑے ہیں..سرفراز فرمائیں''

''ڈبہ کھول..ڈبہ کھول..'' نو وارد کے آس پاس بیٹھے لوگوں نے سرگوشی کی..

نو وارد گھبرا گیا مگر فوراً ہی سنبھل گیا اور قدموں میں سے ڈبہ اٹھا کر اُسے لرزتے ہاتھوں سے کھولا اور شاہ صاحب کے آگے کر دیا ''میری حیاتی سنور جائے گی پیر جی..عاقبت سنور جائے گی..چکھ لیں..گوجر خان کی مٹھائی ہے..''

تب اُس نے اپنے بھاری پپوٹے اُٹھائے اور اُس کی آنکھیں جیسے راتوں کو جاگنے والوں کی طرح نیم سرخ ہوتی ہیں وہ پہلی بار کھلیں اور نتالیہ نے اُس لمحے اُسے پہچان لیا..بابا کی داڑھی میں سوان کی آنکھیں جوں کی توں محفوظ تھیں..

سوان نے کھلی آستین میں سے اپنا ہاتھ بڑھا کر یہ جانے بغیر کہ اُس کے سامنے کون کھڑا ہے ایک خوابناک حالت میں ہاتھ بڑھا کر ایک گلاب جامن اٹھایا اور اپنے منہ میں رکھ لیا..

نو وارد مرید خوشی سے کانپنے لگا' اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے..وہ جھکا ہوا پیچھے

ہوا..ایک دو مریدوں کے سروں سے ٹکرایا..اور پھر مٹھائی کا ڈبہ حجرے میں سے اُمڈتے مٹھائی کے ڈبوں کے انبار میں رکھ کر سب سے پیچھے رُودین اور نتالیہ کے پیچھے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور اُس کی چوکھٹ پر سر رکھ کر گریہ کرنے لگا..

تو وہ سوان ہی تھا..

''یہ سوان ہی ہے..'' نتالیہ نے اُسی انداز میں سر جھٹکا جیسے وہ اپنی پسندیدہ بیس بال ٹیم کو ٹیلیویژن پر سکور کرتے دیکھ کر پُر مسرت ہو کر جھٹکتی تھی ''اُس کی آنکھیں نہیں بدلیں۔''

اور وہ اپنی گھڑی پر بار بار نگاہ کرتا تھا کہ ہم یہاں رات تو بسر نہیں کر سکتے ابھی ہمیں تاریکی میں کچے راستے پر تین چار کلومیٹر پیدل مسافت کر کے بس سٹینڈ تک پہنچنا ہے اور پھر کہیں صبح سویرے لاہور کے نواح دکھائی دیں گے..اس متوقع سفر کی صعوبت وہ ابھی سے محسوس کرتا تھک رہا تھا..لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے اُن کا یہی خیال تھا کہ اگر تو سوان کہیں نقل مکانی نہیں کر گیا اور خانقاہ کے آس پاس اپنی حویلی میں ہی مقیم ہے تو وہ یہ رات اُس کے ہاں گزاریں گے اور اگلی سویر لوٹ جائیں گے..لیکن یہاں سوان نہ تھا..پیر مٹھا بیٹھا تھا جو صرف سوان کی آنکھیں سنبھالے ہوئے تھا اور ان دونوں کی موجودگی سے بے خبر تھا..آنکھیں بند کیے بابا کی قبر کے سرہانے سے ٹیک لگائے جیسے ایک حالت خمار میں ہو اُن کی موجودگی سے بے خبر بیٹھا تھا..

گنبد کے درمیان میں سے زنجیر سے اُترتے ایک فانوس کی روشنی تھی جو شائد اُس آمر کی عطا تھی جو ایک زمانے میں بابا کی قدم بوسی کو آیا تھا اور اگربتیوں اور تیز عطر کی مہک میں مریدوں کی بڑبڑاہٹ اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایک ہلکی گونج کا سبب بنتی تھی..

اپنی سیاہ چادر کی اوٹ میں سے نتالیہ ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھتی رہی..

کبھی وہ بھول چکے فراموش شدہ زمانوں کی آستانہ رُومی کی نوخیز پُتری ہو جاتی..لاڈلی اور نوخیز اپنے حسن کے زعم میں سیاہ بنگالی بالوں کو شانے پر پھیلائے نہانے کے بعد سکھانے کے لیے نرگسیت کے آئینے تھامے سوان کی عطا کردہ آزادی کی آڑ میں رُودین کو خط لکھتی..اپنے پپوٹے سونگھتی جن میں سے لہسن اور پیاز کی بُو جاتی ہی نہ تھی' اُنہیں بابا کے باتھ روم میں طرح طرح کے ولایتی صابنوں سے دھوتی اور پھر سے اپنے پپوٹوں کو سونگھتی جن میں سے وہ مہک جاتی ہی نہ تھی اور کبھی جب سوان ماسکو سے لوٹا تھا تو اُس نے ایئرپورٹ سے اُتر کر قدرے بے رُخی کی تھی اُسے ملا نہیں تھا محض اُس کے کندھے تھپکے تھے اور پھر بقیہ رشتہ داروں سے گلے ملنے میں لگ گیا تھا اور

جب وہ دونوں ایک کمرے میں بالآخر تنہا ہوئے تھے تو وہ چیخیں مارتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی تھی اور وہ ہنس ہنس کر کہتا تھا..''ڈیئر کامریڈ کیا حال ہے..ہم دونوں مل کر ایک انقلاب لائیں گے اس خانقاہ کو ڈھا دیں گے..''

اور کبھی وہ اُسے..سوان کو تکتی..سبز لبادے اور عمامے میں آنکھیں بند کیے ہوئے تکتی' کانونٹ کے برآمدوں میں چلنے لگتی..

اور پھر یکدم ہی ایک بوڑھی..بچوں والی طلاق یافتہ عورت ہو جاتی..

بہت کچھ ہوتی..لیکن کبھی وہ ایک پل کے لیے بھی اُن دنوں میں نہ جاتی جو اُس نے ناصر بخاری کے ساتھ بسر کیے تھے..

یا تو وہ ماضی کے دُھندلکوں میں بسیرا کرتی اور یا پھر وہ حال کی تھکاوٹ میں آ جاتی..درمیان میں کہیں نہ رُکتی..

ناصر اور اُس کے درمیان جو حیات بسر ہوئی..پچیس برس بسر ہوئے اُن برسوں کا ایک لمحہ بھی کسی تصویر میں فوکس نہ ہوتا..یہاں تک کہ اس تصویر میں اُس کا کوئی ایک بچہ بھی نہ اُبھرتا..

اپنے خمار میں مست بابا کی قبر کا آسرا لیے سوان آنکھیں بند کیے..اگر آنکھیں کھولتا تب بھی مریدوں کے اُس ہجوم کے آخر میں خانقاہ کے دروازے کے پاس جہاں جوتیاں پڑی تھیں وہاں اُس نیم تاریکی میں ایک سیاہ چادر اوڑھے ایک عورت اُسے کہاں نظر آتی اگر نظر آ بھی جاتی تو پہچان کہاں سے آتی..جانے خمار کی اس حالت میں پہچان کی صلاحیت باقی بھی تھی یا نہیں..

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے تکتی رہی..

وہ اس گاؤں کی سیدزادی شہزادی ہوا کرتی تھی..

باپ کے مرنے کی خبر اُس سے چھپائی گئی کہ پردیس میں اُس کے آنسو کون پونچھے گا اُسے کون سنبھالے گا...کوئی دُور پار کا عزیز مہینوں بعد اُن کے ہاں آیا تو اُس نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے..ماں کے رُخصت ہونے پر کسی بچے کے ہائی سکول کے اشد ضروری امتحان تھے اُس نے سوچا میں چہرہ تو اب دیکھ نہیں سکتی اگلے ہفتے چلی جاؤں گی..اگلے ہفتے ناصر نے جوان دنوں سراسر امریکی ہو چکا تھا کہنے لگا..اور وہ بے حد ہمدرد تھا..جتنی رقم تم آنے جانے پر خرچ کرو گی کیا یہ بہتر نہیں کہ اتنی رقم میں تم اپنی گاڑی بدل لو..تم اب اُن کا چہرہ تو دیکھنے سے رہی..قبر کی مٹی دیکھنے کے لیے اتنی تگ و دو اور خرچہ میری سمجھ میں تو نہیں آتا..اور اُسے..لاہور سے چلتے ہوئے بھی یہ

خیال نہ آیا.. یہاں اتنی دیر بیٹھے رہنے کے باوجود اپنے گاؤں میں ہونے کے باوجود اُسے خیال نہ آیا کہ گاؤں سے ملحقہ قبرستان جس کے قریب سے وہ کچا راستہ گزرا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے تھے.. وہاں اُن کی قبریں تھیں.. اور وہ اُن تک نہیں گئی تھی.. خیال ہی نہیں رہا تھا.. جن کے بغیر چین نہ آتا تھا' ایک لمحے کے لیے نظروں سے اوجھل ہوتے تھے تو وہ بلکنے لگتی تھی.. وہ اُن کی مٹی کے برابر میں سے ہو کر گزر گئی تھی..

اُس کے لیے سوان ہی وہ دھاگا تھا جس نے اُسے آستانہ رُومی سے باندھ رکھا تھا.. واحد کشش تھی..

اور وہ اُسے پہچان نہیں رہا تھا.. آنکھیں کھولے تو پہچانے!

یہ وہ سوان تو نہ تھا.. تیز چمکیلی آنکھوں والا انقلابی جو معاشرے کی بوسیدہ اقدار کو ردّ کر کے ایک مثالی نظام کے خواب دیکھتا تھا.. جو خانقاہی نظام کو افیون قرار دے کر اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا.. اُسے یقین تھا کہ پچیس برس بعد جب وہ گاؤں میں داخل ہوگی تو وہ اپنے انقلابی نظریات پر قائم و دائم شائد ایک ٹریکٹر پر سوار اپنی زمینوں میں جدید زراعت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے نت نئی فصلیں اگا رہا ہوگا.. باغ لگاتا ہوگا.. اور اُسے دیکھ کر وہ ٹریکٹر سے چھلانگ لگا کر اُترے گا اور اُسے گلے لگا کر کہے گا.. ہیلو کامریڈ! اتنا عرصہ کہاں رہے.. اُسے یقین تھا کہ سوان ایسا ہی ہوگا..

سوان کے پیر مٹھا ہو جانے.. پر اُسے ایک دھچکا لگا تھا.. وہ ابھی تک اس کی شدت کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہو رہی تھی..

ویسے اس سوان کو بھی اگر یہ علم ہو جائے کہ وہ اپنے بال بچے ترک کر کے ایک غیر مرد کے لیے پاکستان چلی آئی ہے اور اُس کے ساتھ نکاح کے بغیر رہتی ہے تو اُسے بھی دھچکا لگے..

ہاں اُن دنوں جب وہ تغیر اور مکمل تبدیلی کی جدوجہد میں جُتا ہوا تھا اُن دنوں اگر ایسا ہوتا تو شائد وہ اُس کی صورت حال سے اتفاق کر کے اُسے قطعی طور پر موردِ الزام نہ ٹھہراتا..

اُس نے تو اُسے ڈولی میں بٹھانے سے پیشتر.. اگرچہ اُن دنوں بھی دولہنوں کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرنے کا رواج متروک ہو چکا تھا لیکن خاندانی روایت کے تسلسل میں اُسے ڈولی میں بٹھا کر ہی سسرال بھیجا گیا.. تو سوان نے اُسے ڈولی کی کال کوٹھڑی میں دھکیلنے سے پیشتر کہا تھا.. کامریڈ گھبرانا نہیں.. ناصر بخاری ہمارا عزیز ہے' خالہ زاد ہے اور تمہاری خواہش رکھتا ہے' مجھے پورا

بھروسہ ہے کہ وہ تمہیں خوش رکھے گا.. لیکن یہ یاد رکھنا کہ تم ایک جانور نہیں ہو.. انسان ہو.. اپنی عزت نفس کو مجروح نہ ہونے دینا.. ظلم اور زیادتی کو ایک حد تک سہنا.. نہ سہہ سکو تو ایک جانور کی مانند اطاعت اختیار نہ کرنا.. آزاد ہو جانا..

اب وہ آزاد ہوئی تھی تو سوان پیر مٹھا میں قید ہو چکا تھا..

''نتالیہ..'' ایک سرگوشی میں اُس نے پکارا.. وہ متوقع سفر کی تھکاوٹ سے تھکا ہوا بیزار ہو چکا تھا اور وہ جان گئی کہ اب وہ جانا چاہتا تھا.. اور اُسی لمحے اُس نے پھر سرگوشی کی ''چلیں..''

اور اُسی لمحے اس خیال نے اُسے جھنجوڑ کر رکھ دیا.. اس کی ہولناکی نے اُسے خوفزدہ کر دیا کہ وہ ابھی اُٹھے گی اور سوان سے بات کیے بغیر خانقاہ کے دروازے میں سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی اور اُس کا تن بدن جانتا تھا کہ یہ آخری بار ہے کہ وہ سوان کے سامنے ہے.. اب گنجائش نہیں ہے اور اسی لمحے وہ اپنی خوفزدگی سے یکسر نکل گئی.. کچھ اور ہو گئی.. گئے زمانوں کی آستانہ رُومی کی نوخیز پُتری ہو گئی لاڈلی' اپنے حسن میں مگن' اپنے پپوٹوں کو سونگھتی.. پچیس برس کی جھرّیاں اُس کے چہرے سے زائل ہو گئیں.. گھٹنوں کا درد بھی باقی نہ رہا' اتنی نوخیز اور بیباک ہو گئی.. وہ یکلخت اُٹھی.. ایک بے نیازی اور بے پروائی کی کیفیت میں سیاہ چادر کو سر سے اتارا' صرف کندھوں پر رہنے دیا اور اپنے آگے سر جھکائے ہجوم میں سے تحمل سے راستہ نہ بناتی بلکہ اُن پر ٹاپتی.. انہیں بیدردی سے دھکیلتی' مسکراتی بے نیاز کھلکھلاتی اُس کے قدموں میں جا بیٹھی..

''سوان...'' اُس نے اُس کا سبز لبادہ پکڑ کر جھنجوڑا..

وہ بے حرکت رہا.. اُسی غنودگی میں گم پڑا رہا..

''ہیلو کامریڈ...''

سوان نے مُندھی ہوئی لال بھوٹی آنکھیں کھول دیں..

''کون؟''

''میں...''

''مٹھائی لائی ہو؟''

''سوان.. یہ میں ہوں..''

''نہیں لائی تو یہاں کیا کر رہی ہو پیر مٹھا کے قدموں میں..''

نہ اُس کی سرخ آنکھوں میں کوئی ڈورا تھا شناسائی کی.. نہ اُس کے داڑھی میں نیم پوشیدہ

چہرے پر پہچان اور جان لینے کا کوئی شائبہ تھا.. اُس کے بھاری پپوٹے پھر سے بند ہو گئے.. بابا کی قبر کے سرہانے سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ ذرا کھسکا اور پھر سنبھل گیا اور اُسی عالم مدہوشی میں چلا گیا..

نتالیہ نے کندھوں پر ڈھلکتی چادر کو سنبھال کر سر پر اوڑھا اور اُنہی قدموں پر واپس ہو گئی..

نصف شب کی تاریکی میں وہی کچا راستہ تھا جس پر چل کر وہ آئے تھے.. جو کہیں کہیں دکھائی دے جاتا تھا.. جب پیر مٹھا کی قرأت کی گونج اُن تک پہنچنے لگی.. نہ وہ کہیں لڑکھڑاتا تھا' نہ ڈولتا تھا اور نہ ہی اُس کی زبان نشے سے بھاری ہو کر اُس کا ساتھ چھوڑتی تھی.. وہ بلند آہنگ میں مصری لہجے میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا جس کی گونج اُن کا پیچھا کر رہی تھی..

''الا تزرو و ازرۃ و زراخری وان لیس لا انسان الا ماسعی''

اُن دونوں کی حیات صرف اس لیے تھی کہ وہ ایک اختتام کے منتظر تھے... اور اسے حیات نہیں محض انتظار کہا جاتا ہے..

دونوں دراصل اپنی اپنی حیات بسر کر چکے تھے..

ایک شب جب وہ اپنے اپنے مخصوص صوفوں پر بیٹھے بہت دیر سے ایک دوسرے سے لاتعلق' ٹیلیویژن کے اَسّی چینل کلک کلک کرنے کے بعد کسی ایک چینل پر بھی کوئی ایسا پروگرام نہ پا کر جو دیکھنے کے لائق ہو وہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوئے..

''رُودین..''

''ہاں میں سن رہا ہوں..''

''زندگی کیا ہے؟''

''بس یہی..''

''اور کیا خدا ہے؟''

یہ وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی ہے.. شائد پچھتاتی ہے کڑھتی ہے کہ وہ یہاں کیوں آئی ایسے سوال پوچھتی ہے جو کم از کم ایک سیدزادی کو تو نہیں پوچھنے چاہئیں.. کم از کم عمر کے اس حصے میں..

''اُس کا بھید تو آج تک کوئی نہیں پا سکا.. دانش اور شعور کی کائناتوں کے مالک اس بھید کی جستجو میں خوار ہوئے' میں تو اُن کی نسبت ایک ذرّے سے بھی کمتر ہوں تو بھلا میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ ہے یا نہیں''

''میں تمہیں بتا سکتی ہوں..''

''ہاں..کہو''

''زندگی..رفاقت' ہمسائیگی اور عشق کے سوا کچھ بھی نہیں''

''اور خدا؟''

''وہ تم خود ہو..'' وہ ایسے بیان دے رہی تھی جیسے اُسے اپنی صداقت پر مکمل یقین ہو''تم..''

''میں..''

''ہاں..تم..ایک وجود...تم جس بھی عقیدے پر قائم ہو جو محض تم نے وراثت میں حاصل کیا ہے..صدق دل سے اُس پر ایمان رکھتے ہو تو اُس عقیدے کا خدا تم خود تخلیق کرتے ہو..اور وہ خدا ہوتا ہے..''

''ورنہ نہیں ہوتا..''

''نہیں..صرف ماننے والا اُسے یہ درجہ دیتا ہے..بلکہ عطا کرتا ہے..افراد کی تعداد اُس خدا کی بڑائی کا تعین کرتی ہے..''

''غم حسین بھی کیا ایک خدا ہے؟''

''ہاں ہے..میرے لیے ہے''

''اور اس کے باوجود تم ایک صلیب اٹھائے پھرتی ہو..''

''ہاں..منصور کا اناالحق یہی تھا..میں نے اُس کے ترجمہ شدہ خطوط پڑھے ہیں جو امریکہ میں روحانیت کی تلاش میں بھٹکتے' کبھی گورو رجنیش اور کبھی مولانا رُوم کے کلام میں پناہ لینے والوں میں بے حد مقبول ہیں..اُس کے خطوط پڑھ کر اُس کا ''میں ہی حق ہوں'' پر یقین رکھنا قریب از قیاس لگتا ہے رُودین..اگر اُس نے مجھے بنایا ہے' بھیجا ہے اور تخلیق کیا ہے اور مجھ میں وہ دانش پھونکی ہے جو مجھے ایک صلیب پہنا دیتی ہے' ایک رُودین کے لیے زندگی وقف کر دینے یا شاید ضائع کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے تو یہ سب کچھ اُسی کا کیا دھرا ہے..اگر وہی کوزہ گر ہے تو کوزے کو کیا اختیار کہ وہ کون سی شکل اختیار کرتا ہے' اُسے جیسے ڈھالا گیا وہ شکل اختیار کرتا چلا گیا..اور پھر اُس نے اُس کوزے کو زندہ کیا..کیسے؟ اپنی رُوح پھونک کر..تو وہ کوزہ کیا ہوا؟ وہ کوزہ گر کی ذات کا ایک پرتو ہوا' ایک ذرّہ ہوا..تو اُس ذرّے میں اگر اُس کی پھونک ہے تو گویا وہ خود ہے..تو وہ ذرّہ اگر اپنے آپ کو اُسی کا ایک حصہ سمجھ لے تو اس میں اُس کا تو کوئی دوش نہیں..''

اُس کے گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ نتالیہ اپنی سوچ اور جستجو میں اتنی آگے نکل گئی ہے..کہیں ایک ڈھلتی عمر کے رُودین کے لیے سب کچھ چھوڑ کر آ جانا محض ایک بہانہ تو نہیں..اور وہ دراصل کسی اور تلاش میں ہے..اُس کے اندر کوئی اور کُھدبُد ہے جس نے اُسے ہر شے یہاں تک کہ اولاد کو بھی تیاگ دینے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ محض ایک بہانہ ہے..اُس کی کوئی حیثیت نہیں' اُس کا اصل عشق جس کے ہاتھی تلے وہ روندی جا چکی ہے' کھوج ہے..

''یہ سب کچھ اتنا سادہ اور آسان نہیں نتالیہ..ورنہ ہم دونوں سے پیشتر جو کھربوں لوگ گزر چکے وہ کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ ہی جاتے..اور وہ نہیں پہنچے اس لیے ہم بھی بھول بھلیوں میں گم ہیں''

''تم نے غم حسین کا ذکر کیا تھا..ہاں..یہ مجھے آسودگی دیتا ہے..اُس کے لیے آنسو بہاتی ہوں تو میرے دُکھ کم ہوتے ہیں..اُس کی بے بسی کا تصور کرتی ہوں تو میرا بدن کانپنے لگتا ہے..مجھے اُس کا آسرا چاہیے..میں خاک کربلا کا ایک ذرّہ ہوں..وہی جو اپنے اندر پھونکی ہوئی پھونک سے شہ پا کر ''اناالحق'' کا نعرہ لگاتا ہے..''

''تو ہر کوئی جو اس دنیا میں سانس لیتا ہے ہر فرد اپنا خدا خود تخلیق کرتا ہے؟''

''نہیں ہر شخص قادر نہیں ہوتا..بیشتر لوگ جہالت اور حماقت میں گم اس جہان سے گزر جاتے ہیں اور چند ایک ہوتے ہیں جو اُس کی پھونک کو محسوس کر لیتے ہیں..وہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں اور اُن کے لیے کوئی روز حشر نہیں ہوتا اور جو سوچتے اور سمجھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اُن کے لیے ایک اور زندگانی ہوتی ہے''

''تمہیں مکمل بھروسہ ہے کہ تم اُن لوگوں میں سے ہو جو...''

''ہاں..اس لیے کہ اس لمحۂ موجود میں میں تم سے اُس کوزہ گر کی باتیں کر رہی ہوں جس کی پھونک میرے اندر مجھے یہ حوصلہ دیتی ہے..میں ہوں اُن لوگوں میں سے...''

وہ بہت کم باہر نکلتے..

نتالیہ ایک ایسا کھنڈر تھی جس کی ہر بُھرتی مسمار ہوتی اینٹ کو وہ نہایت انہماک کے ساتھ صاف کرتا جھاڑتا تھا اور اُس کی قدامت کا اندازہ کرتا تھا لیکن اُس کا بُرش بار بار اُس کی صلیب پر اٹک جاتا تھا اور اُس کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا تھا..کانونٹ کے ٹھنڈک بھرے برآمدوں اور راہباؤں کے لبادوں کی سرسراہٹ میں..اور اپنے بابا کی خانقاہ میں سلگتی اگربتیوں کے مرغولہ دھویں

میں سانس لینے والی لڑکی...اب ایک ڈھلتی عمر کی عورت اتنے ذرّوں میں بکھر چکی تھی..اور ہر ذرّے میں کوزہ گر کی پھونک بھری تھی..وہ اتنی بکھر چکی تھی کہ اُسے سمیٹنا کم از کم اُس کے لیے تو ممکن نہ تھا..

وہ بہت کم باہر نکلتے

نتالیہ ایک پرندہ تھی..

وہ اُس جھیل پر آ گری تھی جہاں پرندے مرنے کے لیے آ جاتے ہیں..

یکدم آسمان سے گر پڑی تھی..

اُس کے پاس' اس گھر میں اور اپنے بستر پر پھڑ پھڑاتی تھی..وہ الگ الگ کمروں میں نیند کرتے تھے..ایک دوسرے سے پوشیدہ..جھیل الگ اور وہ پرندہ الگ جو اُس میں مرنے کے لیے اتنی دُور سے آیا تھا..

راتوں کو وہ اُس کی آہٹ سنتا تھا..وہ اپنے کمرے میں چلتی پھرتی تھی' اپنے بچھڑے ہوئے بچوں سے باتیں کرتی تھی..وہ اُس کے بیڈروم کے دروازے کے ساتھ کان لگائے سنتا تھا لیکن اندر نہیں جاتا تھا' اندر ایک سیدزادی تھی جس کا احترام اُس پر واجب تھا..وہ بچوں سے باتیں کرتی تھی اور پھر یکدم طویل خاموشی میں چلی جاتی تھی..وہ سوچتا شائد سو گئی ہے' جانے کو ہوتا تو پھر اُس کی آواز آنے لگتی لیکن سرگوشیوں سے بھری اور حیرت در حیرت وہ پچیس برس پیشتر اُسے لکھے جانے والا کوئی خط دوہرا رہی ہوتی جیسے وہ خط اُس کے سامنے دھرا ہوا اور وہ اُسے پڑھ رہی ہو..کسی کو سنا رہی ہو..

جھیل الگ اور پرندہ الگ..

وہ ایک ایسی جھیل تھا جس پر ایک پرندہ مرنے کے لیے آ گیا تھا..

پرندے کے گلے سے ایک صلیب لٹکتی تھی..

وہ دُور دیسوں سے لمبی اُڑانیں کرتا منطق الطیر کے پرندوں کی مانند صحراؤں سمندروں اور بیابانوں پر اُڑتا بڑی دِقت سے اُس جھیل تک پہنچا تھا...مرنے کے لیے..

نتالیہ کو مرے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے..

اُس کی موت کی کوئی تفصیل نہ تھی..یہ بتا دینا کہ موت ہو چکی ہے اور پھر اُس کی تفصیل بیان کرنا حماقت ہے..ڈرامے کا اختتام پہلے سے بتا دینا اور پھر تماشائیوں کو تھیٹر ہال میں دو گھنٹے بٹھائے رکھنا حماقت ہے..

نتالیہ اُس سے اگلی سویر مردہ ہو چکی تھی جب پہلی بار اُن دونوں کے درمیان سوائے صلیب کے کچھ حائل نہ ہوا تھا..

اُس نے جب شیر دھاڑا تھا تو درست کہا تھا کہ وہ ایک سیلاب کی زد میں آ گیا تھا..اُس میں اس قدر پانی تھے پچیس برس کی شادی شدہ زندگی کے رکے ہوئے پانی جن کو بہاؤ نصیب نہیں ہوا تھا..ناخوشی کے بند کے روکے ہوئے..اُس کا وجود ان پانیوں میں کھو چکا تھا اور وہ کناروں کو محسوس نہیں کر پا رہا تھا..اس سیلاب میں ڈوبتے ہوئے چاندی کی صلیب ہی وہ تنکا تھی جس کا سہارا وہ لے سکتا تھا..

وہ اُس کی قربت میں سمٹی لرزتی تھی اور اُس کی سانسیں اُکھڑتی ہوئی لگتی تھیں..

''میں ٹھیک ہوں..'' جب اُس نے فکرمندی سے کہ بے ربط اور اُکھڑتی سانسوں میں فرق

ہوتا ہے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا کہ نتالیہ تم ٹھیک تو ہو.. تب اُس نے جواب دیا تھا..

''رُودین..''

''ہاں...''

''میرا نام لو..''

''نتالیہ..''

''رُودین.. شیر دھاڑتا ہے.. اُس کی دھاڑ میرے قریب آتی چلی جاتی ہے''

ہر سُو خاموشی تھی..

شہر کے ہول کے درمیان رات کے اس پہر ایسا سناٹا تھا کہ اگر ایک مردہ پرندہ بھی اُن کے درمیان آ گرتا تو اُس کے گرنے کی آواز بھی پورے شہر پر اپنے مُردہ پَروں کے ساتھ سائیں سائیں کرنے لگتی.. ایسا سناٹا تھا..

''میں اُس سنہری بالوں والے اجنبی کو دیکھ رہی ہوں جو اُس شب بابا کے ڈیرے پر سر جھکائے بیٹھا تھا.. ذرا میری اُنگلیاں.. اس نے اپنا ہاتھ اُس کے چہرے پر پھیلا دیا'' ان میں سے ادرک اور لہسن کی بُو ابھی تک آ رہی ہے ناں.. جو انہیں چُومتی ہوئی مریدنیاں چھوڑ جاتی تھیں.. سونگھو''

اور اُن میں وہ تھی.. بہت واضح بہت تازہ ''ہاں نتالیہ''

''میں اپنے کانونٹ کے برآمدوں میں چل رہی ہوں.. راہباؤں کے لبادوں کی سرسراہٹ میرے گالوں کو چھوتی ہے لیکن وہ فوارہ دُھندلاہٹ میں ہے.. میرا خیال ہے کہ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سفید مجسمہ تھا یا مریم بی بی کا تھا..''

''تم ٹھیک ہو ناں..''

''ہاں.. تم کیوں بار بار پوچھ رہے ہو کہ میں ٹھیک ہوں..''

''تمہارا بدن بری طرح لرزش میں ہے نتالیہ اور تمہارے سانس..''

''شائد اس لیے رُودین کہ کہ مجھے آج تک کسی ذی رُوح نے نہیں چھوا اور اب میں تم سے جُڑی ہوئی ہوں.. یاد ہے شادی کی رات جب میں نے خواہش کی تھی کہ میں کسی غیر مرئی اور جناتی عمل سے اُس لمحے تم تک پہنچ جاؤں اور کہوں کہ Do not spare me.. تو یہ وہی لمحہ ہے.. میں تم تک پہنچ چکی ہوں.. And you did not spare me, thank you.. رُودین..''

وہ ایک ہذیانی کیفیت میں بولتی چلی جا رہی تھی.. کبھی مسرت کے ایک مختصر وقفے میں چُپ ہوتی.. کبھی لحظہ بھر کے لیے اُس کا منہ کھل جاتا اور وہ پھر بولنے لگتی..

''تم تو جانتے ہو کہ میرے بال کتنے گھنے اور سیاہ ہوا کرتے تھے ایڑھیوں تک آتے تھے بنگالنوں کی طرح.. یہ میری بیماری کی نذر ہو گئے.. تو یہ بال اس لمحے پھر سے اتنے ہی گھنے سیاہ اور لامبے ہو گئے ہیں.. یہ اب میرے بدن تلے آ گئے ہیں اور حرکت سے کھنچتے ہیں اور مجھے تکلیف دیتے ہیں.. ہٹو اور مجھے حالت بدلنے دو... کسمسا کر ان بالوں کو سنبھالنے دو.. شیر دھاڑ رہا ہے رُودین..''

''ہر سُو چُپ ہے..''

''یہ شیر بھی ایک اعلان کرتا ہے رُودین.. جیسے ازمنہ قدیم میں قصبے کے کلیسا کا گھڑیال بے وقت بجنے لگتا تھا تو لوگ جان جاتے تھے کہ یہ کسی موت کی منادی کر رہا ہے.. خبر پہنچا رہا ہے.. اعلان کر رہا ہے.. شیر کی دھاڑ سے میرے واحد پہناوے صلیب میں ارتعاش جنم لے رہا ہے.. مجھے بہر طور اپنے گناہوں کی پاداش میں مصلوب ہو جانا ہے..''

ملاپ کی یہ رسم بھی آخری رسوم کی مانند ادا ہوئی.. اُس نے صلیب کی چبھن کو اپنے سینے میں کُھبتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے اُسے داغا جا رہا ہے... اُس کے سانس بھی اُکھڑے نہیں بے ربط ہوئے اور پھر بحال ہو کر اُس نے الگ اور پرے ہو کر اُس نتالیہ کے چہرے کو دیکھا..

اس یک بدنی کے عالم میں ہی وہ اُس سے الگ ہو چکی تھی..

اُس کے نین نقش زردی میں تھے..

منہ کھلا تھا ایک پیاسے پرندے کی مانند.. اُس کے دانت اور مسوڑھے بھی زردی میں تھے.. اُس کے چہرے پر بہت سے خط نقش تھے جن کا ایک ایک حرف پڑھا جا سکتا تھا..

ان تمام واضح علامات کے باوجود اُسے کچھ گمان نہ ہوا کہ اگلے روز عصر کی نماز کے فوراً بعد وہ اپنی مٹھیوں سے مٹی بھر بھر کر اُس کی قبر کو نمایاں کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گا..

''تمہیں پتہ ہے کہ میں جھول رہی ہوں.. برنے کے پیڑ کی بلند ترین شاخوں کو میری ناک چھوتی ہے.. اور جب بھی میں جُھلارا لے کر وہ پینگ جھولتی ہوں تو میرے گلے میں آویزاں وہ صلیب بھی اُس سے لمحہ بھر کے لیے الگ ہو کر جھولتی ہو.. اور مجھے جھلاتا کون ہے.. تم اور کون.. تم ہی میرے جُھلارے ہو.. اتنی چاہت اور قوت سے میری پینگ کے رسّے تھام کر زور لگاتے ہو کہ میں

بلندترین شاخوں سے پرے آسمان کی نیلاہٹ کو جا چھوتی ہوں.. میں نے اپنے سارے پانی تمہارے لیے ہی تو روک رکھے تھے.. تم مجھے اسی طور جھلاتے رہو.. ایسے جھلاؤ کہ میں برنے کے پیڑ کی شاخوں اور پتوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ کو چھوتے ہوئے واپس نہ آؤں' اُس میں چلی جاؤں اور جب جھولا واپس آئے.. تم اپنے بازو وا کیے مجھے ایک اور جھلارا دینے کے لیے بازو وا کیے کھڑے ہو تو پینگ واپس آئے تو خالی ہو.. جولاہی وہاں نہ ہو''

اُس کا بازو دُکھنے لگا..

نتالیہ کا سر بہت دیر تک اُس کے بازو پر آرام کرتا رہا..

دُکھان بازو کی جب اُس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو اُس نے اپنا بازو کھینچ لیا تو نتالیہ کا سر ڈھلک گیا..

کسی بھی مردہ جسم کو دفنانے کی رسوم سے وہ مکمل طور پر نا آشنا تھا..

نتالیہ یوں بھی مُردہ نہ لگتی تھی' ڈھلکے ہوئے سر کے ساتھ آرام کرتی ہوئی لگتی تھی.. نیند میں لگتی تھی..

وہ اپنے برسوں سے رُکے ہوئے پانیوں میں نہا چکی تھی اس لیے شائد اُسے نہلانے کی بھی حاجت نہ تھی..

ایک موت کی تفصیل میں جانا اگرچہ حماقت ہے لیکن.. ایسا ہوگیا ہے..

''ہاں آپ کے نام کا ایک خط ہے صاحب...''

''نہیں.. یہ.. یہ کیسے ہوسکتا ہے..''

''جی صاحب ہے ناں.. لفافے پر آپ کا نام درج ہے..''

محمد علی ڈاکیے کی انگلیوں میں ایک لفافہ تھا جو وہ ایک مدھم آہستگی سے اُس کی جانب بڑھا رہا تھا..

''نہیں..''

''آپ نے خود ہی تو پوچھا تھا صاحب کہ میرے نام کا کوئی خط ہے.. تو ہے''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ..''

''یہ ہوگیا ہے صاحب..'' ڈاکیے کے چہرے سے مسکراہٹ سمٹی اور اُس کے لہجے میں پہلی بار درشتگی آئی ''خود ہی پوچھتے ہو کہ میرے نام کا کوئی خط ہے.. اور جب ہے تو خود ہی کہتے ہو کہ نہیں...''

''میں نے تمہیں اپنا نام نہیں بتایا تو تم کیسے جانتے ہو کہ یہ خط... میرے ہی نام کا ہے؟''

''آپ نے مجھے اپنا نام بتایا تھا.. آپ کو یاد نہیں رہا.. اور میں بھی اُسے بھول گیا ہوں لیکن یہ جو خط ہے یہ آپ ہی کے نام ہوسکتا ہے کیونکہ اس ایک خط کو مجھے اسی مقام پر... اسی لمحے پہنچانے کو کہا گیا ہے.. آپ خود دیکھ لیجیے کہ اس پر آپ کا نام ہے یا نہیں..''

انگوٹھے اور چاروں انگلیوں کے درمیان بھنچا ہوا لفافہ اُس کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور اُس کی آنکھیں حیرت سے بڑی ہوتی گئیں کہ اُس پر اُسی کا نام لکھا تھا..

''اسی مقام پر.. اس لمحے تمہیں یہ خط پہنچانے کو کس نے کہا تھا؟''

''پوسٹ ماسٹر صاحب نے..''

''کون سے پوسٹ ماسٹر نے؟''

''وہی جن کے ہاتھ میں مہر ہے..جو بڑے پوسٹ آفس میں بیٹھتے ہیں..اُن کا کام ہی یہی ہے ایسے خطوں پر مہریں لگانا..میں تو ہرکارہ ہوں''

''تم جانتے تھے میں وادیٔ شگر سے پرے خوبانیوں سے حاملہ ہوتے ہوئے ایک زرد درخت سے پرے اس پہاڑی نالے کے پار اس لمحے موجود ہوں گا؟''

''نہیں..''

''تو پھر..''

''میں نہیں مگر پوسٹ ماسٹر صاحب جانتے ہیں..وہ سب جانتے ہیں..اگرچہ وہ کبھی اپنے پوسٹ آفس سے باہر نہیں نکلے لیکن وہ سب جانتے ہیں..آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے مجھے کوئی خط پہنچانے کے لیے سونپا ہو اور مجھے یا بندہ کے بارے میں بتایا ہو کہ وہ اس لمحے اس تاریخ کو فلاں جگہ پر موجود ہوگا اور...وہ موجود نہ ہوا ہو..''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اور کئی خط بھی پہنچائے ہیں''

''ہاں..''

''کتنے خط..''

''جتنے یا بندہ ہیں..''

''کتنے ہیں؟''

''حساب کتاب صرف پوسٹ ماسٹر کے پاس ہے..آپ یہ خط وصول کر کے مجھے فارغ کرو میں نے واپس بھی جانا ہے''

''کہاں؟''

''اپنے پوسٹ ماسٹر کے پاس...''

ڈاکیے کے انگوٹھے اور چاروں انگلیوں کی گرفت میں آیا ہوا وہ لفافہ ہولے ہولے اُس کے قریب آ رہا تھا لیکن اُس نے اسے وصول کرنے کے لیے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا کیونکہ اُس خط اور اس کے ہاتھ کے درمیان...ایک دیا سلائی بھڑکتی تھی...ایک بندوق فائر ہوتی تھی..دُور دیس میں ایک قبرستان کی خالی زمین پکارتی تھی..پیٹ پر ایک گھاؤ تھا..ایک مُردہ شاعر کی انگلیوں کا لمس

تھا..کوٹھڑی میں بند جولاہے کی سفید داڑھی کے بال کھیس میں بُنے جاتے تھے..ایک سیدانی کے گلے میں لٹکتی چاندی کی صلیب تھی اور ایک جولاہی برنے کے پیڑ کے جھولے میں جھولتی آسمان میں نکلتی تھی اور جھولا خالی واپس آ رہا تھا..کہیں یہ خط..

''اور اگر میں یہ خط وصول کرنے سے انکاری ہو جاؤں تو..''

''یہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے..یہ خط تو آپ وصول کر چکے ہیں یہ تو محض کارروائی ہے..''

اُس کا ہاتھ اُس کے بس سے باہر ہوا' اُس کے پہلو سے جدا ہو کر اُٹھا اور اُس لفافے کی جانب بڑھنے لگا..

ایک ایسی مسکراہٹ ڈاکیے کے چہرے پر پھیلی جو...اُس کے بس میں نہ تھی..یہ مسکراہٹ ایک روٹین ایک ڈیوٹی لگتی تھی جو صرف یہ کہتی تھی کہ جو ہونی ہے وہ ہو کر رہتی ہے...میں ہمیشہ ڈاکیے کے چہرے پر تب پھیلتی ہوں جب کوئی بے بس اور بے اختیار اس خط کو وصول کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے..

کہاں تو وہ شدید گھبراہٹ میں تھا خط کو وصول کرنے سے انکاری تھا اور کہاں یہ کہ یکدم اُس کی گھبراہٹ ایک بدنی انبساط میں بدلی...جیسے حیاتی کی تمامتر کھٹنائیوں میں اُس کے تمامتر مسام آنکھوں کی مانند کھلے صرف اسی خط کی راہ دیکھتے تھے...یہ وہی آخری انعام تھا جس کا وہ منتظر تھا..ڈاکیا اُسے ایک شفیق دوست نظر آنے لگا..ایک محسن دکھائی دیا جس نے اسے انتظار کی اذیت سے نجات دلائی تھی..جس نے پھانسی کا پھندا عین اُس لمحے اُس کی گردن سے نکال لیا تھا جب وہ جھول جانے کو تھا..وہ ایک عجیب کیف میں مبتلا ہوا جیسے کسی مقدس صحیفے کے نزول کا لمحہ ہو..جیسے محبت کے پہلے بوسے کی شرماہٹ ہو..جیسے پہلے بچے کے پیدا ہونے کی نوید ملے یا بے اختیار ہونے سے پیشتر بدنی گیلاہٹ کا سناٹا ہو..

اُس کی انگلیوں نے جونہی لفافے کو چھوا' ڈاکیے کی مسکراہٹ برف میں بدل گئی..منجمد ہو گئی..

لفافے پر اُسی کا نام تھا' تاریخ' لمحہ اور مقام پتے کے طور پر درج تھا اور تحریر مکمل طور پر نا آشنا اور اجنبی تھی..

وہ اُسے کھولنے لگا تو ڈاکیے کا ہاتھ آگے آ گیا ''نہیں..یہاں نہیں..حشو پی کے سیبوں

کے باغوں کی جو ڈھلوان دریائے برالڈو تک اُترتی ہے وہاں اُس کے کناروں پر جا کر اسے کھولنا کہ اس میں جو کچھ درج ہے وہ اُس دریا کے پانیوں کی لمس سے ہی نمایاں ہوگا.. ورنہ نہیں'' یہ کہہ کر محمد علی ڈاکیا پتھرا سا گیا' زندہ نہیں لگتا تھا' اور جب وہ اپنے بدخشانی گھوڑے پر سوار ہوا تو یوں لگا جیسے وہ گھوڑا بھی پتھر کا ہو اور پھر وہ دونوں.. سوار اور سواری.. اسی پتھریلی حالت میں نزدیکی چٹانوں کا ایک حصہ بن گئے..

وہ یکسر تنہا ہو گیا..

سرد ہوا کی سرسراہٹ سے اُس کے کانوں کی لویں یخ ہونے لگیں..

اُس کا ہاتھ ابھی تک اُسی حالت میں بڑھا ہوا تھا جس حالت میں اُس نے وہ لفافہ وصول کیا تھا اور وہ لفافہ اُس کی انگلیوں میں ایک شکار ہو چکے پرندے کے تازہ تازہ مُردہ ہو چکے بدن کی ہلکی حدّت لیے اپنے کبھی زندہ ہونے کی آخری خبر دے رہا تھا..

اُس کے جی میں آئی کہ وہ خط یہیں کھول لے.. لیکن وہ جان گیا کہ یہ بھی اُس کے اختیار سے باہر ہے..

اُسے وہ خط کھولنا تھا تو وہیں کھولنا تھا.. حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے اُترتی ڈھلوان کے آخر میں جہاں دریائے برالڈو کے پانی بہتے تھے کہ یہی ڈاکیے کی ہدایت تھی اور بغیر کسی شک وشبہ کے یہ ہدایت پوسٹ ماسٹر کی جانب سے آئی تھی جس سے رُوگردانی ممکن نہ تھی..

وہ اُسے.. اُس خط کو اُسی حالت میں بڑھے ہوئے ہاتھ میں تھامے.. اُسی حالت میں جس حالت میں اُس نے اُسے ڈاکیے سے وصول کیا تھا.. تھامے حشوپی کے سیبوں کے پستہ قد زمین پر بچھتے ہوئے درختوں میں سے گزرتا دریا کے کناروں تک آ گیا..

کیا اُسے صرف کنارے تک ہی رہنا ہے یا دریا کے مرکزی بہاؤ کی قربت میں جانا ہے.. قربت میں جانا ہے..

وہ اُسی کیف اور مستی میں تھا.. دریا کنارے.. انبساط اور لطف کی حالت میں.. لفافہ تھامے.. کنارے کے قریب پانی میں اُبھرے ہوئے پتھروں پر قدم دھرتا جن کے اردگرد پانی وحشت میں مرغولے بنتے گرداب ہوتے تھے وہ اُن پتھروں پر قدم رکھتا.. مرکزی بہاؤ کے قریب ہو گیا جہاں دریا اپنے جوبن میں تھا.. کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتا تھا اپنے من کی موج میں بہتا چلا جاتا تھا..

اور اُس کے پانیوں میں.. جہاں وہ بے دریغ اور کھلے ہو کر بہتے چلے جاتے تھے اُسے محسوس ہوا کہ اُن میں رُوحیں بہتی تھیں.. گیلے' ڈوبے اور اَن ڈوبے پتھر زندہ لگتے تھے' سانس بھرتے سنائی دیتے تھے..

یہ شاہ گوری کی اُلفت میں اُس کے سرد مرگ بوسوں کی چاہت میں مبتلا اس کی آخری بلندی تک پہنچنے میں ناکامی کے بعد یا کبھی کامیابی کے بعد اجل کا شکار ہونے والے عشاق کی رُوحیں تھیں جو یہاں تک چلی آئی تھیں..

بہتی ہوئی چلی آئی تھیں..

انہیں دیکھا بھی جا سکتا تھا لیکن تبھی جب تمہارے عشق کی حدّت اُن عشاق کی محبت کے درجے تک پہنچ جائے..

دریا کے پتھر.. جو کناروں میں اُبھرے ہوئے تھے کائی زدہ اور پھسلواں نہیں تھے کہ ان پر یا ان کے آس پاس پانی ٹھہرتے کہاں تھے.. اُنہیں ذرا سا تراشتے ہوئے نکل جاتے تھے.. ایک دھیمی گونج کی سمفنی کانوں میں اُنڈیلتے..

آج تک جتنی بھی تتلیوں نے پَر کھولے تھے.. ان پر اُڑان کی تھی.. کہیں سنولیک سے.. کہیں اشکولے سے آئی تھیں' جن جن نے اس کے پانیوں پر پرواز کی تھی....

اِن پر جھک کر آج تک جتنے بھی لوگوں نے جتنے سانس لیے تھے.. اپنی پیاس بجھانے کے لیے.. محبت کرتے ہوئے.. خودکشی کرنے ان میں ڈوبنے سے پہلے آخری سانس.. وہ سب سانس..

اور چہرے اس پر جو جو جھکے تھے.. اس کے پانیوں سے اپنے آپ کو تر و تازہ اور زندہ کرنے کے لیے.. اپنی عشق آتش سرد کرنے کی خاطر.. وہ سب چہرے.. جتنے بھی پیاسے پرندوں نے اپنی چونچیں ان میں ڈبوئی تھیں.. وہ سب چونچیں..

جو پتے خزاں رسیدگی کے ہاتھوں مجبور.. خزاں کے تانبے رنگوں میں رنگے اپنی ٹہنیوں سے جدا ہو کر اِن پر آن گرے تھے.. سب پتے..

برف کے جتنے بھی گالے سرمائی یخ بستگیوں کے موسموں میں.. اپنی برفیلی آہستگی کے ساتھ ان پر.. ان پانیوں پر گرے تھے آ گرے تھے اور اُسی لمحے ان میں تحلیل ہو گئے تھے.. سارے کے سارے گالے..

ہوائیں جو برف گرنے سے پیشتر سنسناتی' درّوں اور چٹانوں کے شگافوں میں سیٹیاں بجاتی گزرتی ان تک آئی تھیں تو اپنے زور سے ان میں ہیجان پیدا کرتی تھیں اور پھر ان کے بہاؤ پر بچھ جاتی تھیں..وہ ہوائیں!

کہیں بلندیوں پر معلق پہاڑی راستے جو مسمار ہو کر ان میں آ گرے تھے..یہ سارے راستے!

اوپر ان پانیوں کے وجود کے عین اوپر کھسکتی چٹانوں کے انبار جو ان میں آن گرے.. چند لمحوں کے لیے بہاؤ میں رکاوٹ ہوئے اور پھر ان میں فنا ہو گئے..وہ ساری کی ساری چٹانیں!..

بھربھری مٹی میں جنم لینے والے پہاڑی بُوٹے اور بلندی کی تیز مہک والی جھاڑیاں جن کی جڑیں تیز بارشوں نے ننگی کر دی تھیں وہ بھی آبی ریلوں کی زد میں آ کر ان میں آ گری تھیں..سبھی بوٹے اور جھاڑیاں..

صرف آج اور کل نہیں..جب بکھرے ہوئے زمینی جسم آپس میں ٹکرائے تھے اور ان کے ملاپ کی شدت سے پہاڑ ابھرے اور نمودار ہوئے تھے اور لاکھوں برسوں میں ذرّہ ذرّہ اونچے ہوتے ہوئے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ اُن پر برفیں گرنے لگی تھیں..وہ آج بھی بلندی کی جانب ذرّہ ذرّہ اُبھرتے تھے' تھمے نہیں تھے' ایک خاموش تسلسل سے اونچے ہوتے جا رہے تھے..دریاؤں نے راستے بدل لیے تھے' کبھی میدانوں میں رواں تھے تو اُنہوں نے ان پہاڑوں میں اپنی جگہ بنالی تھی..تو تب جب دریائے برالڈو پہلی بار بلند چٹانوں کے درمیان میں پہلی بار بہا تھا..

تب سے آج تک..

جتنی بھی تتلیوں نے اس کے بہاؤ پر پَر کھولے تھے..لوگوں کے سانس اور چہرے پرندوں کی چونچیں' تانبے رنگ کے گلتے سڑتے پتے..برف کے گالے.. پہاڑی راستے' ہوائیں' چٹانوں کے انبار' تیز مہک والی جھاڑیاں' بُوٹے جو اس میں گرے تھے..وہ سب کے سب..وہ جتنے بھی تھے..جونہی اس کی قربت میں ہوئے' اس میں آن گرے' اس پر جھکے..تو وہ سب کے سب پتھر ہوئے..یہی پتھر..برالڈو کے پانیوں کی تہہ میں دکھتے' کناروں پر کبھی ڈوبتے کبھی دکھائی دیتے پتھروں پر وہ سب نقش ہوئے..اُن کے چہرے' پَر' مہک اور مہاندرے ان پتھروں پر ثبت ہو گئے..اُن کے وجود کی مہریں لگ گئیں..سب پتھر ہوئے..

اسی لیے ان پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے احتیاط کہ کہیں کوئی تتلی کچلی نہ جائے پتھر

ہو جانے کے باوجود اُس کی کوملتا اُس کی نازکی برقرار ہو اور وہ کچلی نہ جائے..کسی پرندے کی چونچ نہ زخمی ہو' ٹوٹ نہ جائے..برف کا کوئی گالا اپنا وجود کھو نہ دے..ہوائیں تھم نہ جائیں بے شک وہ پتھر کی ہوں..کوئی تیز مہک والی جھاڑی اپنی مہک نہ کھو بیٹھے..اور کوئی چہرہ گم نہ ہو جائے کوئی سانس بند نہ ہو جائے..اس لیے ان پتھروں پر قدم دھرتے ہوئے احتیاط..ازحد احتیاط..پتھروں پر نقش اور ثبت شدہ شباہتوں اور محسوسات کا یہ عجائب گھر دریا کے کناروں اور اُس کے پانیوں کی تہہ میں سجا تھا..یہ نقش اور شباہتیں ہر آنکھ کے لیے نہ تھے' صرف اُسے ہی دکھائی دیتے تھے جن کے نام..ایک خط آتا تھا' جن کے لیے پوسٹ ماسٹر محمد علی ڈاکیے کو کسی مخصوص مقام اور وقت پر پہنچنے کی تلقین کرتا تھا..اور تاکید کرتا تھا..صرف اُسے ہی یہ عجائبات سنگ دکھائی دیتا تھا ورنہ باقیوں کے لیے وہاں کچھ بھی نہ تھا..بیکار پتھر تھے..بنا کسی نقش کے اندھے اور عام پتھر تھے..

اُس نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک ایسا پتھر چنا جس پر..ایک پتھر کا ہی نقش تھا کہ دریا میں سب سے زیادہ پتھر ہی تو گرتے تھے..

تادیر..اُس کے بہاؤ کی جانب دیکھنا دشوار تھا..دیکھا ہی نہ جاتا تھا کہ وہ اتنا تیز اور مسحوریت سے حاملہ تھا کہ تادیر دیکھنے سے انسان خود بھی اس کے ساتھ بہہ جاتا تھا..

اُس کے ہاں اب بھی ایک ایسا دروازہ کھلا تھا جس کے راستے وہ فرار ہو سکتا تھا..

اگرچہ بقول محمد علی ڈاکیے کے اُس خط کو..جو ابھی تک اُس کے ہاتھ میں اُسی حالت میں موجود تھا جس حالت میں وہ وصول کیا گیا تھا..وہ اُسے وصول کرنے پر مجبور تھا بے بس تھا لیکن اُسے کھولنا تو اُس کے اختیار میں تھا..وہ اسے نہ کھولے' یونہی پوشیدہ اور مقفل حالت میں اُسے سپردِ آب کر دے یہ تو اس کے اختیار میں تھا..لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہر انسانی بدن میں تجسس' چنتا اور کھوج کا لاوا تو ازل سے بھر دیا گیا تھا..کیا ہے؟..کیا نہیں ہے..اگر ہے تو کیا ہے..اور کیوں ہے..اور اگر کچھ نہ ہوتا تو کیا ہوتا..کیا خدا ہوتا..یا نہ ہوتا..وہ اگر اس خط کو کھولے بغیر سپردِ آب کر دیتا تو وہ زندہ نہ رہتا..اس کا تجسس اور افسوس اُسے مار ڈالتا کہ اُس میں کیا لکھا تھا..کس کا لکھا تھا..تو یہاں بھی ایک مجبوری اور بے کسی تھی تجسس کی..اختیار نہ تھا..

جو نظر رکھتے ہیں وہ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں..پر یہ لفافہ کچھ بھی بھانپنے نہ دیتا تھا' کچھ ظاہر نہ کرتا تھا' اس پر درج ناآشنا تحریر سے یہ اندازہ لگانا بھی ممکن نہ تھا کہ یہ کسی نسوانی ہاتھ کے لکھے ہوئے حرف ہیں یا مردانہ خط ہے..بھیجنے والا پتہ لکھنے کی گھڑی میں

اضطراب میں تھا' تذبذب میں تھا یا سرخوشی اور مسرت سے کانپتی انگلیوں نے اسے لکھا تھا.. یہ ایک بے رُوح اور سپاٹ سرکاری قسم کی تحریر تھی.. اُس کا نام.. وقت اور مقام.. بس!

لفافے پر کوئی ٹکٹ چسپاں نہ تھا مگر ایک واضح پڑھی جانے والی مہر ثبت تھی.. پوسٹ ماسٹر!

ریڑھ کی ہڈی کے اوپر گردن کے خم پر برف کا ایک گالا گرا اور اس کے بدن کی گرمی سے پگھل کر پانی کی ایک لکیر کی صورت رینگتا اس کے سرینوں تک چلا گیا.. اس آبی لکیر کی یخ بستگی سے اس کا بدن' محمد علی ڈاکیے کے بدخشانی گھوڑے کی جلد کی مانند تھرایا..

ابھی تو موسم گرما کا کیف چہار سُو تھا.. قمیض کے کھلے بٹنوں پر جو ہوا سرسراتی تھی وہ سینے کو خوشگوار کیفیت سے دوچار کرتی تھی اور ابھی پل دو پل میں موسم بدل گئے..

دریا کے پانی بھی اُترنے لگے.. کم ہونے لگے.. بلندیوں پر پگھلاہٹ نہیں ہو رہی تھی برف گر رہی تھی... یوں لمحوں میں وہ پتھر بھی عیاں ہونے لگے جو گہرے پانیوں میں ڈوبے اس سے قبل دکھائی نہیں دے رہے تھے.. وہ بھی سادہ نہ تھے اُن پر بھی سب کچھ نقش تھا..

تہہ کے سنگریزے نظر آنے لگے.. اور ان پر بھی.. اَن گنت سنگریزوں پر بھی ان کے حجم کے مطابق مختصر تصویریں سامنے آتی تھیں' ان کے رنگ ابھی گیلے تھے.. سانس' چہرے' چونچیں' پتے' بوٹے سب کے سب مصور کی تخلیقی صلاحیت کے گیلے مظہر تھے..

دریا میں جو کم کم پانی تھے ان کے چھینٹے کم کم اڑتے تھے کہ وہ انجماد کی حدوں کو چھوتے جیسے بہنے سے گریز کرتے تھے' آہستہ تر ہوتے چلے جاتے تھے.. تھمنے کو ہوتے اور ایک جھجک کے ساتھ پھر سے رواں ہو جاتے.. پر روانی اتنی مدھم تھی کہ تادیر تکتے رہنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تھمے نہیں چل رہے ہیں..

ہواؤں کا کوئی شمار نہ تھا..

ان میں برف کے گالوں کی آمیزش انہیں گھنا اور سرد کرتی تھی.. اتنی تُند کہ اُس کا ہاتھ جو اسی حالت میں تھا' لفافے کو گرفت میں لیے ہوئے وہ ہاتھ بھی لرزنے لگا اور لفافہ جیسے اپنے آپ کو اُس کی انگلیوں سے آزاد ہونے کے لیے پھڑ پھڑانے لگا.. ہوائیں ایک بھوکے عقاب کی مانند پانیوں پر اُترتیں اور ان میں سے جو چند چھینٹے اُڑتے انہیں بے بس پرندوں کی طرح شکار کر لیتیں..

تند سرد یلی ہوائیں' برف کے گالے اور تھمتے رُکتے پھر سے رواں ہوتے پانی اور پہلی

بار دکھائی دینے والے پتھر اور سنگریزے جولاہے کے کھیس میں بُنے جا رہے تھے..

یہ اشارے تھے..

پوسٹ ماسٹر کی جانب سے خط کھولنے میں جو تاخیر ہو رہی تھی اس کے باعث اشارے تھے.. واضح...!

وہ ابد تک یونہی ایک پتھر پر براجمان.. لفافے کو انگلیوں میں تھامے... اسے کھولنے سے اجتناب کرتے ہوئے.. موسموں کی اس لمحہ بہ لمحہ بدلتی شدت کو سہہ نہیں سکتا تھا.. اس نے لفافہ چاک کیا' اس میں نفاست سے تہہ شدہ کاغذ کو نکالا' اس کی تہیں کھول کر اپنے نام آئے ہوئے خط پر پہلی نظر ڈالی..

کاغذ کورا تھا..

اس پر کچھ بھی درج نہ تھا..

سادہ اور کورا تھا..

پوسٹ ماسٹر نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا..

اور پھر یکدم اس کے ذہن کا ایک کونہ منور ہوا.. یہ کورا نہیں ہے.. اس میں جو کچھ تحریر ہے وہ صرف دریا کے پانیوں کے لمس سے ہی نمایاں ہوگا.. ورنہ نہیں... محمد علی ڈاکیے نے یہی کہا تھا..

اُس نے کورے کاغذ کو جھک کر پانیوں کے مدھم بہاؤ میں ڈبویا اور مزید جھک کر اپنے ہاتھ کو منجمد ہو جانے کی کیفیت کو برداشت کرتے.. جھک کر زیرِ آب کاغذ کی گیلاہٹ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ دیکھیں اس پر کیا نمایاں ہوتا ہے.. لیکن مدتیں بیت گئیں اور اُسے کچھ دکھائی نہ دیا.. اس پر کوئی تحریر نہ اُبھری' وہ کورے کا کورا ہی رہا.. پوسٹ ماسٹر نے اس کے ساتھ ایک بڑا مذاق کیا تھا' ڈاکیے نے جھوٹ بولا تھا.. بہاؤ کی یکلخت تیزی نے کاغذ کو اس کی گرفت سے الگ کیا.. گیلے کورے کاغذ کی ایک دھجی اُس کی انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان بھنچی رہ گئی اور بقیہ کاغذ اس کے بس سے باہر ہو گیا.. لیکن وہ بہاؤ کی زد میں آ کر اُس کے ہمراہ بہا نہیں بلکہ وہ بھی سانسوں' چہروں' چونچوں' پتوں' بوٹوں اور پہاڑی راستوں کی مانند ایک پتھر پر حنوط ہو گیا..

اس کورے کاغذ کے حنوط شدہ نقش کی قربت میں محمد علی ڈاکیا تو نہ تھا البتہ اس کا بدخشانی گھوڑا تھا جو اس کے برابر کے پتھر پر کھدا ہوا تھا.. اس کی جِلد ابھی تک تھرکتی تھی اور اس کے نتھنوں سے طویل مسافتوں کی بھاپ نکلتی تھی..

اسی جھکی ہوئی حالت میں وہ بھی پتھرانے لگا..

اس نے کہاں چاہا تھا..خواہش نہیں کی تھی کہ کون حنوط ہو جانا پسند کرتا ہے..بس اسی مجبوری اور بے بسی کے تحت جو پوسٹ ماسٹر کے رجسٹر میں ازل سے درج ہوتی ہے..اُسی کے اختیار میں ہوتی ہے وہ اسی کورے کاغذ اور بدخشانی گھوڑے کے برابر میں پتھر ہو گیا..

ان سانسوں، چہروں، چونچوں، پتوں، بوٹوں اور پہاڑی راستوں کی رفاقت میں ایک اور نقش ہو گیا..

اور آج تک ہے..

البتہ پتھر ہو جانے کے باوجود اُس کے وجود میں زندگی کی ایک رمق موجود رہی..اس رمق میں کھڈی کی کھٹ کھٹ جاری تھی..کہ پتھر ہو چکنے کے باوجود وہ ذات کا جولاہا رہا..کھٹ کھٹ..کھٹ کھٹ!